٥٩

آج

سعید الدین　　سید محمد اشرف　　نیر مسعود

حسن منظر　　صدیق عالم　　ڈی ایچ لارنس

ترتیب : اجمل کمال

Scanned with CamScanner

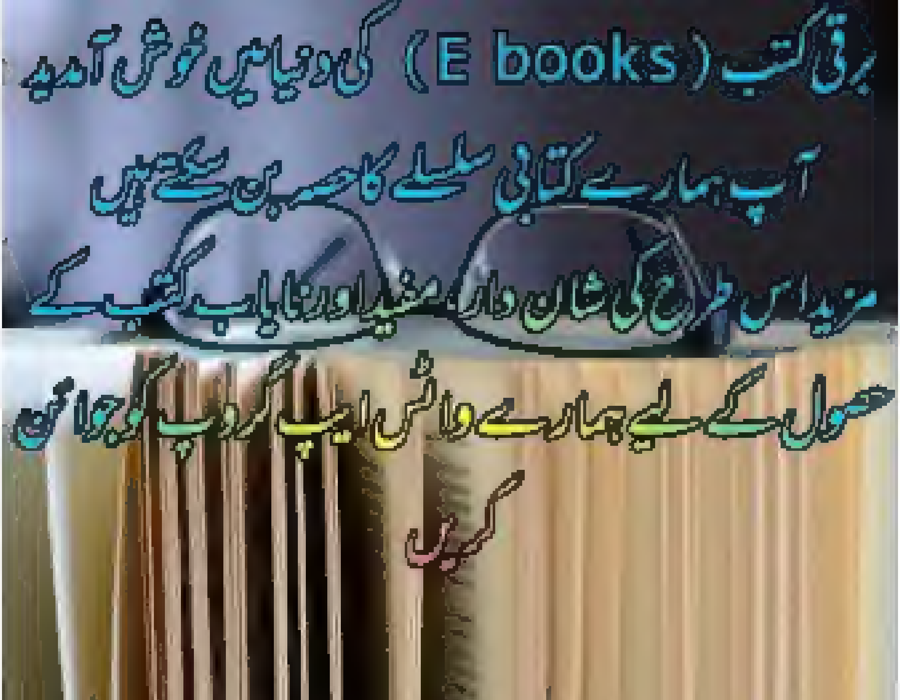

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 59
جولائی 2008

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 400 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5213916 5650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

(15دسمبر1961 - 12اپریل2008)

کی یاد میں

Scanned with CamScanner

ترتیب

سعیدالدین

7

نظمیں

سید محمد اشرف

60

کیا قافلہ جاتا ہے

73

دلاورانِ نیم شب

87

رنگ

نیر مسعود

103

صبور قبیلہ

Scanned with CamScanner

حسن منظر

116

غیرت

صدیق عالم

125

ڈھاک بن

139

لیمپ جلانے والے

150

دو پیر فرتوت

163

نل کی پیاس

181

خدا کے بندے

200

فورسپس

ڈی ایچ لارنس

222

سورج

245

پادری کی بیٹیاں

Scanned with CamScanner

"سٹی پریس" کی تازہ مطبوعات

جب تک ہندوستان میں شعروادب کا ذوق ہے،
میرا کے گیت بھی آج ہی کی طرح فضا میں
لہراتے رہیں گے

میرابائی

پریم وانی

(گیت، ترجمہ اور فرہنگ)

مرتبہ: سردار جعفری

قیمت:395روپے

یہ کبیر کی، روی، غرض تمام سنتوں اور صوفیوں کی
تعلیمات کی نئی تفسیر ہے جو ایک نئی انسانیت کی
بشارت لیے ہوئے ہے

کبیر

کبیر بانی

(گیت، ترجمہ اور حواشی)

مرتبہ: سردار جعفری

قیمت:395روپے

مختلف ادبی رسائل میں بکھرے ہوئے عالمی ادب
کے افسانوں کے تراجم کا انتخاب

کلی منجارو کی برفیں

(منتخب ترجمے)

محمد خالد اختر

مرتبہ: شیما مجید

قیمت:120روپے

ایران کی تاریخ کے واقعات اس ناول میں پس منظر
کی دھندلی پرچھائیوں کے طور پر موجود ہیں

شہزادہ احتجاب

(ایرانی ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

قیمت:70روپے

Scanned with CamScanner

سعید الدین

اپنا لکھا

روز روٹی کھاتا ہے
ایک دن پتھر بھی
حلق سے اتارنا چاہیے
روز سڑک پر
گاڑیوں سے بچتا بچاتا چلتا ہے
ایک دن
چڑھنے دینا چاہیے
ٹرک کو اپنے اوپر
سبزی کاٹتے کاٹتے
کتر ڈالنی چاہییں
اپنی انگلیاں بھی

صفحے پر لکھتے لکھتے
الفاظ کو چومتے چومتے
تھوک دینا چاہیے

Scanned with CamScanner

اپنے لکھے پر

پھر دیکھنا چاہیے
کاغذ پر تھوک
کس سمت بہتا ہے
ارے یہ تو
اپنے چہرے کی طرف رخ کرتا دکھائی دیتا ہے!

ساری روشنائی
اپنے ہی تھوک سے بنتی ہے
اور کاغذ
اپنا سفید جھوٹ ہی تو ہے
اب یہ اپنا لکھا
اور اپنا تھوکا ہوا
الگ الگ کیسے ہو؟...
ویسے یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں
جس روز پتھر کو حلق سے اتارنا آ گیا
جس دن چڑھ جانے دیا
ٹرک کو اپنے اوپر
اس دن اپنا لکھا ہوا
اور اپنا تھوکا ہوا
آپ ہی آپ الگ ہو جائے گا

میں اور میرا اندھیرا

ٹھہرو
مجھے سوچنے دو
مجھے دیکھنے دو
اس اندھیرے میں
جو بھی میرے سامنے ہے
اس کا اور میرا
یوں اچانک سامنا ہو جانا
بہت غنیمت ہے
پھر یہ مجھے کہیں نظر نہیں آئے گا
اس اندھیرے میں چھپے ہوئے ہیں
میرے تیر و نشتر
اسی میں میری انگلیاں اور آنکھیں ہیں
یہ اندھیرا اچھٹ گیا تو
پھر روشنی ہی روشنی ہے
جس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا
جس میں کچھ تلاش نہیں کیا جا سکتا
سب کچھ تو اندھیرے میں ہے
تیر بھی
گھاؤ بھی
چیخیں اور سسکیاں بھی

Scanned with CamScanner

آنسو اور خون کے مہین ذرات بھی
ساری فتح و شکست
اسی اندھیرے میں ہے
روشنی میں آدمی اندھا ہے
اس سے کچھ بھی پوچھو
سیدھا جواب نہیں ملے گا
دیواروں سے ٹکراتا پھرے گا آدمی

ساری چیزیں اجالے میں ہمارے ہاتھ سے ٹوٹتی ہیں
اور ان کی کرچیاں ،
اجالے میں بکھری رہتی ہیں
ہمیں دکھائی نہیں دیتیں
پھر یہ ہمارے تلووں میں گڑ گڑ کر
جمع ہوتی رہتی ہیں
انھیں صرف اندھیرے کی روشنی میں
ہم اپنے پیروں کی انگلیوں
ایڑیوں یا تلووں سے نکال سکتے ہیں

مجھے اس اندھیرے کی پرتیں اتارنے دو
مجھے دیکھنے دو کہ یہ اوقیانوس کتنا گہرا ہے
میں دیکھنا چاہتا ہوں
اس شانت اور ٹھنڈک میں
میرا دل

Scanned with CamScanner

اور کتنی دیر دھڑک سکتا ہے

نظم

اس پتھر پر ہم اکثر آ کر بیٹھ جاتے تھے
دن بھر کی چرائی ہوئی روٹیوں کا حساب
یہیں ہوتا تھا
کبھی کبھی وہ
کوئی سیاہ جھینگر
چھپکلی یا مینڈک جیسی کوئی چیز لے آتا
تھوڑی دیر ہم اس سے کھیلتے
جب اس کا دل
اس کھیل سے اچاٹ ہو جاتا
تو وہ اپنی پر اتر آتا
اور اس جھینگر
چھپکلی، مینڈک
یا جو کوئی بھی کیڑا ہو
اسے پتھر سے کچل دیتا
اور میرے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے
روٹیاں سمیٹ کر
ان کے دو برابر حصے کرتا

Scanned with CamScanner

اور اپنا حصہ اٹھا کر اپنی راہ لیتا

تو جن چرائی ہوئی روٹیوں کا ذکر ہے
وہ حقیقت میں روٹیاں نہیں ہوتی تھیں
وہ تو چند پتھر ہوتے تھے
جنہیں بھوک میں ہم نگل لیا کرتے تھے
اور جس سیاہ جھینگر
چھپکلی اور مینڈک کا ذکر اوپر کیا گیا ہے
وہ بھی سراسر فرضی ہی تھے
یہ نشے بھر کے خواب تھے
جن کو وہ ایک ایک کر کے
کچلتا چلا جا رہا تھا
وہ کون ؟
وہ تو کوئی بھی نہیں تھا
میں نے ہی خود کو
دو مساوی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے
آدھے کو "وہ"
اور آدھے کو "میں" فرض کر لیا تھا
جس پتھر پر ہم بیٹھے تھے
وہ تو کسی قبر کے سرہانے کا پتھر تھا
جس پر میں بیٹھا ہوا ہوں
قبر میں سونے کی باری
آج اس کی ہے

Scanned with CamScanner

پیر کا ناپ

آپ کے پیر کا ناپ
ہمارے پاس موجود ہے
ہم کوئی ایسا جوتا بننے نہ دیں گے
جو آپ کے پیر میں
پورا پورا فٹ آ جائے
اگر بالفرض آ بھی گیا
تو بھی آپ اسے پہن کر
چلنا تو دور کی بات ہے
سیدھے کھڑے تک نہیں ہو سکتے

آپ کے علاوہ بھی
ہمارے پاس
اور بہت سے پیروں کے ناپ ہیں
جن جن پیروں کے ناپ ہیں
ان کے جوتے
یا تو بازار میں سرے سے دستیاب نہیں
اگر اتفاقاً مل بھی جائیں
تو بھی ہم نے انھیں
کم از کم
ناقابلِ استعمال ضرور بنا دیا ہے

Scanned with CamScanner

ایسے جوتے اب اگر کہیں مل سکتے ہیں
تو صرف ان پیروں میں
جو سڑک کے کنارے
مکانوں کی دہلیزوں کے آس پاس
یا کچرادانوں کے اِدھر
یا اُدھر
پسرے ہوئے ہیں
جن کے یہ پیر ہیں
ان میں سے بیشتر لوگ تو
اپنے پیروں ہی سے لاتعلق ہو گئے ہیں
وہ حسرت سے لوگوں کو
اپنے پاس سے گزرتے دیکھتے ہیں
عام طور پر ان کی نظر
لوگوں کے جوتوں پر ہوتی ہے
جب کوئی پاس سے گزرتا ہے
تو یہ اس کے جوتوں کے نشان
اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں
شاید سوچتے ہوں
کہ یوں وہ
بے شمار جوتوں کے نشانات سے
ایک نہ ایک دن
اپنے پیروں کا ٹھیک ٹھیک ناپ
بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے

Scanned with CamScanner

انھیں پتا نہیں

ہر پیر کا جوتا
الگ ہی ناپ کا ہوتا ہے
بہت جلد یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا
اب تو یہ رواج زور پکڑتا جا رہا ہے
کہ لوگ
پیر کا ناپ دینے کے بجائے
اپنا پیر ہی جمع کرا دیتے ہیں
اور پھر
واپس آ کر پوچھتے تک نہیں

ہیجڑا

کبھی کبھی
اپنے اندر کا ہیجڑا
بھڑکیلا لباس پہنے
تیز رنگ لپ اسٹک ہونٹوں پر تھوپے
تالی بجا کر جاگ اٹھتا ہے
اور اترا اترا کر چلتے ہوئے
سڑک پر نکل آتا ہے

Scanned with CamScanner

قدِ آدم آئینے کے سامنے
یہ اپنی چھاتی کے ابھاروں کو نمایاں کرنے کے لیے
سو جتن کرتا ہے

جب لوگ اسے
یوں کیل کانٹے سے لیس
اپنے سامنے کھڑا پاتے ہیں
تو ایک جھرجھری لے کر رہ جاتے ہیں
کسی دن یہ ہمارے تولیدی اعضا کو
سکیڑ کر نہ رکھ دے
کیسے روکا جائے اس کو؟...
اس کی گردن پر آزمایا جائے
ناخنوں کی ایک مضبوط ڈور کو
تیزاب سے مسخ کر دیے جائیں
اس کے نقوش
یا مچھلی کے کانٹے میں
پھنسا دیا جائے اس کا زنخا پن
پر ایسا کوئی حربہ کارگر ہوتا دکھائی نہیں دیتا
یہ تالی بجاتے ہی
جُل دے جاتا ہے سب کو

ہمیں اپنے تولیدی اعضا کی سخت حفاظت کرنی چاہیے
اور اس کے جوہر کے ایک ایک قطرے کو

Scanned with CamScanner

سنبھال کر رکھنا چاہیے
اس سے اپنے چہار طرف
حصار کا کام لیا جائے
اسے ماتھے پر سیندور
اور آنکھوں میں کاجل کے طور پر لگایا جائے
توانائی کے اس خزانے سے ہم
اپنی رات کو دن
اور دن کو رات میں تبدیل کر سکتے ہیں
یہاں تک کہ
اپنے زنخے پن کو بھی
مردانگی قرار دے سکتے ہیں

ہمیں شیو کے دوران
آئینے کے سامنے
اپنے رخساروں کا غبار صاف کرتے ہوئے
احتیاط کرنی چاہیے
جہاں
ایک ننگ دھڑنگ ہیجڑا
ہر وقت
ہماری طرف ہی دیکھ رہا ہوتا ہے

Scanned with CamScanner

ہتھوڑا اور کیلیں

میں کبھی اس
اور کبھی اُس دیوار میں کیل گاڑتا ہوں
بس یونہی
مجھے کوئی تصویر ٹانگنی ہے
نہ الگنی باندھنی ہے
مجھے تو بس کیل گاڑنی ہے

اتنی دیواروں میں میں نے کیلیں گاڑی ہیں .
کہ ان کا شمار نہیں
ہتھوڑا میرے ہاتھ میں ہر وقت رہتا ہے
اور جیبیں کیلوں سے بھری

کوئی کوئی دیوار تو اس قدر پولی ہوتی ہے
کہ میں اپنے انگوٹھے کے معمولی دباؤ سے
کیل گاڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں
پر کوئی دیوار تو فولاد کی بنی معلوم ہوتی ہے
کوئی کیل اس میں پیوست ہو کر ہی نہیں دیتی
کیلیں ٹیڑھی ہو ہو کر گر پڑتی ہیں
یا ان کی نوکیں ہی کند ہو جاتی ہیں
کیل ایسی ہی جگہ گاڑنے میں مزہ ہے

Scanned with CamScanner

بعض اوقات دیوار کے اس طرف بھی کوئی
کیل ہی گاڑ رہا ہوتا ہے
ایسے میں ہم ہتھوڑے کی ضربوں کے ذریعے
ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں
ہتھوڑے کی چوٹ سے ہم
اندازہ کر لیتے ہیں
کہ دیوار کے اس طرف
کتنے آدمی ہیں
ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں
کہ اب تک وہ
کتنی کیلیں گاڑ چکے ہیں
کتنی انھوں نے ضائع کیں
اور کتنی ان کی جیبوں میں اب بھی باقی ہیں
یہاں تک کہ ہم
ان کے معدے، آنتوں
یا جسم کے کسی بھی حصے میں اٹکی ہوئی کیلوں کی
ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر سکتے ہیں

کبھی تو ہم سے سارے دن میں
ایک کیل بھی نہیں ٹھکتی

کبھی کبھی ہم بے دھیانی میں

Scanned with CamScanner

اپنی ہتھیلی
پیشانی
یا سینے میں کیل گاڑ لیتے ہیں

کبھی یوں بھی ہوتا ہے
جسے ہم دیوار سمجھ رہے ہوتے ہیں
وہاں دیوار سرے سے ہی نہیں ہوتی
نہ پتھر
ندامت
کبھی تو ہم
صرف کیل پر ہی کیل ٹھونک رہے ہوتے ہیں

اتنی کیلیں ضائع کرنے کے بعد بھی ہمیں
کیل گاڑنا نہیں آیا
اتنی تعداد میں کیلیں گاڑنے کے بعد تو
کوئی چیز اپنی جگہ سے سرکنی نہیں چاہیے تھی
پر ایسا ہوا نہیں
چیزیں ہلیں بھی
اور اپنی جگہ سے سرک بھی گئیں
پیروں کے نیچے سے زمین
اور سر سے آسمان کا سایہ تک
ادھر اُدھر ہو جاتا ہے

Scanned with CamScanner

کام کے دوران
میں اکثر اپنے منھ میں کیلیں بھر کر
کسی سوچ میں گم ہو جاتا ہوں
کبھی تو منھ میں کیلوں کی موجودگی کا
دھیان تک نہیں آتا
کیلیں میرے معدے میں
آنتوں اور آنکھوں میں حرکت کرتی رہتی ہیں
اور جب میری پیٹھ اور پسلیوں سے
میری گردن اور بازوؤں سے
ان کی نوکیں باہر کو نکل آتی ہیں
تو میرا ہتھوڑا
حرکت میں آجاتا ہے

صبر کا پھل

صبر کا پھل بہت تلخ ہوتا ہے
پر کیا مجال
کوئی چھوٹے منھ سے
یہ بات مان تو لے

صبر کا پھل

Scanned with CamScanner

نہ صرف تلخ ہوتا ہے
بلکہ اس کے اوپر
بے شمار کانٹے بھی ہوتے ہیں
ذرا سی بے احتیاطی سے
یہ کانٹے انگلیوں میں چبھ جاتے ہیں
اور کئی گھنٹوں تک
انگلیوں میں
آگ بھی رہتی ہے

صبر کا پھل جیسی
آخر تک کھانا ہوتا ہے
اسے دانتوں سے نہیں چبایا جاتا
نہ چاقو سے چھیلا جاتا ہے
نہ اس کے کانٹوں کو ہی
اس کے چھلکے سے علیحدہ کیا جاتا ہے
گٹھلی کے ساتھ چوس چوس کر
معدے میں اتارنا ہوتا ہے

حلق سے اترتے
آنسو نکل پڑتے ہیں
یہ ہمارے تمام عضلات کو
چھیلتا، کھرچتا، اذیت دیتا
حلق تک

Scanned with CamScanner

بڑی آہستہ روی کے ساتھ گزرتا ہے
اسے کھانے سے بہتر ہے
آدمی مچھلی کا کانٹا
یا قصاب کی دکان کا آنکڑا ہی نگل لے
لیکن اگر کسی طرح
یہ ایک بار معدے میں اتر جائے
اور اس سے ہم سے کوئی پوچھے
کہ صبر کا پھل کیسا ہوتا ہے
تو بے اختیار ہمارے منھ سے یہی نکلے گا
میٹھا!

تمھارے لیے ہے یہ نظم ذی شان

ٹوٹ جانے کے بعد ستارے
ذی شان ساحل کے پاس چلے جاتے ہیں
ذی شان انھیں جوڑتا رہتا ہے
یہ سن کر آپ کو خوشی ہوگی
اب ذی شان بالکل صحت مند ہو گیا ہے
وہ دوڑ سکتا ہے
وہ بہ آسانی
کسی بھی درخت پر چڑھ اور اتر سکتا ہے

جنت کے تمام پرندوں کو
دانہ ڈالنے کی ذمے داری
اس نے سنبھالی ہوئی ہے
جنت میں وہ حوروں کے ساتھ
اکثر حوض کوثر کے آس پاس دیکھا گیا ہے
وہ آسمانوں پر
زمیں سے زیادہ مصروف رہتا ہے
یہاں تک کہ اس کے پاس
نظمیں لکھنے کے لیے بھی وقت نہیں
نہ ہم دوستوں کو یاد کرنے کے لیے
نہ تو نو یا اپنی باجی کو فون کرنے کے لیے

ہم نہیں چاہتے
کہ ذی شان ہمیں یاد کر کے آبدیدہ ہو
اور اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر
(جیسے کہ وہ اکثر اداسی میں کیا کرتا تھا)
دیر تک خلا میں گھورتا رہے

وہ بس اپنے جوڑے ہوئے ستارے
کبھی کبھی
زمین کی طرف بھی اچھال دیا کرے
تاکہ ہم انھیں سمیٹ کر
خوش ہو سکیں

Scanned with CamScanner

جیسے ہم اس کی نظمیں سمیٹ کر
خوش ہوا کرتے تھے

چھوٹی سی نوٹ بک

ایک چھوٹی سی نوٹ بک کیا کرے
جس پر بے دھڑک نظمیں لکھی جا رہی ہوں
جس کے بے داغ صفحوں پر
ایسے حروف لکھے جا رہے ہوں
جو جگہ جگہ سے گھائل
اور بے ستر ہیں
جن سے جابجا خون رس رہا ہے

ایک بار لکھ کر
انھیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا
گویا لکھے ہوئے حروف کو
دھوپ سے خشک کرنا مقصود ہو
یا کچھ دیر ہوا دے کر
ان حروف کے ساتھ جراحت کی جاتی ہے
اس کے بعد انھیں
کسی اور کاپی میں منتقل کر دیا جائے گا

Scanned with CamScanner

نوٹ بک رو رہی ہے
اس کے آنسو
اس پر لکھے الفاظ کو خشک ہونے نہیں دیتے
خاصی دیر گزر جاتی ہے
لکھنے والے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا چاہتا ہے
اب تک الفاظ کی روشنائی
خشک ہو جانی چاہیے تھی

نوٹ بک پر لکھے الفاظ
اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں
ان کے اندرونی اور بیرونی خد و خال
کاغذ پر
اس حد تک توڑ پھوڑ چکے ہوتے ہیں
کہ ایک دوسرے کو چھو کر
یا سونگھ کر
ایک دوسرے کی قربت کے احساس سے
تقویت پا کر
اپنے درمیان
مکالمے یا مواصلت کی کوئی صورت نکال لیں

جب لکھنے والا
اپنے آلاتِ جراحی لے کر

Scanned with CamScanner

نوٹ بک کے ورق کھنگالتا ہے
تو اسے وہاں کچھ نہیں ملتا
سوائے چند ٹوائلٹ پیپرز کے
جن پر
جنسی اختلاط کے
تازہ دھبے ہوتے ہیں

شیر کی آنکھیں

شیر کی آنکھیں
خشک گھاس جیسی ہوتی ہیں
پر جنگل میں
ان آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت کس میں ہے
چڑیا گھر میں تو شیر
بس سویا رہتا ہے
وہ آنکھیں کھولتا ہی کب ہے
اگر بالفرض کھول بھی لے
تو بڑی صفائی سے
خشک گھاس سے ان کی مشابہت کو
چھپا جاتا ہے
آپ اسے پکاریں

Scanned with CamScanner

جنگلے کی سلاخوں کو پکڑ کر
کتنی ہی ہاہو کریں
شیر مڑ کر نہیں دیکھتا
ایسے میں تو وہ دم ہلانا بھی پسند نہیں کرتا
بس پنجرے کی تنگنائی میں
چکر لگاتا رہتا ہے

پنجرے سے باہر
جنگلے کی مضبوط سلاخوں کے پاس کھڑے ہو کر
ہم خود کو کس قدر محفوظ سمجھتے ہیں
یہاں تک کہ ہم
شیر کو للکارنے سے بھی نہیں چوکتے
ایک محفوظ فاصلے سے
ہم شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
اس کی آنکھوں کی رنگت میں چھپی
اس خشک گھاس کو دیکھنا چاہتے ہیں

شاید ہماری آنکھوں میں بھی
شیر کو کچھ نظر آ سکتا ہو
یا ہم اپنی آنکھوں میں چھپے ہوئے کسی منظر کو
اس پر منکشف کرنا چاہتے ہیں
جو خود ہمیں
کبھی کسی آئینے میں دکھائی نہیں دیا

Scanned with CamScanner

جیسے ہم دونوں
جنگل میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو کر ہی
دیکھ سکتے ہیں

پر یہ تو سب جھوٹی باتیں ہیں
شیر کبھی کسی پنجرے میں بند ہوا ہی نہیں
شیر تو ہمیشہ سے آزاد ہے
اور میں خود کو جنگل میں
اس کے روبرو کھڑا پاتا ہوں
ایک دوسرے کی آنکھوں کے اسرار کا
حیرانی سے مشاہدہ کرتا ہوا

وہ جنگ جو کاغذ پر لڑی جاتی تھی

جب ساری جنگ کاغذ پر لڑی جاتی تھی
تو سارا خون میری کنپٹیوں میں کیوں آ کر جمع ہو گیا ہے
پھر میری سانسیں
دھویں اور چنگاریوں سے کیوں بھر گئی ہیں
یہ اتنے بہت سے زخمی
کسی کے ہاتھوں میں اس کی کٹی ہوئی ٹانگ ہے
کسی کا سر اس کی پیٹھ پر دھرا ہے

Scanned with CamScanner

کوئی اپنی دولخت کمر کو
بغل میں دابے چلا آ رہا ہے میرے پاس
''تم ہمیں زندگی دے سکتے ہو
ایک بار پھر ہمیں
ایک پورا چلتا پھرتا، روتا گاتا آدمی
بنا سکتے ہو''
میں کمرے کے کونے پر دھری
اسکاچ وسکی سے اپنے گلاس کو
آدھا بھر لیتا ہوں
ان کو اس حال میں کون لایا ہے؟
تو میں انھیں زندگی دے سکتا ہوں؟
انھیں پھر سے صحیح وسالم
اور پورا انسان بنا سکتا ہوں میں؟
یہ تو یہی کہہ رہے ہیں نا!
انھیں میرے ہاتھ
ان کے خون میں رنگے دکھائی دیتے ہیں
یہ سچ مچ مجھے اپنا قاتل سمجھتے ہیں
ان کو میں بالکل صحیح وسالم
اور یک بھر پور انسان نظر آتا ہوں
مجھے ان کو مایوس نہیں کرنا چاہیے

انھوں نے میرے ہاتھوں میں اپنا خون جو لگا دیکھا ہے
انھیں محسوس ہوتا ہے

کہ میں نے کیا ہے انھیں گھائل
ان کے ہاتھ پاؤں، کمر اور کندھے
میں نے زخمی کیے ہیں
میں نے کیا ہے ان کو سر بریدہ

یہ جانتے ہوئے
کہ اس فاصلے کو
جو ان کے اور میرے درمیان ہے
مزید کم کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے
انھیں پھر سے
صحیح و سالم اور پورا آدمی بناتا
جو ہنس سکے، جو رو سکے
جو دوڑ سکے اور گا سکے
اور جو ایسے کسی آدمی کو
جو انھیں صحیح و سالم نظر آئے
(ہنستا گاتا ہوا)
یہ اس کی بوٹیاں نوچ لیں گے
چیر پھاڑ دیں گے اسے
یہ سب جانتے ہوئے
مجھے کیا کرنا چاہیے
یہ میں تمھیں بتاؤں گا میں نے کیا کیا
میں نے ان کے کٹے پھٹے اعضا درست کر کے
انھیں ایک مکمل انسان بنایا یا نہیں

Scanned with CamScanner

اور وہ خون
جو میری کنپٹیوں میں آ کر جمع ہو گیا تھا
وہ دھواں اور چنگاریاں
جو میری سانس میں جمع ہو گئیں تھیں، کیا ہوئیں؟
بس اتنا بتا دینا کافی ہے
کہ وہ جنگ
جو کاغذ پر لڑی جاتی تھی
کاغذ سے باہر نکل آئی

نسلوں کا دق

جب آدمی تھک جائے
اور پسینے میں شرابور ہو کر
ہانپنے لگے
تو اسے پانی سے بھرا ہوا ایک کٹورا پیش کرو
اس سے پوچھو
ابھی اور آگے جائے گا؟
"دیکھو سامنے ایک پہاڑ ہے
اس کے پیچھے
اس سے بھی اونچا
اور اس کے پیچھے اور زیادہ اونچا..."

Scanned with CamScanner

اگر وہ ہاتھ سے کٹورا لے لے
رو ہانسا ہو جائے
تو اسے ایک تکیہ دو
پانی سے بھرا ہوا ایک کٹورا اور دوا سے
اسے پنکھا جھلو
اس کے پاؤں سے
بھاری جوتے اور جرابیں اتارو
اسے اپنی آرام دہ چپلیں لا کر دو
اگر پھر بھی وہ مزید سفر کا قصد رکھتا ہو
اور وہ اپنے پہلو کے نیچے رکھے
آرام دہ تکیے کو شکریے کے ساتھ لوٹا دے
تو احتراماً کھڑے ہو جاؤ
اسے ایک چاق و چوبند گھوڑا فراہم کرو
لیکن اگر وہ
پا پیادہ جانے کا عندیہ ظاہر کرے
اور تمھارے کسی بھی تحفے کو
قبول کرنے سے انکار کر دے
تو اس کو اس کی تلوار لوٹا دو
اپنی بے حیائی اور حیلہ سازی پر
تہہ دل سے معافی مانگو
اگر وہ تمھیں معاف کر دے تو ٹھیک ہے
اور اگر وہ چراغ پا ہو جائے
تو اس کے ہاتھ پاؤں کے شل ہوتے پر نہ جاؤ

Scanned with CamScanner

وہ اگر ہانپ رہا ہے
تو اس لیے نہیں
کہ وہ تھک گیا ہے
اور اگر وہ تھک بھی گیا ہے
تو اس لیے نہیں
کہ اس نے جنگل اور بیابان طے کیے ہیں
اس کے ہانپنے کی آواز میں
نسلوں کا دق بول رہا ہے
آؤ ہم سب
اس کے ساتھ مل کر
خون تھوکیں

تاج پوشی

یہ ایک آدمی کی رسم تاج پوشی ہے
جس میں
میرے علاوہ کسی نے شرکت نہیں کی
ایک انتہائی غیر اہم شخص کو
بادشاہ بنا کر
میں نے سب کو اپنا دشمن بنا لیا ہے

Scanned with CamScanner

دارالحکومت میں
میرے اور بادشاہ سلامت کے لیے
خطرہ ہی خطرہ ہے
میرا بنایا ہوا بادشاہ
تختِ شاہی پر اکڑوں بیٹھا
خوف سے لرز رہا ہے
اس نے مجھے
زنجیروں میں بندھوا دیا ہے
جانے کب
وہ میرا سر قلم کروا دے

اس کا خوف ذرا کم تو ہو لے
ابھی تو یہ خود
تختِ شاہی پر اکڑوں بیٹھا
لرز رہا ہے

میں نے بادشاہت کا مرصع تاج
ایک ایسے شخص کے سر پر رکھ دیا ہے
جو اوروں کے نزدیک
بادشاہت کے لائق تھا ہی نہیں
نہ وہ تخت و تاج کا جائز وارث تھا
نہ ایک اچھا سپاہی
اور نہ علم و حکمت کے میدان کا شہسوار

Scanned with CamScanner

ان کے نزدیک تو
یہ بہتر تھا
کہ میں خود بادشاہ بن بیٹھتا
اگرچہ رموزِ مملکت سے
آگاہ تو میں بھی نہیں تھا
پر ایک اچھا سپاہی تو تھا

دارالحکومت میں
جدھر سے میں گزرتا
چوک میں آوارہ گھومتے سپاہی
مجھے دیکھ کر
مستعد ہو کر اپنے کام میں جت جاتے
اور شہدے اور مفت خورے
ادھر اُدھر ہو جاتے تھے

میرے پابہ زنجیر ہونے کی خبریں
پل پل کی خبروں کے ساتھ
کوچہ بازار میں گردش کر رہی تھیں
ایک جم غفیر
شاہی محل کے سامنے
ساکت اور جامد کھڑا تھا

دارالحکومت میں

Scanned with CamScanner

اس سے زیادہ سنسنی پہلے کبھی نہیں پھیلی تھی
پہلے کبھی کوئی بادشاہ
مسندِ شاہی پر اکڑوں بھی نہیں بیٹھا تھا
اس طرح
کہ اسے بادشاہ بنانے والا
زنجیروں میں بندھا ہوا ہو

بازار میں
سارے ہنرمند اور دستکار
اپنا آسن جھٹک کر
اور دکاندار دکانیں کھلی چھوڑ چھاڑ کر
محل کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے
عجیب بات یہ تھی
کہ سارے شہدے اور مفت خورے
جو ایسے موقعوں کی تاک میں ہوتے ہیں
وہ بھی شاہی اہلکاروں، دستکاروں
ہنرمندوں، تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ
خاموش اور باادب کھڑے تھے
ایسے میں تو لوٹ مار
اور بلوہ ہو جانا چاہیے تھا
یہ نظم و ضبط کیسے قائم رہ گیا
آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانی چاہیے تھی
ایک فساد برپا ہو جانا چاہیے تھا

Scanned with CamScanner

اور وار الحکومت کی
اینٹ سے اینٹ بج جانی چاہیے تھی
کیا یہ نظم ضبط
اس لیے تھا
کہ مجھ جیسے سپاہی کو
پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا
یا اس لیے
کہ مسندِ حکومت پر
خود عالی جاہ
اکڑوں بیٹھے
کانپ رہے تھے

مسلسل التوا میں ڈالا جانے والا ایک کام

پھول توڑنے
اور قتل کرنے کے لیے
ایک ہی سطح کی کاریگری چاہیے ہوتی ہے
آپ کو
ہاتھوں میں دستانے چڑھانے ہوں گے
صبح جلدی اٹھنا ہوگا
ناشتہ بھاری نہ کریں
توس پر مکھن نہ لگائیں

Scanned with CamScanner

اپنے آپ کو رات ہی سے
اس کام کے لیے تیار رکھنا ہوگا
آپ کو ایک بھرپور نیند لینی ہے
اگر آپ پوری نیند نہ لے سکے
تو اس بات کا امکان ہے
کہ آپ کا مشن ادھورا ہی رہ جائے
یا اسے آپ کو
کسی اور مناسب وقت کے لیے
ملتوی کرنا پڑے

ایک بار آپ نے خود کو
پھول توڑنے
یا قتل کے اقدام سے روک لیا
تو اس بات کا امکان قوی تر ہو جاتا ہے
کہ آپ یہ کام
کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں گے

جیسے میں تیس برس پہلے
کسی بنا پر
اس کام کو انجام دینے سے رہ گیا تھا
آج بھی
میں اکثر اپنے ہاتھوں میں
دستانے چڑھا لیتا ہوں

Scanned with CamScanner

لیکن کبھی رات

پوری نیند لینے سے رہ جاتا ہوں
کبھی توس پر مکھن لگانے کے بعد
مجھے اس کا خیال آتا ہے

اب جب میں ایک شاعر بن گیا ہوں
کبھی رات کبھی دن
کبھی تیز دوپہر میں
پسینے میں شرابور ہونے کے باوجود
میں خود کو نظمیں لکھتا ہوا پاتا ہوں
ایسے میں اکثر
میں نے ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوتے ہیں
اور سامنے طشتری میں
توس پر مکھن بھی نہیں لگا ہوتا

ناکام کوشش

فرض کرلیں کہ ہم نیند میں چل رہے ہیں
یا جو کچھ ہم بول رہے ہیں
یہ بڑبڑاہٹ نیند کے دوران کی ہے
فرض کریں خواب
صابن کے جھاگ سے بنا ہوا

Scanned with CamScanner

ایک بڑا سا ملبہ ہے
جسے ہم اپنی بیداری میں
خود اپنی جاگ کی تضحیک کے لیے بناتے ہیں

ہم نظمیں صرف اس لیے بنانے لگتے ہیں
کہ ہم سے گڑھا نہیں کھودا جا سکتا
پتھر کی ناند پر ہم
لکڑی کی روٹی تیار نہیں کر سکتے
یا جب ہم سے جھوٹ نہیں بولا جاتا
تو ہم
اپنے ضمیر پر پتھر رکھ کر
سچ اُگل دیتے ہیں
اور ہمارے معدے سے نکلا ہوا سچ
جب ہماری آنکھوں کے سامنے
جان دینے لگے
تو ہم
اپنے نزدیک ترین رکھی ہوئی
کسی بھی شے میں
خود کو معلّب کرنے کی
ناکام کوشش کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

ہم سب کچھ بھولنا چاہتے ہیں

لوگ خود بنالیں گے اپنا راستہ
لوگ سڑک پر آ گئے ہیں
سڑک بند کر دی ہے انھوں نے
اس بار تو انھوں نے
ریت کی بوریوں کی آڑ بھی نہیں بنائی
اس بار تو اپنی صفوں میں
کسی ترتیب اور نظم وضبط کا اہتمام بھی نہیں کیا
اس بار تو خون کی پھسلن کے باوجود
کوئی پھسلا بھی نہیں
جیسے خون کی اس کیچڑ نے
ان کے پاؤں
زیادہ مضبوطی سے جما دیے ہوں
اس بار تو کسی نے سسکی بھی نہیں لی
پر اس بار سامنے سے بھی تو کوئی گولی نہیں چلی
نہ بکتر بند وتینک کی دھمک
تو کیا میدان صاف پڑا ہے
کیا جبر کے تمام ادارے
مفلوج ہو چکے ہیں
یا کسی مفاہمتی راستے کی بات چل رہی ہے
یا دونوں مزاحم قوتیں

Scanned with CamScanner

ایک دوسرے کی قوت کا اندازہ کر رہی ہیں
یا کوئی تیسرا حل نکال لیا گیا ہے
اور اگر کوئی تیسرا راستہ تھا
تو اب سے پہلے اس کی طرف کسی کا دھیان کیوں نہیں گیا
یہ تیسرا راستہ کہاں جاتا ہے
اور کتنے آگے جا کر یہ بند ہوتا ہے
جہاں یہ بند ہوگا
وہاں سے اور کتنے راستے نکلیں گے
اور کیا یوں راستوں سے راستے نکالنے کے بعد
ہمیں یاد رہ سکے گا
کہ ہم کہاں سے چلے تھے
یا یہ کہ ہمارا رخ کس طرف تھا
یا
ہم سب کچھ بھولنا چاہتے ہیں

نظم

ایک چیونٹی
پہاڑ پر چڑھ رہی ہے
اس بات پر وہ
کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے

Scanned with CamScanner

ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے
آنسو نکل پڑتے ہیں
جبڑے دکھنے لگتے ہیں
جبڑے دکھنے لگتے ہیں
پر گدگدی کسی طرح ختم نہیں ہوتی
پٹھوں کے کھنچاؤ سے
اعصاب میں بھی ایک تناؤ سا آ جاتا ہے
اس غیر متوقع صورت حال سے
نمٹنے کے لیے
جسم کے اینزائمز کو
سخت دشواری پیش آتی ہے
معدے اور گردوں کے افعال
بری طرح متاثر ہوتے ہیں
سانس کی نالی میں
کوئی چیز اٹک سی جاتی ہے
دانت بھنچ جاتے ہیں
اور منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں
ایمبولینس بلائی جاتی ہے
اسٹریچر لایا جاتا ہے
ایمبولینس میں منتقل کیا جاتا ہے اسے
ٹریفک جام ہے
ایمبولینس کو راستہ نہیں مل رہا
چیونٹی پہاڑ پر احتیاط سے قدم رکھتی ہے

Scanned with CamScanner

کہیں کوئی پتھر نہ لڑھک جائے
ایمبولینس میں
مریض کو آکسیجن دی جا رہی ہے
سلنڈر میں
آکسیجن وافر مقدار میں نہیں
اسپتال جلد سے جلد پہنچنا ہے

چیونٹی کی کیا خبر ہے؟
وہ پہاڑ پر...
آکسیجن کا سلنڈر جواب دے جاتا ہے
مریض کے منھ سے
ماسک ہٹا دیا جاتا ہے
مریض کی سانس اکھڑی ہوئی ہے
چند قدم کا فاصلہ
پہاڑ لگنے لگتا ہے
ایمبولینس کو راستہ نہیں مل رہا
چیونٹی کا سفر جاری ہے
کوئی سرخ بتی
یا ٹریفک جام
اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں
ایک پہاڑ ہے
اور ایک چیونٹی
اور ایک ایمبولینس ہے

Scanned with CamScanner

جس میں اسٹریچر پر
ایک مریض
آخری سانسیں لے رہا ہے

دو اشعار

آدمی کو
بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ
اپنے ناخنوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے
بڑی ذمے داری سے
ہر دوسرے روز
شیو بنانا ہوتا ہے
اور دن میں کئی کئی بار
ہاتھ دھونے پڑتے ہیں
اگر وہ ایسا نہ کرے
تو وہ وہ نہیں رہے گا
وہ دن میں دو ایک بار
آئینہ ضرور دیکھتا ہے
اپنی مونچھوں کی تراش
ناک کے نتھنوں سے
باہر جھانکتے بال

Scanned with CamScanner

اور رخسار کی
دن بدن گہری ہوتی سلوٹ
ہر وقت اس کے ہاتھ میں
ناخن تراش
چھوٹی سی قینچی
اور ایک آئینہ ہونا چاہیے
گھر ہو یا دفتر
یا دوستوں کی محفل
کام کے شدید دباؤ کے باوجود
وہ اپنے چہرے کا
دن میں کئی بار
جائزہ ضرور لیتا ہے
اپنے دوستوں
افسروں
اور ماتحتوں میں سے کوئی بھی
ایک نہ ایک ایسا فقرہ ضرور کہہ ڈالتا ہے
جس میں اس کے چہرے
جلد یا بدن کے کسی نہ کسی حصے کے بارے میں
تشویش کا کوئی پہلو نکلتا ہو
وہ وہ نہیں رہا
کچھ اور ہوتا جا رہا ہے
کچھ اور
جسے پہچاننے میں

Scanned with CamScanner

اوروں کے ساتھ ساتھ
خود اسے بھی تشویش ہوتی جا رہی ہے
ایک دن آدمی
تھک ہار کر
ناخن تراش، قینچی
اور آئینے کو ایسی جگہ چھپا کر رکھ دیتا ہے
جہاں سے وہ اسے پھر کبھی نہ مل سکیں
پھر وہ اپنے بارے میں ریمارکس سنتا ہے
اور کسی معصوم بچے کی طرح کھل اٹھتا ہے
اپنے پوتے کو اپنا ہاتھ تھامنے دیتا ہے
ایسا کرتے ہوئے
وہ اس کے نرم و نازک ہاتھ کی
صاف اور بے شکن جلد کو دیکھتا ہے
اس کے سرخ اور صحت مند ناخنوں کو چھوتا ہے
یہ گداز ہاتھ
اسے دو خوب صورت مصرعے دکھائی دیتے ہیں
جن میں بظاہر کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا
پھر وہ اپنے بازو
ان ننھے ننھے بازوؤں کے قریب کر دیتا ہے
یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی
اب یہ دو اشعار ہیں
دو بامعنی اشعار

Scanned with CamScanner

کھاتے پیتے لوگوں کی شرم

ہم بڑے کھاتے پیتے لوگ ہیں
خوب الا پ شلاپ بھر لیتے ہیں
اور بہت بے فکرے بھی
کسی چیز کی کمی نہیں ہم کو
ہمیں تو چیزوں کی افراط نے مارا ہے
بے ڈھب اور توندو بنا دیا ہے
معدے کا سارا نظام خراب ہو چکا ہے ہمارا
اتنا کچھ کھانے کے باوجود
کہیں ہانڈی چڑھی ہو
کانوں کی مہک سے
ہمارے نتھنے پھڑ کنے لگتے ہیں
اور توند میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے
قدم خود بخود
خوشبو کی لپٹوں کے منبع اور ماخذ کی طرف اٹھ جاتے ہیں
ہم بھوکے نہیں
دیگوں، پتیلیوں اور بھگونوں پر رکھے ڈھکن
آپ سے آپ بجنا شروع ہو جاتے ہیں
جیسے وہ ہمیں خوش آمدید کہہ رہے ہوں
یا جیسے کہہ رہے ہوں
لو وہ آ گئے!...

Scanned with CamScanner

بڑے بڑے کرچھے اور کفگیر
دیگوں اور پتیلوں میں
خود بخود گھومنے لگتے ہیں
بڑے بڑے تسلے اور سینیاں
لپک لپک کر
دوڑ پڑتی ہیں
بوٹیاں، ہڈیاں، چربی کے گولے
اچھل اچھل کر اور پھدک پھدک کر
تسلوں اور سینیوں میں آپ ہی آپ منتقل ہو جاتے ہیں
اور یہ تسلے اور سینیاں
اوپر تلے
ہمارے معدے کے فراخ میں
جگہ بناتے چلے جاتے ہیں
لوگ ہمیں دیکھ کر
باہر کھسکنا شروع کر دیتے ہیں
پل کے پل میں
ساری دیگیں چٹ ہو جاتی ہیں
ہمیں پتا بھی نہیں چلتا
کب اور کیسے ہماری پلک جھپک گئی
کب صبح ہو گئی
کب تنبوؤں اور طنابوں کی رسیاں کھولی گئیں
اور سامان ٹرک پر لادا جانے لگا
اس ہڑ بڑ میں کہیں ہماری آنکھ کھل جاتی ہے

Scanned with CamScanner

رات کی شکم سیری پر
ہماری شرمندگی بڑھنے لگتی ہے
شرم کے مارے
دل چاہتا ہے کہ ہم قے کر دیں
اور سارا کھایا پیا اُگل دیں
پر ہمیں یہ ڈر آ گھیرتا ہے
کہ ایسا کرنے کے بعد
ہماری بھوک پھر سے جاگ گئی تو...؟

ایک عجیب سی حمد

کسی نہ کسی کو
کوئی نہ کوئی
زندگی ضرور دیتا ہے
کوئی پالتا اور نگرانی کرتا ہے
دودھ پلاتا ہے
ہوا، پانی اور میووں کے ذخائر
فراہم کرتا ہے
چلنا سکھاتا ہے
گرتا اور گر کے رونا سکھاتا ہے
خوف زدہ ہوتا

Scanned with CamScanner

اور مدد کے لیے پکارنا سکھاتا ہے
تابعداری اور بندگی سکھاتا ہے
پھر سکھاتا ہے سرکشی
پھر سرکشی کی سزا تجویز کرتا ہے
کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور کرتا ہے
کوئی نہ کوئی تو روتا ہے
جب ہم پہلی ٹھوکر کھاتے ہیں
اور اپنی کہنیاں اور گھٹنے چھیل لیتے ہیں
جب ہم محبت کرتے ہیں
تو کوئی ہمیں رشک و حسد سے دیکھتا ضرور ہے
کوئی نہ کوئی تو
اپنی کند چھری کو
پتھر پر گھس کر ہمارے لیے تیز کر رہا ہے
کوئی تو ہے جو ہماری گھات میں ہے
کوئی تو ہے جو اگرچہ ہمیں نظر نہیں آتا
پر ہمارے پیش قدمی کرتے ہوئے مہروں کو
برابر پیٹ رہا ہے
وہ کسی بھی وقت یہ بساط الٹ دے گا
اور فتح کا نعرہ مارتا ہوا
ہماری گلیوں کو روند ڈالے گا
جلا ڈالے گا ہمارے گھر
ہماری عفتوں کے اطلس کو
تار تار کر ڈالے گا

Scanned with CamScanner

کوئی تو ہوگا

جو اس بربریت کے خلاف آواز اٹھائے گا
اور ہماری خاکِ مذلت کو
پھر سے گوندھے گا
اور ہمیں نئی شبیہ
اور نئے خال و خط میں ڈھالے گا
پھر کھلی دھوپ اور بارش میں
ہمیں رکھ کر بھول جائے گا

مداوا

آدمی کو پاؤں میں جوتے پہنا دو
اس کی ادھڑی پتلون کو رفو کر دو
اس کے ناخن تراش دو
اور اس کے بسورتے منھ پر
ایک مسکراہٹ چپکا دو

تھوڑی دیر تک تو یہ مسکراتا رہے گا
پھر اپنی پتلون کی زپ کھول کر دکھائے گا

یہ ایک طوائف چاہتا ہے

Scanned with CamScanner

جو اس کی بے لگام خواہشات کو
اس قدر ہوا دیتی ہے
کہ اس کے جنسی عضلات منتشر کر رہ جاتے ہیں
وہ یا اپنی نامردی چھپانے کے لیے
جھٹ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر
اپنی زپ بند کرنے لگتا ہے

ایک چلتے ہوئے پہیے سے
آدمی کو
بار بار گزارا جائے
اسے چبانے کو بلیڈ دیے جائیں
اس کی غذا
گھر سے دان میں کہیں داب دی جائے
جسے وہاں سے
وہ کرید کرید کر حاصل کرے

اس کے جنسی غدودوں کو
کچھ دنوں کے لیے
لکڑی کے شکنجوں میں دبا کر چھوڑ دیا جائے
کسی بھی ایسی جراحت کے ہم مخالف ہیں
جس میں اس کے جنسی غدود
یا اس کا معدہ نکلوا دیا جائے
یا اس کے ساؤنڈ بکس کی جگہ

کوئی آڈیو کیسٹ
بادل کی جگہ
سرخ دہکتی ہوئی
گھوڑے کی نال رکھ دی جائے
جسے صحیح شکل دینے کے لیے
ہتھوڑوں کی
کچھ اور ضربیں درکار ہیں

بچھو

میں ایک بچھو کو کاغذ پر چھوڑتا ہوں
بچھو کچھ دیر
کاغذ کی سطح پر سست کر بیٹھ جاتا ہے
پھر وہ اپنی دم
آہستہ آہستہ اوپر کرتا ہے
پیٹ کے نیچے چھپی ٹانگوں کو پھیلاتا ہے
پھر کاغذ پر ایک گول چکر لگاتا ہے
تھوڑی دیر
وہ کبھی رک کر
کبھی چل کر
کاغذ کی لمبان اور چوڑان کا جائزہ لیتا ہے

Scanned with CamScanner

اور جب وہ ان چیزوں کا پوری طرح درک حاصل کر چکتا ہے
تو وہ اپنے ڈنک کو حرکت میں لاتا ہے
لیکن چند ایک ضربوں کے بعد ہی
وہ اُوب سا جاتا ہے
کاغذ اب اس کے لیے کشش کھو چکا ہے
اب وہ اس کاغذی سرحد کو پھلانگنا چاہتا ہے
اس دوران جیسے اس پر کوئی بات منکشف ہو جاتی ہے
وہ اپنا ڈنک سمیٹ لیتا ہے
اور اپنی ٹانگیں پھر سے پیٹ کے نیچے چھپا لیتا ہے
شاید اسے میرا ہاتھ
یا اس میں دبی چمٹی کا کچھ اندازہ ہو گیا ہے
میں احتیاط کے ساتھ
بچھو کو چمٹی سے پکڑتا ہوں
اور ماچس کی ڈبیا میں
پھر سے بند کر لیتا ہوں
ماچس کی ڈبیا میری مٹھی میں ہے
کاغذ ابھی تک میز پر دھرا ہے
مجھے کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا
کہ کاغذ پر حروف پوری طرح ابھر آئیں
ورنہ مجھے اپنی مٹھی میں دبی
ماچس کی خالی ڈبیا کے لیے
اپنی ہتھیلی سے
ایک اور بچھو پیدا کرنا ہو گا

جو اپنی کھال الٹ کر پہن سکتا ہے

جن لوگوں کو ہم بھول گئے ہیں
انھوں نے ایک اور ہی کرہ آباد کر لیا ہے
وہ سب
وہاں جمع ہو کر ہمیں یاد کرتے ہیں
ہمیں یاد کرنے کے سوا
ان کے پاس کچھ کام ہے ہی نہیں
یہی ان کا کسب ہے
یہی ان کی عبادت
یہی ان کے شب و روز

جن لوگوں کو ہم بھول گئے ہیں
وہ خدا کو بھی یاد نہیں کرتے
وہاں ایک لنگڑا بہارا ہے
ایک بڑھئی
ایک فوجی آمر
اور ایک جلاد ہے
ایک کوڑھی بھی ہے وہاں
جس نے اس زمین پر بھی کچھ نہیں کیا تھا
وہاں بھی کچھ نہیں کرتا
فوجی آمر اس پر دانت پیستا ہے

Scanned with CamScanner

بڑھئی اس کے لیے کچھ نہیں بناتا
لکڑہارا اس کا حمام گرم رکھنے کے لیے
اسے لکڑی فراہم نہیں کرتا
لیکن جلاد اس سے ہمدردی رکھتا ہے
وہ سیاہ لوہے سے بنی
اپنی زنگ آلود تلوار کو
پتھر پر گھس گھس کر
اس کا زنگ دور کرتا ہے
لیکن شام کے کسی پہر
یا دن کی کسی ساعت میں
یہ سب جمع ہو کر
ہمیں یاد کرتے ہیں

ویسے بھی وہاں
بڑھئی، جلاد، یا کسی فوجی آمر میں
کوئی خاص فرق ہے ہی نہیں
اسی لیے لکڑہارا
کبھی جلاد کی جگہ لے لیتا ہے
اور کبھی بڑھئی
فوجی آمر کی گدی پر بیٹھ کر
حکم چلانے لگتا ہے
کبھی فوجی آمر
جلاد کی سیاہ لوہے سے بنی تلوار کو

Scanned with CamScanner

الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے

عجیب بات یہ ہے
کہ ان میں سے کوئی
کوزہ بننے پر تیار نہیں
حالانکہ
ان میں کوزہ ہی واحد ایسا ہے
جو اپنی کھال الٹ کر بھی پہن سکتا ہے

Scanned with CamScanner

سید محمد اشرف

کیا قافلہ جاتا ہے

ہم لوگ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ سامنے لوہے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ علی گڑھ میں وہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ہم چار افراد تھے۔ شارق ادیب، طارق چھتاری، غیاث الرحمٰن اور میں۔ گرمیوں کی سہ پہر ڈھل رہی تھی اور ہم اُن سے وقت لے کر وقت پہ پہنچے تھے۔ وہ پروفیسر ساجدہ زیدی کے یہاں مقیم تھیں۔ ہم چاروں ان سے ملنے کے اشتیاق میں سرشار تھے۔ ملازم نے اطلاع دی کہ گھر پر کوئی نہیں ہے، اچانک کہیں جانا پڑا۔ آپ لوگوں کے لیے کہا ہے کہ انتظار کریں۔ ہم وہیں لان میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ ہمارا رخ مین گیٹ کی طرف تھا۔ گزرنے والی ہر سواری پر گمان ہوتا کہ وہی لوگ ہوں گے۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں موٹر گاڑیاں بہت کم تھیں۔ سواری کے نام پر رکشے ہی ہوا کرتے تھے۔ کبھی داہنی طرف سے رکشے کا اگلا پہیہ نمودار ہوتا اور گیٹ میں مڑے بغیر سیدھا نکلتا چلا جاتا۔ کبھی بائیں طرف سے ایسا ہی ہوتا۔ اچانک دودھ پور کی طرف سے آنے والے رکشے کا پہیہ گیٹ میں داخل ہوا۔ پروفیسر ساجدہ زیدی کے ساتھ ایک بے حد حسین و جمیل خاتون ساڑی کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے نیچے اتریں۔

"بھئی معاف کیجیے گا۔ آپ کو وقت دے کر انتظار کرایا۔ دراصل شمی کپور کی وہ فلم لگی ہوئی تھی جس میں اس خاکسار نے ڈائیلاگ لکھے تھے۔ ابھی تک دیکھی نہیں تھی۔ سب کا بے حد اصرار ہوا کہ آج تصویر محل میں جا کر فلم ملاحظہ کی جائے۔ وہیں سے سیدھے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ہمارے مکالمے سخت مایوس کن تھے۔"

Scanned with CamScanner

چائے اور بسکٹوں سے تواضع ہوئی۔

''چلیے جناب! اپنی اپنی کہانیاں سنائیے۔''

ہم لوگ گئے ہی اس ارادے سے تھے۔ فوراً شروع ہو گئے۔ میں نے غالباً ''چکر'' اور غیاث الرحمٰن نے ''آنچل'' کہانی سنائی۔ خوش ہوئیں، کہنے لگیں:

''پڑھا کیجیے۔ ہر طرح کی چیزیں پڑھا کیجیے۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنا ضروری ہے۔''

شارق ادیب نے اپنے مطالعے کے ثبوت میں ان کے ناولوں کا ذکر چھیڑا لیکن وہ خوبصورتی سے ٹال گئیں۔

یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی جس میں ان کا چہرہ پہلی بار دیکھا۔ پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں مارہرہ شریف ہی میں پڑھتا تھا۔ بمبئی گھومنے گیا تھا۔ اپنے تایا زاد بھائی سے ضد کی کہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین اور بیدی سے ملوا دیجیے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دن میں تینوں سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی شہر کی ایک سمت میں ہیں اور راجندر سنگھ بیدی بالکل دوسری طرف۔ ہم لوگ پہلے عصمت آپا سے ملے۔ اس وقت بہت کم عمر تھا۔ اس بات کو تقریباً پینتیس برس ہو گئے۔ وہ چرچ گیٹ کے آس پاس رہتی تھیں یا شاید ہمیں ان کے گھر پہنچنے کے لیے چرچ گیٹ اسٹیشن تک آنا پڑا تھا۔ عصمت آپا بہت کرید کرید کر ہم دونوں کے لکھنے لکھانے کے بارے میں معلوم کرتی رہیں۔ پھر ان کی ایر ہوسٹس بیٹی بھی آ گئیں۔ عصمت آپا نے باداموں سے لبالب بھری پلیٹ ہمارے سامنے رکھ دی۔ دیر تک ہم دونوں بھائی ان سے باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں ادب سے متعلق کم اور مارہرہ شریف سے متعلق زیادہ تھیں۔ کیونکہ میرے بھائی کے چہرے پر داڑھی تھی اس لیے اس دن عصمت آپا نے آزادیٔ نسواں سے متعلق بھی بہت سی باتیں کیں۔ خوب اصرار کر کے بہت سے بادام کھلائے اور بڑی بڑی پیالیوں میں چائے پلوائی۔ ان کی بیٹی بھی ہم لوگوں کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

اس ملاقات کے کئی برسوں بعد عصمت آپا سے اگلی ملاقات علی گڑھ میں ہوئی جہاں وہ جمیلہ آپا کے گھر مقیم تھیں اور جہاں وہ جاڑوں کی دھوپ میں آنگن میں پلنگ پر بیٹھ کر گھنٹوں مونگ پھلی کھاتی تھیں اور جمیلہ آپا اور اپنے ہم عمروں کے ساتھ تاش کھیلتی تھیں۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں ان کا علی

Scanned with CamScanner

گڑھ آنا تو اتر کے ساتھ ہوتا تھا۔ علی گڑھ آنے کے بعد وہ جمیلہ آپا کے ذریعے ہاسٹل میں اپنے آنے کی اطلاع کرا دیتی تھیں۔ پھر ان کے آنے کے سلسلے میں مختلف انجمنوں کے تحت نشستیں ہوتی تھیں۔ عبداللہ گرلس کالج کی استانیاں بھی انھیں بہت شوق سے مدعو کرتی تھیں۔ ایک دن فرمایا کل مارہرہ جانے کا ارادہ ہے۔ چلو گے؟ میں نے کہا، دوپہر تک کلاسیں ہیں، دوپہر کے بعد چلیے۔ دوسرے دن جمیلہ آپا کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اکیلے ہی مارہرہ چلی گئی ہیں۔ مجھے بہت تشویش ہوئی۔ فوراً بس میں بیٹھ کر موہن پورہ اور موہن پورہ سے رکشہ کر کے مارہرہ پہنچا۔ وہ شیخ وسیم احمد کے یہاں مقیم تھیں جن کی بیوی سے ان کی قرابت تھی۔ وہاں پہنچا تو امی (اہلیہ شیخ وسیم احمد) نے بتایا۔

"بھیا، آئی تو ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جنگل باغوں کی سیر کو نکل گئیں اور وہ بھی اکیلی۔ ذرا دیکھ کے تو آؤ۔"

بازار میں آ کر معلوم ہوا کہ ایک گوری چٹی بھاری بھرکم خاتون سفید ساڑی پہنے شاہ باغ کی طرف گئی ہیں۔ میں ان کی تلاش میں حیران پریشان شاہ باغ کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ قصبے سے دو میل دور سرائے احمد خاں نام کے گاؤں کے پاس کرگھے والے ایک شخص سے باتیں کر رہی ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا ہے جس میں کوئی وزنی چیز ہے۔ مجھے آتا دیکھ کر انھوں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کپڑے والے سے مول تول جاری رکھا۔ انھوں نے موٹے سوت کے کپڑے کا پورا تھان اپنے حساب خوب چکا کر خریدا جسے لاد کر ایک رکشے میں لایا گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس نے اپنا تھان مارکیٹ بھاؤ پر ہی بیچا ہے، کوئی خاص رعایت نہیں کی ہے۔ میں نے کچھ بولنا چاہا تو بولیں، "میں جانتی ہوں اور اس سے کم بھاؤ پر خریدنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اب اسے بمبئی لے جا کر اپنی پسند سے ڈائی کراؤں گی اور کھڑکیوں دروازے کے پردے بنواؤں گی۔ بہت عمدہ چیز مل گئی۔"

"اور اس تھیلے میں کیا ہے؟" میری متجسسانہ نظروں نے اس وزنی تھیلے کو تولا۔

"اس میں نہایت عمدہ امرود ہیں جو صرف پانچ روپے میں مل گئے۔ بمبئی میں اسے جام کہتے ہیں اور وہاں ایک کلو جام دس روپے کا ملتا ہے۔"

ان کی جائے قیام پہنچے تو بیگم وسیم احمد نے ان کی خریداری دیکھ کر سر پیٹ لیا۔

"عصمت آپا، یہ بورے جیسا کپڑا آدھے داموں میں ولواتی اور امرود ہم لوگ خرید کر کیوں

Scanned with CamScanner

کھائیں، ہمارے باغ بھرے پڑے ہیں۔"

عصمت آپا ان سے کچھ نہیں بولیں۔ تھوڑی دیر بعد مجھے مخاطب کر کے آہستہ سے بولیں "بمبئی کے مقابلے میں دونوں چیزیں بہت سستی مل گئیں اور پھر جنگل دیہات جا کر خریداری کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

میں نے کہا، "کل دوپہر کا کھانا ہمارے گھر ہے۔ چنے یا مکا کے بھٹے دانے خریدنے کل کسی دیہات کی طرف مت نکل جایئے گا۔" ہنسنے لگیں۔ پھر بولیں، "اپنی امی سے کہنا کہ روایتی چیزیں نہ پکائیں۔ قصباتی اور دیہاتی چیزیں کھاؤں گی۔"

گھر آ کر میں نے والدہ سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے عصمت آپا کو خوب پڑھ رکھا تھا۔ ہماری امی اور بڑی اماں میں سر جوڑ کر بیٹھک ہوئی کہ کل کھانے میں کیا ہونا چاہیے۔ دوسرے دن وہ گیارہ بجے کے قریب خانقاہ پہنچیں اور جب گھر میں داخل ہوئیں تو ان کا ڈیل ڈول، ہیر اسٹائل اور بے پردگی دیکھ کر ہمارے گھر کی پرانی پرانی خادمائیں کونوں میں گھس گئیں۔

تخت پر دسترخوان لگا ارد کی دال، مونگ کی بریاں، اروی کے پتوں کی سبزی، لوکی پڑا گوشت اور زیرے کے بگھار کے چاول دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ آخر میں جب رساول رکھا گیا تب تو بیحد خوش ہوئیں۔ وہیں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کھانا کھانے کے بعد عصمت آپا نے جیسے ہی سگریٹ نکال کر سلگائی، کام والیاں "اوئی" کہہ کر اچھل کر بھاگیں اور بڑی اماں مرحومہ نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ چھپا کر عصمت آپا سے پردہ کر لیا۔

عصمت آپا کا ذکر آ گیا تو بات آگے پہنچ گئی۔ بینی آپا سے پہلی ملاقات کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ ان سے ملنے سے پہلے دل ڈرا ڈرا سا تھا۔ لوگوں نے بتا رکھا تھا کہ بینی آپا بہت نستعلیق ہیں اور بات بات میں انگریزی بولتی ہیں۔ بہت آسانی سے کسی سے ملتی نہیں ہیں پیڈر روڈ یا وارڈن روڈ کی کسی بلڈنگ میں ان کے مکان کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر منوں رعب طاری ہو چکا تھا۔ دروازہ ان کی ایک مہمان خاتون نے کھولا۔ بینی آپا نے ہم دونوں کو اندر بلوا لیا۔ چائے اور ہلکا ناشتہ آیا۔ وہ بھائی صاحب سے تصوف کے موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔ بیچ بیچ میں مجھ سے بھی کچھ پوچھ لیتی تھیں۔ میں سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ پھر ہم لوگ اجازت لے کر اٹھ لیے۔ اس بار وہ

دروازے تک چھوڑنے آئیں۔ میں نے چلتے چلتے بھی ان کا چہرہ نہیں دیکھا لیکن راستے بھر یہ سوچ سوچ کر کڑھتا رہا کہ بلاوجہ اتنا ڈرتا رہا تھا۔ وہ فرفر انگریزی بول رہی تھیں اور نہ ہی کوئی ناقابل فہم بات کر رہی تھیں۔ پہلی ملاقات میں ان کا چہرہ نہ دیکھ پانے کا افسوس بہت دن تک رہا۔

دوسری ملاقات کے بعد ان سے تین دہوں تک ملاقات رہی۔ علی گڑھ میں پہلے ان کا قیام پروفیسر ساجدہ زیدی کے گھر ہوتا تھا۔ پھر وہ مہمان بن کر پروفیسر ثریا حسین سابق صدر شعبۂ اردو کے گھر جمال پور کے علاقے میں قیام کرنے لگیں۔ جس زمانے میں وہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے عہدے پر آئیں تب یونیورسٹی نے ان کے قیام کے دوران گیسٹ ہاؤس کی پیشکش کی جسے غالباً انھوں نے نامنظور کر دیا۔

بمبئی کی سکونت کو خیرباد کہہ کر جب انھوں نے دلی بسائی تو میری ان کی ملاقاتیں ذاکر باغ کے ٹاور والے مکان میں ہوتی تھیں۔ پھر اس جگہ کو چھوڑ کر وہ نوئیڈا کے جل وایو وہار میں آن بسیں۔

یہی زمانہ تھا جب انھوں نے "گردش رنگ چمن" لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک دن ان کا خط ملا۔

"جناب سید محمد اشرف صاحب، سلام علیکم..."

تفصیل یہ تھی کہ انھیں اپنے ناول میں ولیم گارڈنر نام کے ایک انگریز اور اس کے خاندان کا تفصیلی ذکر کرنا تھا۔ اور ان کے علم میں لایا گیا تھا کہ یہ انگریز بہادر ایک مغل شہزادی کے شوہر تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی مارہرہ کے مشہور بزرگ سید شاہ آل رسول احمدی قدس سرہٗ سے رشتۂ عقیدت رکھتے تھے۔ عینی آپا کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ یہ انگریز خاندان بہت پابندی سے عزاداری کی رسم ادا کرتا تھا اور ان کے پوتے پرپوتے مارہرہ شریف کے نواح میں کہیں رہتے ہیں۔ وہ موجودہ خاندان کی تفصیل اور ان کی موجودہ رسومات کے بارے میں معتبر معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے اپنے بزرگوں سے معلوم کیا تو علم ہوا کہ 1850 کے قریب ولیم گارڈنر اپنی مغل بیگم اور لاؤلشکر کے ساتھ خانقاہ کے گوشہ نشینوں کے پاس آتے تھے۔ وہ اس وقت انگریزی حکومت میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ میں نے دفتر سے کچھ روز کی چھٹی لی اور مارہرہ کے نواح میں اس گاؤں تک پہنچنے کی تیاری کی۔ اس علاقے کے نائب تحصیلدار کی جیپ میں بیٹھ کر کھیتوں کھیتوں ہوتے ہوئے "منوٹہ" نام کے گاؤں میں پہنچے۔ گارڈنر خاندان کے سب سے بزرگ انسان سے ملے جن کی بیٹیاں دلی کے مشن

اسپتالوں میں نرس کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ ان یوریشین یا اینگلو انڈین بزرگ نے اپنے خاندان کے ہندوستان میں آنے کے بعد سے اس وقت تک کے سماجی حالات سنائے جنھیں میں قلم بند کرتا گیا۔ انھوں نے تانبے کی ایک پلیٹ بھی دکھائی جس پر ان کا شجرہ لکھا ہوا تھا۔ گھر کا وہ حصہ بھی دکھایا جہاں وہ عزاداری کرتے تھے۔ وہاں محراب پر ایک سفید چادر پردے کے طور پر پڑی تھی۔

حویلی کی حالت خستہ ہو چکی تھی، دیواروں پر ہاتھ ہاتھ بھر اونچی گھاس اگی ہوئی تھی، پھر بھی وہ مرغا کھلانے پر اصرار کر رہے تھے۔ لیکن ہم لوگ کوئی معقول بہانہ کر کے ان سے رخصت ہو لیے۔ گھر آئے اور اپنے بزرگوں سے گارڈنر خاندان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ پھر برادر محترم ڈاکٹر سید محمد امین کے ساتھ بیٹھ کر نوٹس تیار کیے گئے اور منسلکات کے طور پر تانبے کی پلیٹ بھی عینی آپا کو بذریعہ پارسل ارسال کر دی گئی۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ آپ لوگوں نے تو پوری ریسرچ کر ڈالی اور مقالہ بھی لکھ کر بھیج دیا۔ آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔

ہم دونوں مطمئن ہو گئے کہ ایک کام ختم ہو گیا۔ لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہفتے بعد عینی آپا کا خط چلا آ رہا ہے۔ ہمارے نوٹس میں جو جو باتیں انھیں ناقابل اعتبار محسوس ہوتیں وہ ان پر استفسار کرتیں۔ ہم اپنے گھر کے پرانے روزنامچوں سے دیکھ کر تصدیق کرتے اور اپنی دانست میں ان کو تشفی بخش جواب لکھ دیتے۔ یہ سلسلہ کئی مہینے تک چلتا رہا۔ ایک واقعے کو پڑھ کر اور میری زبانی سن کر وہ دیر تک کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ وہ واقعہ یوں ہے۔

مغل شہزادی جب گارڈنر صاحب کے ساتھ آئیں تو ان کے ساتھ بہت سے اہلکار ہوتے تھے۔ مغل شہزادی اپنے ساتھ باز کی نسل کا ایک پرندہ ضرور لاتی تھیں جس کی آنکھوں پر نقاب چڑھا ہوتا تھا اور وہ پرندہ شہزادی کی کلائی پر بیٹھا رہتا تھا۔ میاں بیوی حضرت سید شاہ آل رسول احمدی قدس سرہٗ کو "پاپا" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ایک بار شہزادی جب صدر دروازے سے اندرونی دروازے کی طرف بڑھیں تو سر جھکنے کے سلسلے میں ان کا اپنا ہاتھ گلے میں پڑی موٹے موٹے سچے موتیوں کی مالا پر پڑ گیا۔ مالا کا دھاگا ٹوٹا تو سارے موتی گر کر زمین پر بکھر گئے۔ شہزادی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ خانقاہ کی ایک خادمہ کی نظر پڑی تو اس نے تمام موتی احتیاط سے چنے اور مٹھی میں بھر کر شہزادی کو دے آئی۔ شہزادی اس دیانت پر مسرور ہوئیں اور فرمایا کہ یہ موتی تم لوگ تقسیم کر لو۔ خادمہ نے کہا کہ ہم سب کے

Scanned with CamScanner

پاس ہیروں جڑا بہت قیمتی تاج ہے۔ ہم ان موتیوں کا کیا کریں گے۔ شہزادی نے پوچھا تاج کہاں ہے، ہمیں دکھاؤ۔ خادمہ نے عبادت و ریاضت میں مصروف دور بیٹھے سید شاہ آل رسول احمدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جنھیں آپ پاپا کہتی ہیں وہی تو ہم سب بستی والوں کے تاج ہیں۔ راتوں کو اٹھ کر جب وہ روتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے سچے موتی جھڑتے ہیں۔ شہزادی نے جب یہ سنا تو سر جھکا کر بیٹھ گئی اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شہزادی کی آنکھوں سے بھی سچے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر دامن میں جذب ہو رہے ہیں۔

ایک دن ان کا خط آیا کہ گارڈنر صاحب کے پوتے نے آپ کو یہ بتایا کہ ان کا خاندان اس علاقے میں اکبر بادشاہ کے زمانے میں آیا تھا۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے نادرست ہے۔ میرے جواب دینے سے پہلے ان کا اگلا خط آ گیا کہ گارڈنر صاحب کے پوتے غلط نہیں کہتے۔ دراصل ان کا خاندان اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں آیا تھا نہ کہ جلال الدین اکبر کے وقت میں۔ پھر اس سلسلے کی آخری کڑی کے طور پر ان کا خط آیا کہ آپ نے میرے ناول کے مواد کی تحقیق میں اتنی محنت کی۔ یہ عاجز بندی اس کا کوئی صلہ نہیں دے سکتی۔ البتہ آپ اپنے آپ کو میرے ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' میں مہمان اداکار کے روپ میں ملاحظہ کریں۔ انھوں نے یہی کیا بھی۔

علی گڑھ میں تعلیم کے آخری برس میرا انتخاب سول سروس میں ہو گیا۔ اسی زمانے میں عینی آپا کی وزیٹنگ پروفیسرشپ کا اختتام ہوا۔ شہریار صاحب نے میری عزت افزائی کی ایک صورت یہ نکالی کہ عینی آپا اور مجھے ایک ہی تقریب میں الوداعیہ دیا گیا۔ انھوں نے اپنی تحریر پڑھی ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے'' اور میں نے اپنی کہانی ''منظر'' پڑھی۔ جلسے سے نکلتے وقت بولیں، ''منظر میں انتظار حسین کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔'' وہ شروع جوانی کی آشفتہ مزاجی اور سرکشی کا دور تھا۔ میں نے پوچھا، ''اس کہانی میں تصوف، خانقاہ، گوشہ نشینی اور سلوک کا ذکر ہے اس لیے آپ ایسا کہہ رہی ہیں؟'' فرمایا، ''ہاں اس وجہ سے بھی۔'' میں نے کہا کہ خانقاہ، سلوک، گوشہ نشینی اور تصوف کے دیگر معاملات کو میں نے انتظار صاحب سے زیادہ قریب سے دیکھا ہے۔ اثر ہوگا تو میری کہانیوں کا ان پر ہوگا۔ میری اس دیہاتی منطق اور سرکشی پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر فرمایا کچھ الفاظ انتظار حسین جیسے ہیں۔ ان پر غور کیجیے گا۔ رات کو ہوسٹل میں کہانی کا مسودہ ایک بار پھر دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

Scanned with CamScanner

تقریباً دس مقامات پر میں نے الفاظ تبدیل کیے۔

عصمت آپا نے ترقی پسندی کے پرشور زمانے میں عینی آپا پر ایک مضمون لکھا۔ نام تھا ''پوم پوم ڈارلنگ۔'' عصمت آپا نے دل کھول کر جو لکھنا چاہا، لکھ دیا تھا۔ زیادہ تر بجلی عینی آپا کے ہائی سوسائٹی سے تعلق اور طرزِ تحریر پر گری تھی۔ جب عصمت آپا کا انتقال ہوا تو عینی آپا نے عصمت آپا پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا۔ اس زمانے میں کچھ لوگ اس بات سے ناراض تھے کہ عصمت آپا نے اپنی آخری رسوم بجلی کے شاک کے ذریعے خاکستر ہونے کے طریقے پر کیوں کرائیں۔ عینی آپا نے اس مضمون میں عصمت آپا کی رہن کی خلاقی کا سیر حاصل ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ عصمت آپا قبر کے عذاب اور اس سے متعلق روایت سے بہت ڈرتی تھیں اس لیے انھوں نے اپنی اول منزل کے لیے یہ راستہ چنا۔ سوادِ تحریر سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ عینی آپا دراصل عصمت آپا کی سادہ لوحی اور بھولے پن کے تناظر میں عصمت آپا کی وصیت کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ عینی آپا چاہتیں تو جو چاہے لکھ سکتی تھیں لیکن عصمت آپا پر لکھتے وقت انھوں نے انسانی ہمدردی اور دردمندی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

علی گڑھ میں امی اور عینی آپا میں خوب ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ امی کو اساتذہ خصوصاً لکھنؤ کے اساتذہ کے بہت سے اشعار یاد ہیں۔ عینی آپا کے ذہن کو بھی وہی شعر بہت بھاتے تھے جن میں قفس، صیاد، گلستاں، خزاں، رنج و غم، محرومی وغیرہ کا زیادہ ذکر ہو۔ ان کی کتابوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ امی سے دیر تک شعر سنتی رہتی تھیں۔ ایک پروفیسر ثریا حسین کے گھر امی سے شعر سن کر عینی آپا بولیں

''دیکھیے ہم ادیب وادیب تو ہیں لیکن ہمیں شعر وعر زیادہ یاد نہیں رہتے۔''

امی بولیں، ''عینی آپا۔ ہم ادیب وادیب تو ہیں نہیں لیکن ہمیں شعر وعر خوب یاد ہیں۔''

برابر کے ان جملوں پر وہ دیر تک ہنستی رہیں بلکہ عینی آپا کی زبان میں ''برابر کے ان جملوں پر وہ دیر تک ہنسا کیں۔''

اس لطیفے سے قطع نظر جب ناگزیر ہو جاتا تھا تو عینی آپا اردو اشعار کو اپنی نثر میں ایسے کھپا دیتی تھیں کہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اشعار خاص اس موقعے کے لیے کہے گئے ہیں۔ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' اور ''قید خانے میں تلاطم ...'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

ایک دن میں نو یڈا والے مکان میں پہنچا تو بہت سی کتابیں بکھیرے بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے

Scanned with CamScanner

ہی بولیں، ''کتابیں ترتیب سے رکھوانے کے لیے نکالیں تو ان میں کچھ سرکاری کاغذات جیسی چیزیں نکل آئیں۔ ذرا دیکھیے اور بتائیے کہ یہ کیا ہیں۔''

یہ کہہ کر ایک کتاب سے کچھ بھاری بھرکم کاغذات نکال کر دکھائے۔

انھیں اچھی طرح دیکھنے کے بعد میں نے انھیں بتایا، ''عینی آپا، یہ سپلا کمپنی کے شیئرز ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔ لگ بھگ ڈھائی لاکھ روپے کے۔''

کہنے لگیں، ''اوہو! ایک زمانے میں یہ غائب ہو گئے تھے، پھر میں بھول بھال گئی۔''

آخری بار میں نے ان کا چہرہ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے کاؤنسل روم میں دیکھا جہاں وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتابوں کے اجرا کے جلسے میں تشریف لائی تھیں۔ میں انھیں وہیل چیئر پر بیٹھا نہیں دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھ گیا۔ جب ان کے بولنے کا موقع آیا اور وہیل چیئر کے سہارے انھیں اسٹیج کی طرف لایا جانے لگا تو میں خاموشی سے جلسے سے باہر نکل آیا۔

تاریخ اور سماج سے متعلق ان کی یادداشت بہت وسیع اور گہری تھی۔ ان کی تحریروں میں جو حوالے ملتے ہیں وہ ہزاروں سال کی تاریخ اور ماقبل تاریخ کے ادوار سے رشتہ رکھتے ہیں۔ مشرق کی دانشورانہ روایت کے اکتساب میں ان کا جو مقام ہے وہ اردو کے کسی ادیب و شاعر کو حاصل نہیں ہوا، عزیز احمد کو بھی نہیں۔

عینی آپا کا روحانی وجدان سینکڑوں برس قدیم ثقافت کا دفاع کرتا ہے۔ ان کے فکشن میں جس ثقافت کا ذکر اور اس پر اصرار ملتا ہے وہ پوری تاریخ سے کشید شدہ مکمل ثقافت ہے۔ ہم انھیں صرف ''ہندستانیت'' میں محصور نہیں کر سکتے۔ وہ اس کرۂ ارض کی مکمل تاریخ و ثقافت کی نمائندہ تھیں۔ مکمل انسانی تاریخ کا ادراک، ادب میں نت نئی تکنیکوں کا استعمال، گہری انسانی ہمدردی اور دنیا بھر کی عورتوں کی بے بسی کو کمالِ فن کے ساتھ پیش کرنے کی ادبی قوت انھیں بلاشبہ عالمی ادب میں ایسا مقام دیتی ہے جس کے لیے انھیں کسی بوکر پرائز یا نوبل پرائز کی ضرورت نہیں تھی۔

عینی آپا کی تحریروں میں عورت کے اندر کی طاقت، بے بسی اور صبر و ضبط کو اتنی قوت، شدت اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جن ادیبوں اور شاعروں نے عورت کے باطن کی اس قوت کا مشاہدہ اور مظاہرہ اس پیمانے پر کیا ہے، ان میں عینی آپا کا قد سب

Scanned with CamScanner

سے زیادہ دراز ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے اپنی دنیا سے ان کا گہرا اور بامعنی تعلق تھا اور اس تعلق کے نتیجے میں ان کی جو انفرادیت متشکل ہوئی تھی اسے وہ بہت عزیز رکھتی تھیں۔ اجتماعی تنظیم سازی کے اس پورے دور میں انھوں نے اپنی انفرادیت اور فرد کے وقار کو باقی رکھا۔ اردو میں جاری و ساری تحریکوں اور رجحانات اور ان سے وابستہ تنظیموں سے ان کا رشتہ بس صاحب سلامت تک تھا۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ اس رویے سے انھیں بہت نقصان پہنچا۔ میں سمجھتا ہوں یہ صحیح نہیں ہے۔ عینی آپا کا زندگی گزارنے کا جو قرینہ تھا وہ تنظیموں کے نفع و زیاں سے بہت بلند تھا۔ انھوں نے اپنی انفرادیت کو آخر تک جس طرح محفوظ رکھا وہ قدرت الٰہی کا ایک ایسا کرشمہ تھا جس کا فیض تمام ادیبوں کے لیے ارزاں نہیں ہوا۔ بہت کم ادیب ہیں جنھیں یہ بادشاہی خزانہ نصیب ہوا۔

کسی کام سے بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہیں مجھے برادر عزیز سید محمد افضل نے جامعہ ملیہ سے فون پر بتایا کہ ”عینی آپا کا غالباً آخری وقت ہے۔ شعبۂ اردو کے پروفیسر وہاج الدین علوی نے مطلع کیا ہے۔ کیا آپ کل تک نہیں پہنچ پائیں گے؟“ میں نے بمبئی سے واپس ہو کر اپنے آفس سے جامعہ میں فون کیا۔ افضل کے رفیق کار نے بتایا کہ عینی آپا رخصت ہو چکی ہیں۔ تدفین بعد عصر ہے۔

جو پہلی ملاقات میں ان کا چہرہ نہیں دیکھ سکا وہ آخری ملاقات میں چہرہ کیا دیکھ سکے گا۔ جو زندگی میں انھیں جمیل چہرے پر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکا وہ ان کی میت کیا دیکھ سکے گا۔ عصر کے بعد جامعہ کے قبرستان کی جنوبی طرف والی دیوار کے دروازے کے پاس داخل ہو کر انتظار کرتا رہا اور جب دور سے دیکھا کہ اب تدفین ہو چکی ہے تب اس شہر خموشاں میں داخل ہوا۔ شمس الحق عثمانی کے پاس کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا: ”ابھی تلقین و فاتحہ نہیں ہوا ہے۔ ... کی طرف جا رہے ہیں ... رکوع آپ پڑھ دیں، آخری میں پڑھ دوں گا۔“ تعمیل کی۔ تدفین میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ سب کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ قبرستان سے نکل کر آخری شخص خالد جاوید کو رخصت کر کے پھر قبرستان میں داخل ہوا۔ ... یہ سوچ کر قبر کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ تازہ قبر کی مٹی پر پانی چھڑکا گیا تھا اور سوندھی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی جو موت کی بو سے بالکل مختلف تھی۔ میں نے انھیں آواز دی ”عینی آپا! ادھر تو کار جہاں بہت دراز ہے۔ اُدھر کے جہاں کا کیا عالم ہے؟“

آواز آئی "بھئی اُدھر کا جہاں تو ہم مختصر کر آئے۔ اب اِدھر کے جہان کی درازی کے بارے میں سوچنا ہے اور ایک ضروری بات یہ کہ ابھی ابھی دو حضرات ہم سے مکالمے کر کے گئے ہیں۔ اس دفعہ ہمارے مکالمے قطعاً مایوس کن نہیں تھے۔"

دعائیں ختم کر کے جب میں وہاں سے چلا تو جمنا کی طرف والا دروازہ بہت دور محسوس ہوا۔ اندھیرا گھر آیا تھا اور راستہ اوبڑ کھابڑ تھا۔ بیچ بیچ میں قبریں بھی تھیں جن کا ادب کرنا ضروری تھا۔ آدھا راستہ طے کر کے جب میں گورکنوں کے گھروں والے حصے کے قریب پہنچا تو دھول بھری پگڈنڈی پر مجھے بے شمار انسان نظر آئے۔ میں نے دور سے ہی اندازہ کیا کہ ان میں عورتیں زیادہ تھیں۔ اب اتنا اندھیرا ہو چکا تھا کہ صرف قریب، بہت قریب کے شخص کو ہی پہچانا جا سکتا تھا۔ میں نے دیکھا وہ سب کے سب میرے پیچھے اس مقام کی طرف اشارہ کر رہے تھے جہاں سے میں آ رہا تھا۔ میں نے ذرا نزدیک آنے پر دیکھا کہ ان میں سے کسی کا لباس ایک دوسرے سے مماثل نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ان کے لباس مروجہ فیشن سے پہلے والے زمانے کے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ تو آ رہے تھے لیکن کوئی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا تھا کہ جیسے کسی کے ہاتھ میں طشت ہے، کسی کے ہاتھ میں تھالی ہے۔ میں انھیں راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گیا۔ وہ میرے پاس سے گزرنے لگے۔ میں جن جن کو دیکھ سکا ان کے بارے میں کچھ کچھ بتا سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک صاحب صندل کی چوکی ہاتھوں میں اٹھائے، سفید براق کپڑے پہنے، کھچڑی بالوں کی لٹیں کندھے پر جھکائے افق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک سادہ نقوش اور چپٹی ناک والی فلپولڑکی نظر آئی جو منھ ہی منھ میں کوئی دعا پڑھ رہی تھی۔

ایک باریش نیلی آنکھوں والے بزرگ نے اپنے پٹکے کی گرہ باندھی اور کھولی پھر باندھی اور کھولی اور دہرایا، "میں شر کو باندھتا ہوں اور خیر کو کھولتا ہوں۔ میں جہالت کو باندھتا ہوں اور خوفِ الٰہی کو کھولتا ہوں۔ طمع کو باندھتا ہوں اور فیاضی کو کھولتا ہوں۔ میں عجز و انکساری کی درانتی سے پرہیزگاری کی فصل کاٹتا ہوں۔ میں خود آگہی میں بوڑھا ہوتا ہوں اور صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتا ہوں۔" برابر سے ایک ادھیڑ عمر عورت بغل میں جانماز اور ہاتھ میں لوٹا لیے گزری۔

نبی عیسیٰ کی امت والی ایک عورت سر سے پاؤں تک سفید لبادہ اوڑھے تھی۔ اس کا چہرہ تک نظر

Scanned with CamScanner

نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک چھوٹی سی صلیب تھی۔ اس کے ٹھیک پیچھے ایک مرد سر سے پاؤں تک لباس میں ملفوف، سر پہ ہیٹ لگائے، آنکھوں پر کالا چشمہ پہنے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قبرستان میں داخل ہوتے وقت غالباً سگریٹ بجھا دی تھی۔ بجھی ہوئی سگریٹ اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔

پھر ایک بے حد دبلا پتلا بوڑھا، گھسے اور جگہ جگہ سے چمکتے ہوئے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس، سیاہ گول ٹوپی اوڑھے، پتلی کمانی والی چھوٹے چھوٹے شیشوں کی عینک لگائے، ہاتھ میں چھڑی لیے قبروں سے بچتا ہوا، چلتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک مدقوق سی دبلی پتلی عورت تھی جس کے ہاتھ میں چکن کے کام کا اڈا تھا اور وہ کلمے کی انگلی سے چکن کے کام کی پتیوں کو گنتی ہوئی چل رہی تھی۔

اس کے پیچھے ایک لمبا تڑنگا یورپین لڑکا کینوس کا تھیلا کندھے پر لٹکائے گزر رہا تھا جس کے پاؤں میں خاک آلود پشاوری چپل تھے۔

پھر ایک پارسی نقش ونگار کی خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا اور دہل گیا۔ اس کی آنکھوں کے حلقوں میں آنکھیں نہیں تھیں اور وہ اندازے سے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے سرمئی سوٹ میں ملبوس ایک وجیہہ گیہواں رنگت، سفید مونچھوں، پرسکون چہرے اور مضبوط ڈیل ڈول والا پچپن سالہ شخص چل رہا تھا جس کے داہنے پاؤں میں ہلکا سا لنگ تھا لیکن وہ لنگ اس کی چال کے وقار میں حائل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہرے رنگ کے سلیکس اور سفید سویٹر پہنے ایک برطانوی نقش ونگار کی شاندار عورت چل رہی تھی۔ دونوں مغموم اور خاموش تھے، ان سے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا، کمر جھکا آدمی چلا آ رہا تھا جس کی گردن پر ایک لمبے چہرے والی بونی سی لڑکی بیٹھی تھی جو دھیمے سروں میں گا رہی تھی.

رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

وہ برابر اس مصرع کو دہرائے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ایک ہاتھ کان پر بھی رکھ لیتی تھی۔ اب سامنے سے جو لڑکی گزر رہی تھی اسے دیکھ کر مجھے ہول آ گیا۔ وہ سرتاپا جلی ہوئی تھی۔ غالباً آنکھیں سلامت تھیں کہ وہ راستہ ٹٹولے بغیر بہت وقار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک بہت سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی از عمر چالیس سالہ عورت چلی آ رہی تھی جس کے چہرے سے شفقت پھوٹ رہی تھی۔ میرے برابر سے گزری تو میں نے سنا وہ حضرت عیسٰی اور مادر مریم کا نام لے کر دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

پیچھے آہستہ آہستہ قدم رکھتے ایک سفید داڑھی کے بزرگ چلے آرہے تھے، ان کے ہاتھ میں مدینہ اخبار تھا اور وہ "یا بدوح یا بدوح" کا ورد کرتے چلے آرہے تھے۔ ان کے بالکل قریب ایک نوبیاہتا چل رہی تھی جس نے سستی ساٹن کا غرارہ اور ریشمی ململ کا سرخ دوپٹہ اور قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں چاندی کا طوق، ملکہ وکٹوریہ کے روپوں کی "ہمیل" اور کانوں میں چاندی کے بالے پڑے تھے۔ لانبی چوٹی میں گوٹے کا موباف ڈالے، لمبا گھونگھٹ کاڑھے، برقعے میں لپٹی چل رہی تھی۔ اس کے ٹھیک پیچھے ایک بچوں جیسی شکل والی خوش شکل لڑکی تھی جس کے ہاتھ میں چھتری تھی جو برابر اس کے ہاتھ سے پھسل رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس سے بڑی عمر کی ایک پر اعتماد عورت تھی جس کے ہاتھوں میں روغنی تصویروں کے فریم تھے۔

ان کے پیچھے جو عورت تھی اس کا چہرہ مغموم تھا اور ہاتھوں میں ایک ایسا کاغذ تھا جس میں فارسی رسم خط میں سنوچی لکھی ہوئی تھی۔ وہ سرگوشیوں میں بول رہی تھی

لیکن سکھی سن، دیکھو ساون بیت گیا، خزاں آ گئی۔ زمین اب پھولوں کی نقرئی گھاس سے اس طرح ڈھک گئی جیسے بڑھاپا آہستہ آہستہ آتا ہے۔"

سب سے پیچھے ایک ننگے پاؤں لڑکی تھی جس کی ساڑی پنڈلیوں تک تھی اور گیلے گیلے بالوں میں چھپا کے پھول اڑسے ہوئے تھے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میں ان تمام چہروں کو پہچانتا ہوں۔ کہاں دیکھا ہے یہ خیال نہیں آیا۔ اس خاموش ماتمی جلوس کا آخری فرد بھی اب دور ہو رہا تھا۔ اچانک سب سے پیچھے والی لڑکی کو میں نے پہچان لیا جس کے پاؤں ننگے تھے اور ساڑھی پنڈلیوں تک بندھی تھی۔

اس کا نام لے کے میں نے دھیمے سے آواز دی۔ وہ آواز پر رکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ کچھ لمحوں تک وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر مڑ کر آگے بڑھ کر اس قطار میں شامل ہو گئی جس کا سب سے پہلا فرد خوشبو والے مقام تک پہنچ چکا تھا۔

رنج، رات اور قریب اور دوری تنہائی اور پرانی یادوں کے خوف سے لرزتا ہوا میں شہر خموشاں کے پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔

**

Scanned with CamScanner

سید محمد اشرف

دلاورانِ نیم شب

نذیر چچا دیر تک اکرم کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

''تم اجمل صاحب کے لڑکے ہو؟''

''جی۔''

قصبے میں واپس آنے کے کئی ہفتے بعد آج اکرم نے بستی میں گھومنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس میں کچھ مصلحت تھی۔ نذیر چچا اچانک مل گئے تھے۔

''اجمل صاحب سے ہمارا تعلق جانتے ہو؟''

''خوب۔ آپ اور وہ منا چائے والے کی دکان پر بیٹھ کر گھنٹوں اخبار کی خبروں پر بحث کرتے تھے۔''

نذیر چچا سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے۔ گدی کے نیچے کمر کا اوپری حصہ بہت بے ڈول طریقے سے جھک گیا تھا اور انھیں سیدھے کھڑے ہونے میں بہت دقت ہوتی تھی۔

''میں تمھارے باپ سے بیس برس بڑا ہوں۔'' پھر کچھ سوچ کر بولے، ''مرحوم مجھ سے بیس برس چھوٹے تھے۔''

''جی، میں واقف ہوں۔ وہ آپ کو نذیر چچا کہتے تھے۔''

''نذیر چچا تو مجھے قصبے کا ہر آدمی کہتا ہے،'' یہ کہہ کر وہ افسردگی سے ہنسے۔ ''ابا کہہ کر کسی نے نہیں پکارا۔ چچا کہنے والے سیکڑوں ہیں۔''

''نذیر چچا! آپ کی شادی ہوئی نہیں یا...''

''نہیں، شادی کی نہیں۔ آؤ کہیں اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔''

نذیر چچا نے سڑک کے کنارے ایک دکان پر دو عدد چائے بنوائیں۔ مٹی کے سکوروں میں چائے لے کر وہ اکرم کو اسکول کے پیچھے والے حصے میں لے آئے جہاں ٹوٹی ہوئی ایک بنچ پڑی تھی۔ وہاں دونوں آرام سے بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

''اس وقت ہندوستان پاکستان ہو رہا تھا... یعنی جب میری شادی کی عمر تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سارے کفار ختم ہو جائیں تب اطمینان سے متاہلانہ زندگی شروع کروں۔'' ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''اس سلسلے میں آپ نے بہت کوششیں بھی تو کی تھیں۔ ابا بتاتے تھے۔''

''ہاں۔'' ان کی بوڑھی میلی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک آگئی۔ ''تمہارے باپ ہمارے بہت سے معاملات کے رازدار تھے۔''

''اس وقت کے کچھ کارنامے بتایئے۔'' اکرم کا دل ان کی باتوں میں لگ رہا تھا اور ابھی ابھی اسے یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ وہ نذیر چچا سے اپنے باپ کی رفاقت کا کچھ کچھ حق بھی ادا کر رہا ہے۔

''کفاروں کو اس بستی سے ختم کرنے کے میں نے بہت جتن کیے۔ تمہارے باپ الھڑ عمر کے تھے، انھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا، لیکن ہم اور لبھو اپنے دھن کے پکے تھے۔ میاں تو اس وقت کم عمر تھے، ہم لوگ میاں کے بزرگوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں ایسے تعویذ دیجیے یا عمل بتایئے کہ اس بستی سے کفاروں کا نام و نشان ختم ہو جائے، بنس مٹ جائے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے خالی سکورے کو پوری طاقت سے زمین پر مارا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

''میاں کے بزرگوں نے کہا، ہم تو ہمیشہ سے ان کفاروں کے ساتھ رہتے آئے ہیں، ایسا کوئی تعویذ نہیں دے سکتے۔ ہاں اپنی مدافعت کے واسطے تعویذ دے سکتے ہیں اور پڑھنے کا عمل بھی بتا سکتے ہیں۔ مجبور ہو کر ہم نے اسی پر اکتفا کیا۔ لیکن ہمارا دل نہیں مانا۔ ہم اور لبھو رات کے وقت یعنی عشا کے وقت ملنگ سائیں کے تکیے پر پہنچے۔ سائیں اپنے خلیفاؤں کے ساتھ شغل میں مصروف تھے، ہمیں بھی دعوت دی۔ ہم نے کہا کہ ہم کوئی نشہ نہیں کرتے۔ پھر انھوں نے ہمیں اپنی کٹیا میں بیٹھنے کو کہا۔ ان

سارے ملنگوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جب وہ چلم کا طویل کش لیتے تو چلم پر رکھی ہوئی چرس میں شعلہ سا بلند ہوتا۔ ایک ایک کے پاس تین تین شعلے تھے۔ جب وہ شغل کر کے ذکر میں مصروف ہوئے تو ہم اور لبھو وہیں ڈرے ڈرے بیٹھے رہے۔ سوچتے رہے کہ بیکار میں ان ملنگوں کے پاس آئے۔ تب سائیں نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا: "کیوں آئے ہو؟"

"سائیں کفاروں کے خاتمے کا تعویذ چاہیے۔"

"ملے گا، ضرور ملے گا۔ کل صبح کے بعد زوال کے وقت آؤ۔"

"ہم دونوں زوال کے وقت پہنچے تو سائیں اکیلے بیٹھے تھے اور انھوں نے اپنے بال کھول رکھے تھے جو بانسوں کے جھولوں پر پڑے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کوئی دس ہاتھ کے ہوں گے۔ سائیں نے اپنے شلوکے سے چار تہہ کیے ہوئے زعفرانی کاغذ نکالے۔

"انھیں شہر کے چاروں کونوں پر کسی درخت کی سب سے اونچی شاخ پر باندھنا ہے۔ عاملوں کے علاوہ کوئی جان نہ سکے کہ یہ کام کس کا ہے۔"

"عامل کون؟" میں نے کچھ خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"تم دونوں، اور کون!"

"ہم دونوں نے اپنے عامل ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن ایک خلش سی تھی کہ بغیر کسی محنت کے ہم عامل کیسے ہو گئے۔ لبھو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "سائیں، ہم لوگوں نے کچھ پڑھا نہ عمل کیا، ہم عامل کیسے ہو گئے؟"

"سائیں بولے: "عامل وہ ہوتا ہے جو عمل کرے۔ عمل کا مطلب کام۔ تم نے یہ کام کیا ہے کہ کفاروں کو اس بستی سے نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ تم عامل ہو گئے۔ سائیں کہتا ہے کہ تم عامل ہو گئے۔"

"یہ کہہ کر سائیں نے ایک نعرہ لگایا:

"تپی روٹی ایک ادھیلا

دھر مکن پور پہنچا دے سویا"

"یہ نعرہ لگا کر جب سائیں خاموش ہوئے تو ان کی آنکھیں رات سے زیادہ سرخ تھیں۔ ہم عامل لوگ ڈر گئے۔ سائیں نے ہمارے ڈر کو بھانپ لیا اور بولے

Scanned with CamScanner

''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان تعویذات کو راتوں رات قصبے کے چاروں کونوں پر درختوں کے سب سے اونچی شاخ پر باندھ کر آنا ہے۔ کسی کو کانوں کان۔۔۔''

''آپ نشا خاطر رہیں سائیں۔'' لبھو بولا۔ ہوشیار انسان تھا۔۔۔ ہا۔۔۔ جوانی میں ختم ہوا۔ سانحہ کا بھی تو نہیں ہوا تھا کہ تپ دق اٹھالے گئی۔'' نذیر چچا نے اپنے ساتھی الیاس عرف لبھو کی طرف رخ پھیر دیا تھا۔

''نذیر چچا۔ پھر آپ لوگوں نے وہ تعویذ باندھے؟''

''ہاں، سنتے رہو۔ دھیرج کے ساتھ سنا کرو ایسے معاملات۔'' نذیر چچا کے لہجے کی شفقت میں کچھ کچھ تلخی کا عنصر بھی تھا۔ غالباً وہ کچھ دیر اور اپنے ساتھی کو یاد کرنا چاہتے تھے۔ اکرم شرمندہ ہو گیا: ''جی چچا۔''

''ہم دونوں اسی رات عشا کے بعد۔۔۔ عشا کے بہت بعد قصبے کے چاروں کونوں پر سب سے اونچے درخت کی شاخ پر وہ تعویذ باندھ کر آئے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ ایک تو ہم دونوں کو درخت پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر یہ سب سے اونچی شاخ کا معاملہ بہت سخت تھا۔ اسٹیشن کی طرف سیدوں والے باغ کا معاملہ آسان تھا کہ وہ باغ تو ہم نے کئی سال رکھایا بھی تھا۔ شہر کی طرف چتو کے تالاب پر ہندوؤں کی چتائیں جلتی تھیں۔ لبھو نے کہا کہ ہم ان ہی لوگوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ کہیں کسی چتا سے ان میں کا کوئی بھوت نہ نکل پڑے۔

''میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کی۔ چھوٹے موٹے عملیات سے تو میں بچپن سے ہی واقف تھا۔'' یہ کہہ کر نذیر چچا نے اکرم کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ اکرم نے بھی ان کے دلخواہ تاثرات دیے۔

''بس، آیت الکرسی کا پڑھنا تھا کہ لبھو ہرن ہو گیا۔ چتاؤں سے پیر بچاتے، اب بھلا بلا وجہ جھگڑا مول لینے سے کیا فائدہ تھا، ہم لوگ آگے بڑھتے گئے۔ چتو کے تال پر سب سے اونچا درخت بیری کا تھا جس کی اونچی شاخ پر تعویذ باندھنا مشکل کام نہ تھا۔ میں نیچے کھڑا رہا۔ لبھو اوپر جا کر تعویذ باندھ آیا۔ جب وہ تعویذ باندھ کر نیچے اتر رہا تھا تو بیریا میں سے ایک تیتر پھُر سے اڑ گیا۔ لبھو بھد سے زمین پر آن گرا۔ میں نے ہنس کر اسے اٹھایا۔ میں تو جانتا تھا کہ وہ کوئی بدروح نہیں، بھورے تیتر تھے

جورات کو اسی بیریا پر بسیرا لیتے تھے۔"

"باقی دو طرف کے تعویذ؟" اکرم نے بے چینی سے پوچھا۔

"سنتے رہو۔ تم جلدی بہت کرتے ہو۔ کیا دھوپ لگ رہی ہے؟"

"نہیں نذیر چچا۔ بہت دل لگ رہا ہے آپ کی باتوں میں۔ آج آپ سے برسوں بعد تو ملاقات ہوئی ہے۔ جلدی کیسی۔"

"ہاں تو دکھن طرف کے درخت کی چوٹی پر تعویذ باندھنا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ میں نے لہو سے کہا، یہ کام تم نہ کرسکو گے، یہ کام نذیر کرے گا۔ اصل میں دکھن طرف کا باغ جج صاحب کا تھا اور جج صاحب کے باغ میں ہر موسم میں مالی رہتے تھے۔ اس کی ترکیب میں نے سوچ رکھی تھی میں افیم کی دو تین چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر لے گیا۔ باغ میں جب ہم داخل ہوئے تو مالیوں نے شور مچایا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا، خاموش، جاہل قوم! میں نذیر چچا ہوں۔ بس اتنا سن کر مالی ہمارے پاس آکر یوں کھڑے ہو گئے جیسے ہم ان سے آموں کا سودا کرنے آئے ہوں۔ بڈھے مالی نے کہا: "نذیر چچا، اتنی رات کو باغ میں کیسے آنا ہوا؟" تب، اللہ معاف فرمائے، میں نے ایک جھوٹ بولا۔ میں نے ان تینوں کو ان کی جھونپڑی میں لے جا کر کہا کہ آج کل کے حالات بہت خراب ہیں، دور دور سے فسادات کی خبریں آرہی ہیں۔ تم لوگ جنگل میں رہتے ہو، تمھارے لیے خاص حفاظت کی گولیاں بنوا کر لایا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے تینوں کو پانی کے ساتھ جلدی جلدی وہ گولیاں کھلا دیں۔ وہ بولے، یہ بہت کڑوی گولیاں ہیں جیسے افیم۔ میں نے کہا، ایسے عالم میں جب اسلام پر ادبار آیا ہے، کیا حفاظت کی گولیاں مصری ڈلی جیسی ہوں گی؟ یہ سن کر تینوں کے، خاص طور سے بڈھے کے چہرے پر ڈھیروں اطمینان آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انٹاغفیل ہو گئے۔ میں جھٹ پٹ سب سے اونچے سفیدے پر چڑھ کر سب سے اونچی شاخ پر تعویذ باندھ آیا۔ پھر ہم دونوں وہاں سے فوراً رفو چکر ہو لیے۔ اب سب سے مشکل مرحلہ تھا پچھم کی طرف کا تعویذ باندھنا۔ تم جانو پچھم طرف بھاؤ پوکھرے کا تالاب ہے۔۔۔"

بھاؤ پوکھرے کا نام سن کر اکرم کے بدن میں بھی سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

"بھاؤ پوکھرے میں۔۔۔" انھوں نے سرگوشیوں والے انداز میں کہا، حالانکہ اسکول کی شکستہ عمارت کے پیچھے اس ٹوٹی بنچ پر ہم دونوں متنفس کے علاوہ کوئی ذی روح نہیں تھا۔ "بھاؤ پوکھرے میں

Scanned with CamScanner

کھکوسٹ کی شکل میں تالاب کا پرانا بھوت تھا جو بس حاجی میاں سے ڈرتا تھا... میاں کے نانا،" انھوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"نہ پوچھو اس وقت کا کیا عالم تھا۔ میں آگے آگے اور تعویذ میرے ہاتھ میں۔ لبھو پیچھے پیچھے اور لاٹھی اس کے ہاتھ میں۔ جب ہم تالاب کے کنارے پہنچے تو وہاں کا سب سے اونچا درخت ایک پرانا شیشم تھا۔ اس شیشم کے درخت سے پہلے تالاب کے کنارے والے پرانے تجری پر کھکوسٹ زور سے چلایا۔ لبھو تو قل ہو اللہ بھی بھول گیا مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر تمھارے نذیر چچا کو اپنا عمل یاد تھا۔ میں نے درود شریف پڑھ کر آیت الکرسی شریف کا ورد کیا اور لبھو کی لاٹھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مجھے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا، بس اس کی لاٹھی اس لیے ہاتھ میں لے لی کہ کہیں لبھو خوف کے مارے لاٹھی ہی زمین پر نہ گرادے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اکرم کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے سچ کا امتحان کیا۔ وہ امتحان میں پورے اترے، کیونکہ اکرم کو معلوم تھا کہ ایسے موقعے پر آنکھوں میں تجسس کی چمک کا شائبہ تو بے شک ہونا چاہیے لیکن بے یقینی کا رنگ رتی برابر نہ ہو۔

"تب... "نذیر چچا کھکھورے جیسے دم لینا چاہتے ہیں۔" تب میں نے لاٹھی اوپر کر کے اس کھکوسٹ سے کہا کہ میں حاجی میاں ہوں اور یہ میری بندوق ہے۔ بس اتنا سن کر وہ کھکوسٹ تالاب میں ڈبکی لگا گیا۔ اب ہم شیشم کے درخت پر چڑھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ درخت کی ایک شاخ پر ایسی آواز آئی جیسے وہاں کوئی بیٹھا ہو۔ لبھو تو ڈر کے مارے اول فول بکنے لگا۔ میں نے اسے ڈانٹا۔ اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں وہم بھی بہت ہوتے ہیں۔ میں دھیرے دھیرے درخت پر چڑھ گیا اور سب سے اونچی شاخ پر جا کر دم لینے کو ٹھہرا۔ اور سب سے اونچی ایک پتلی ڈالی میں جیسے ہی تعویذ باندھا وہ ڈالی تعویذ سمیت ہوا میں اڑ گئی۔ وہ ڈالی نہیں، شیشم پر بیٹھا ایک پرانا گدھ تھا جو نیند میں تھا اور ہم اسے اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے تھے۔"

گدھ کا نام سن کر اکرم مضطرب ہوا تھا۔ اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں کیا۔

"دوسرے دن ہم صبح صبح سائیں کے تکیے پر پہنچے۔ سائیں کو پورا احوال سنایا۔ سائیں کچھ دیر چپ رہے پھر بولے، تعویذ باندھنے کی ایک شرط تھی کہ تم عاملوں کے سوا کسی کو پتا نہ چلے۔ وہ شرط پوری

Scanned with CamScanner

کہاں ہوئی؟ ہم نے کہا، سائیں، ہم دونوں عاملوں کے سوا بھلا کس کو معلوم ہوا کہ ہم نے شہر کے چاروں کونوں پر تعویذ کا حصار کیا ہے؟ سائیں نے کہا:

''احمق! چوکے تال میں دو تیتروں نے تیری کارگزاری دیکھی۔ بھاؤ پو کھرے پر بیٹھے ٹھکوسٹ نے تیرا احوال دیکھا اور شیشم کا گدھ تو سمو چا تعویذ ہی لے اڑا، اور تو کہتا ہے کہ ہم دو عاملوں کے علاوہ کس نے دیکھا! کیا تجھے معلوم نہیں وہ تیتر چتا کے بھوتوں کے بیر تھے، وہ ٹھکوسٹ انھیں کھاروں کا بھتنا ہے اور وہ بوڑھا گدھ انھیں لوگوں کا ہرکارہ ہے؟ تم لوگوں نے میری ساری ریاضت راکھ کر دی۔''

''یہ کہہ کر سائیں نے چلم کی راکھ کو زمین پر پھینک کر دوسری چلم تیار کی۔ ہم دونوں روہانسو ہو گئے تھے۔ سائیں نے ہم دونوں کے چہروں پر رات کی تکان اور ملال دیکھ کر کہا:

''پھر بھی... پھر بھی اثر ہوگا۔ نذیرے، تو دیکھ، اثر ہوگا۔ ہونا ہی ہوتا ہے۔''

''بس ہم دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ سائیں کو نذرانہ دے کر ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں آ کر انتظار کرنے لگے کہ کہاں سے خبر آتی ہے۔''

''پھر نذیر چچا۔ کیا اس دن کھار پر کوئی آفت آئی؟''

نذیر چچا نے اپنی گردن کے خم کو سیدھا کیا۔

''اے لو، ایک دو؟ برہمن پوری سے چنڈتوں کا لونڈا اچھا بھلا اپنے گھر سے نکلا، نالی پر پیر پھسلا، سڑک سے سر ٹکرایا اور وید کے پاس بھی نہیں پہنچ سکا۔ کن ٹولے میں کلوا دھوبی اپنی بھینس کو لے کر نہر کی طرف چلا۔ اب پوچھو بارش ہو رہی ہے تو بھینس کو نہر پر لے جانے کی کیا ضرورت ہے مگر تعویذ تو اندھا کر دیتا ہے نا۔ بس پلیا تک پہنچا تھا کہ بادل گڑگڑائے، بجلی گری اور بھینس سمیت کلوا وہیں فی النار والسقر۔ اسٹیشن سے ٹھیا یکے والے کو چاروں سواریاں ہندو ملیں... یہ بڑی بڑی مونچھیں۔ لوگوں نے بعد میں بہت تاویلیں کیں کہ بستی میں رشتے کے لیے لڑکی دیکھنے آ رہے تھے۔ لیکن حقیقت تو ہمیں معلوم ہے۔ وہ چاروں بری نیت سے قصبے میں آئے تھے کہ رات کو کسی مسلمان کے گھر پر دھاوا بولنا ہے۔ ہاں تو یکہ سیّدوں والے باغ سے نکلتے ہی کنکر کی سڑک پر، جہاں پتھر اینٹ نام کو نہ تھی، ایسا پھسلا کہ پورا یکہ پہلو کے بل زمین پر اور چاروں مسٹنڈوں کے اتنی چوٹیں آئیں کہ قصبے

میں ہلدی چونا کم پڑ گیا۔"

اب نذیر چچا تھکنے سے لگے تھے۔

"نذیر چچا، اس دن قصبے میں کوئی مسلمان مرا کہ نہیں؟"

"ہاں بیٹا، بدو درزی کی ماں فوت ہوئی، دق کی پرانی مریضہ تھی۔ فقیرا کنگر کا باپ اللہ کو پیارا ہوا۔ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔"

پھر نذیر چچا نے اکرم کی آنکھوں میں رنجیدہ نگاہوں سے کچھ تلاش کیا اور بولے

"قضا و قدر پر کس کو اختیار ہے۔ ان مسلمانوں کی موت اسی دن لوح محفوظ پر لکھ دی گئی تھی۔ لیکن کفار تعویذ کی برکت سے واصل۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئے اور زمین پر پڑے ٹوٹے سکوروں کو دیکھنے لگے۔

"ہم نے سائیں کے پاس جا کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ سائیں بولے۔

"بدبختو! اگر تعویذ کسی کے علم میں آئے بغیر لگاتے تو آج کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔"

"ہم نے بڑی التجا کی کہ پھر سے تعویذ مل جائیں، لیکن سائیں راضی نہیں ہوئے۔ کہنے لگے کہ عامل کا امتحان ایک بار ہوتا ہے، بس۔

"بیٹا! اس زمانے میں سیکڑوں ہندو مسلمان آپس میں کٹ مرے تھے۔ ہمارے بہت سے عزیز رشتے دار بھی کام میں آئے تھے، شہید ہوئے تھے۔ ان کے غم میں ہمیں چین نہیں آتا تھا۔ ہم نے سائیں سے کہا کہ کچھ نہ کچھ انتظام اور کرنا ہوگا، ہماری خاطر۔

"تب سائیں نے اپنے بال سمیٹے اور نعرہ لگا کر کہا۔

"تی روٹی ایک ادھیلا

دھرمکن پور پہنچا دے سویرا"

"اور کہا کہ "نذیر، اب میں ایسا انتظام کروں گا کہ تیرا دل خوش ہو جائے گا۔ بس یہ بتا کہ بڑی لان کا ایسا اسٹیشن کون سا ہے جس کے آس پاس صرف کفار رہتے ہوں؟"

"ہم اور لبھو بہت دیر تک سوچتے رہے۔ ہم لوگ تو زیادہ تر چھوٹی لان کی پسنجر گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ بڑی لان کے اسٹیشنوں کی خبر نہیں تھی۔ لیکن قربان جاؤں مولا کے کہ فوراً روشنی کا ایک

Scanned with CamScanner

جھماکا سا ہوا۔

''آگرہ میں راجا منڈی کا اسٹیشن!''

''سائیں اچھل پڑے، گلے سے لگا لیا۔ لبھو بھی ہاتھ پھیلا کر ان سے گلے ملنے کو بڑھا۔ اسے روک دیا۔ وہ نہا تا کم تھا۔ بولے،

''دو چار دن میں اخبار میں پڑھ لینا۔''

''کیا پڑھ لیں سائیں؟''

''بس تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ اب جاؤ، میرے شغل کا وقت ہو رہا ہے۔''

''ہم دونوں کچھ سمجھے کچھ نہیں سمجھے۔ لبھو تو شاید بالکل نہیں سمجھا۔ لیکن تمہارا نذیر چچا کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سب روشن تھا۔

''کیا روشن تھا نذیر چچا؟''

''سنتے رہو۔ جلدی بہت کرتے ہو۔ تمھارے والد مرحوم میں یہ عادت نہیں تھی۔''

اکرم اپنی جلد بازی پر شرمندہ ہوا۔

''بس اس دن کے بعد میں منا چائے والے کی دکان پر الجمعیۃ اخبار لے کر صبح سے شام تک پڑھتا رہتا۔ لبھو میرے کولھے سے کولھا ملائے بیٹھا میری آنکھوں کی طرف دیکھتا رہتا کہ کب میری آنکھیں چمکیں۔ اخبار میں ہر طرف کی خبر چھپتی لیکن راجا منڈی اسٹیشن کے بارے میں کچھ نہیں چھپتا۔ ہم نے ایک ہفتے تک انتظار کیا۔ پھر ایک دن سائیں کے پاس مایوس مایوس سے گئے۔

''سائیں اپنے خلفاؤں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بولے:

''مبارک ہو نذیرے، مبارک۔''

''ہم نے قریب جا کر جوش کے ساتھ کہا، ''آپ کو بھی مبارک سائیں۔ مگر ہمیں کچھ خبر نہیں لگ سکی۔''

''اب یہ خبر اخبار میں تو آنے کی نہیں۔ اخبار تو سارے کفار کے ہاتھ میں ہیں۔''

''نہیں سائیں۔ ہم تو الجمعیۃ پڑھتے ہیں۔ وہ تو خالص مسلمانوں کا اخبار ہے۔''

''بس نام بھر کو مسلمانوں کا۔ مسلمان بے چارہ دنیا جہان کی خبریں چھانتا ہے۔ محنت سے

رات رات بھر بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ بلکہ کاتب تو سارے کے سارے کاسمجھ ہیں۔ پریس میں مزدور تو سارے کے سارے اہل فارسی ہیں۔ بھلا وہ تمہارے اخبار میں کیسے چھپ پاتی جس سے تمہارا دل باغ باغ ہو جاتا۔"

"تو سائیں آپ ہی بتا دیجیے کہ معاملہ کیا ہے؟" ہم لوگ بے تاب ہو رہے تھے۔

"سائیں نے شام کے اندھیرے میں چاروں طرف خاموشی سے دیکھا اور پوچھا ہم لوگوں کے علاوہ کوئی اور تو نہیں ہے یہاں؟"

"اس سے کیا فرق پڑے گا؟" سب لوگ بولے۔ "پتہ نہیں چلتا۔ آج کل ہر طرف جاسوس لگا ہے۔ چپے چپے پر ہے۔"

سائیں نے ہم سب کو حکم دیا کہ ہم لوگ دور دور تک دیکھ کر آئیں کہ کوئی ذی روح قریب میں کھڑا ہماری بات تو نہیں سن رہا ہے۔

"ہم سب پانچوں خلیفہ اور ہمارے دوست نکل پڑے۔ نکل کیا پڑے ہوئے میں سے ہر ایک تو انجن تھا۔ ہم لوگوں نے چارپائیوں کے نیچے تھوڑا جھک کر دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ کو دیکھا۔ حد تو یہ کہ سارے کھڑے خالی بکسوں کی ڈھیریاں تک کھول کر دیکھ لیں۔ دور دور تک ہم لوگوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ پھر ہم لوگ جلدی سے سائیں کے پاس آئے اور بتایا کہ جناب ہمارے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔ تب سائیں نے ہم سب کو اس طرح حلقے میں بٹھایا کہ لوگوں کے درمیان اتنی جگہ بھی نہیں بچی کہ چوہے کا بچہ بھی نکل سکے۔ اب سائیں نے بتانا شروع کیا۔ اس کی آواز سرگوشیوں سے زیادہ نہیں تھی۔

"پچھلی جمعرات کی شام رات منڈی پر بڑی لائن کا انجن پاگل ہو گیا۔ لائن سے کود کر جانے کہاں کہاں گھستا گیا۔ چن چن کر فارم کے گھروں کو تہس نہس کر دیا۔ ایک بھی موجود آدمی زندہ نہیں بچ سکا۔"

"ہم سب نے سنتے ہی اسی جگہ زمین پر گر کر سجدۂ شکر ادا کیا۔

"تب سائیں بولے: انجن کو پاگل کرنے والا عمل میں نے اسی دن شروع کر دیا تھا جب تم مجھ سے پاس ہو رہے تھے۔"

"تب ہم سب نے اٹھ کر سائیں کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

"سائیں بولے،" سرکار بہت پریشان ہے۔ اس نے اس خبر کو گڑھ سے باہر نہیں جانے دیا۔ سرکاری اعلان ہے کہ جو شخص بھی اس واقعے کے بارے میں زبان کھولے گا، قلعے کے دروازے پر سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔"

اکرم نے دیکھا، نذیر چچا اتنا کہہ کر تھک گئے ہیں اور اب آنکھیں نیم وا کیے اسی زمانے میں پہنچ چکے ہیں۔

"بیٹا اس دن کے بعد میں جب بھی الجمعیۃ اخبار پڑھتا اور لبھو میرے پاس ہوتا تو ہم دونوں دوسروں کی نظر بچا کر مسکرانے لگتے۔ لوگوں نے ہمارے مسکرانے کا سبب جاننے کے لیے سو جتن کیے مگر ہم نے کبھی حقیقت سے پردہ نہیں اٹھایا۔"

نذیر چچا کے تیور اس وقت اک ایسے جانباز سپہ سالار کے سے تھے جو دشمنوں کے نرغے میں کھڑا ہوا اعلان کر رہا ہو کہ چاہے میری گردن اتار دو، میں اپنے چھپے ہوئے ساتھیوں کا پتا نہیں بتاؤں گا۔

"لیکن نذیر چچا اخباروں میں تو دنیا جہان کی خبریں چھپتی ہیں۔ آپ کس کس کو جھٹلائیں گے؟" اکرم نے بہت ادب سے پوچھا۔

"مثلاً؟" نذیر چچا کے لہجے میں ایک خاص طرح کا تیکھا پن تھا۔

"مثلاً... یعنی کہ..." اکرم کی سمجھ میں فوراً کوئی بات نہیں آئی۔

سورج اب بالکل ان کے سروں پر آ گیا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا۔

"مثلاً یہ کہ انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا۔"

بوڑھے اور کمزور نذیر چچا نے اپنی پوری طاقت سے قہقہہ لگایا اور اس قہقہے میں ان کی شعوری کوشش کا بہت کم دخل تھا۔

"واہ بیٹے! ہم نے سنا تھا کہ تم سائنس داں ہو گئے ہو۔ ہم تو قصبے میں تمھاری بڑی تعریفیں کرتے تھے۔ کیا تمھیں بھی اس بات پر یقین ہے کہ وہ لوگ چاند پر ہی اترے تھے؟"

اکرم ٹھٹک گیا۔

Scanned with CamScanner

''چچا، ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ لوگ چاند پر ہی اترے تھے۔''

''کس نے اپنی آنکھ سے دیکھا؟ کوئی عینی شاہد؟''

''ہاں ہاں چچا، لاکھوں انسانوں نے، میں نے خود۔''

''چاند تو آسمان پر ہے۔ بہت دور۔ تم نے اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھ لیا؟''

''چچا، میں نے اور تمام لوگوں نے ٹیلی وژن پر دیکھا۔ براہ راست اپنی آنکھوں سے بھلا انھیں چاند پر اترتے دیکھ سکتا ہے کوئی؟''

''یہی۔ بالکل یہی بات میں بھی کہتا ہوں۔ چند مشرک ممالک ساری دنیا کے ساتھ ایک مذاق کر رہے ہیں اور ہمارے پڑھے لکھے نوجوان بھی اسی مذاق کا شکار بن رہے ہیں۔

''میری بات غور سے سنو۔ تم لوگ شہروں میں رہ کر جو پڑھا لکھا تھا، اسے بھی گدھے پر لاد چکے ہو۔ پہلی بات تو یہ فرض کر لو کہ کوئی جہاز اتنی لمبی مسافت طے کر کے چاند کے پاس پہنچ بھی جائے تو اس پر اتر کیسے سکتا ہے، پھسل کر زمین پر نہیں آ رہے گا؟ دوسری بات یہ کہ جس دن یہ افواہ پھیلا دی گئی تھی کہ انسان چاند پر پہنچ گیا اس دن ہم نے ور لبھو نے خوب غور سے اوسرے کے میدان میں جا کر چاند کو دیکھا تھا۔ اگر اس وقت اس پر کوئی انسان ہوتا تو چاند میں تھوڑی بہت کپکپاہٹ تو ہوتی۔ چاند بالکل ویسا کا ویسا ہی تھا۔ تیسری بات ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں۔ تمھارے پاس ٹارچ ہوگی۔ اس کے شیشے پر اگر ایک مکھی بیٹھ جائے اور تم ٹارچ کو اندھیرے کمرے میں روشن کر کے سفید دیوار پر اس کا فوکس ڈالو تو مکھی کی جسامت جتنا بڑا دھبا دیوار پر بھی پڑے گا۔ پورا فوکس بغیر دھبے کے نہیں پڑے گا۔ اگر اس پر انسان تھا تو چاند کی چاندنی میں تو رتی برابر کا فرق نہیں آیا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ چاند تو حضور کے زمانے میں شق ہو چکا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس پر کسی طرح اتر بھی جاتا تو وہ اس دراڑ میں سے کیسے بچ کر نکل پاتا؟''

''نذیر چچا، آپ کو پتا نہیں نیل آرم اسٹرانگ نے بتایا تھا کہ چاند پر بہت بڑے بڑے گڈھے اور دراڑیں ہیں۔ یقیناً وہ شق القمر کے وقت سے ہی ہوں گی۔''

''اکرم بیٹا، یہ سب ان مشرکوں کی سوچی سمجھی سازش ہے کہ ایک آدھ بات مسلمانوں کے مطلب کی بھی کہہ دو، تا کہ وہ ان کے جھوٹ کا شکار بننے میں بے عزتی نہ محسوس کریں۔''

Scanned with CamScanner

اب اکرم لاجواب ہونے کی منزل پر آ چکا تھا۔ اس نے نذیر چچا کا چہرہ دیکھا۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی جو سرخی چھلک کر آئی تھی اس نے انھیں جوان بنا دیا تھا۔

تب اکرم کو ایک بھولی بسری بات یاد آئی۔ ''نذیر چچا، اور لوگ تو چاند سے ثبوت کے طور پر پتھر کے ٹکڑے بھی لائے تھے۔ اب آپ کیا کہیں گے؟''

''ہم وہی کہیں گے جو ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور جو اصل سچائی ہے کہ ان مشرکین نے امریکہ کے کسی دور دراز پہاڑ پر اپنا جہاز اتار دیا اور وہاں عجیب و غریب تصویریں کھینچ کھانچ کر اور وہیں کے پتھر توڑ تاڑ کر لے آئے۔''

''لیکن چچا، وہ پتھر تو بالکل الگ طرح کے ہیں۔'' اکرم نے کہا۔

''دنیا کے ہر پہاڑ کے پتھر الگ طرح کے ہیں۔ کیا تم نے ہمالیہ اور وندھیا چل کے پتھروں کا فرق نہیں دیکھا؟ ہمالیہ کے اوپری حصے کے پتھر سلیٹی رنگ کے چکنے پتھر ہوتے ہیں۔ وندھیا چل کے پتھر گہرے بھورے رنگ کے کھردرے پتھر ہوتے ہیں۔ بولو، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

کرم شپٹا گیا۔ اس نے تقریباً جھنجلاتے ہوئے کہا:

''نذیر چچا، کیسی باتیں کرتے ہیں! لاکھوں انسانوں نے ان کو چاند پر اترتے دیکھا۔ کیا سب جھوٹے ہیں؟''

''نہیں، سب مظلوم ہیں۔ ظالم کے مذاق کا شکار۔ ان سب نے یہ منظر اپنے اپنے ٹیلی وژن کے ڈبوں پر دیکھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں چچا، آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔'' اکرم کو کچھ امید سی بندھی۔ اب وہ آگے بحث کر سکتا تھا کہ ''وژن میں انسان وہی سب کچھ دیکھ سکتا ہے جس کا فوٹو کھینچ کر ریل بنائی گئی ہو۔

''ان غدار، ان یہود نے کیمروں کی مدد سے پہلے تو چاند کے فوٹو لیے۔ پھر راکٹ جہاز کا فوٹو لیا۔ پھر غباروں جیسا لباس پہنا کر دو تین فرنگیوں کے فوٹو لیے۔ پھر ایک دور دراز کے ان دیکھے پہاڑ کا فوٹو لیا۔ پھر ان سب کو قینچی سے کاٹ پیٹ کر جوڑ دیا اور ساری دنیا کو بے وقوف بنا دیا کہ ان کے آدمی عجیب و غریب لباس پہن کر، چاند گاڑی میں بیٹھ کر چاند پر اتر گئے۔ تف ہے آپ کی تعلیم پر کہ اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ پائے۔'' نذیر چچا کے چہرے پر حقارت سے بھرپور فاتحانہ جذبہ تھا۔

Scanned with CamScanner

[illegible] شروع ہوئی تھی [illegible] ان کا جواب دے رہے تھے۔ ان سے [illegible] محسوس ہو رہا تھا جیسے [illegible] کے سامنے ایک بوسے سے بھی کم حقیقت [illegible] ہے۔

جس وقت [illegible] سے [illegible] بڑے [illegible] پیچھے چلے ہوئے [illegible] چل پہاڑ کا [illegible] چھوٹا سا [illegible] کوئی قیمت نہیں ہے

❋❋

سید محمد اشرف

رنگ

باہر میدان میں مختلف رنگوں، شکلوں اور پیشوں کے بے شمار افراد موجود تھے جن کے پاس اپنی طرف متوجہ کرنے کے بہت سارے سامان تھے۔ وہ چمک دار پٹیوں والی آرائشی اشیا سروں سے بلند کیے کھڑے تھے۔ اس نے ان تمام افراد پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور درس گاہ میں داخل ہو گیا۔

تمام طالب علم کھڑے ہو گئے۔ ایسا لگا کمرے کی کھڑکیاں غائب ہو گئی ہوں۔ اس کے اشارے پر تمام طالب علم بیٹھ گئے۔ کمرے میں کھڑکیاں واپس آ گئیں۔

اس کے ہاتھ میں ایک چوکور ڈبا تھا جس کی لمبائی چوڑائی ایک بڑے بالشت سے کم نہیں تھی۔ آہستگی سے ڈبہ میز پر رکھا گیا۔ میز کے پیچھے پڑی کرسی دھیمے سے پیچھے کی گئی اور پھر بغیر آواز کیے اس کرسی پر بیٹھا گیا۔ ایک جانچتی پرکھتی طویل نگاہ طالب علموں پر ڈالی گئی۔ سب کے سب الگ الگ پوشاکوں میں تھے۔ غالباً اس درس گاہ میں وردی کا رواج نہیں تھا۔

اب اس نے طالب علموں کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں کے درمیان ایک ایسی آواز میں بولنا شروع کیا جس کے لیے اس نے لگاتار ریاض کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ابتدائی جملے غیر مانوس، مبہم اور دھیمے سروں میں تھے — شاید ہی کوئی سمجھ سکا ہو۔ لیکن یہ کیفیت لمحاتی تھی۔ اب آواز صاف، لہجہ متوازن اور الفاظ مناسب ہو چکے تھے۔

اب تمام نگاہیں اس پر مرکوز ہو چکی تھیں۔

''آج... آج میں ایک بے حد ضروری امر پر گفتگو کروں گا۔

"انسانی زندگی کو چند باتیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ ماحول، خوشبوئیں اور رنگ۔ ماحول زمانہ حال کو متاثر کرتا ہے۔ خوشبوئیں ماضی میں لے جاتی ہیں اور رنگ... اور رنگ آنے والے دنوں کا پتا دیتے ہیں۔ مستقبل! سمجھے؟"

"جی ہاں!" نعروں کی شکل میں جواب ملا۔

اب اس کے چہرے پر مزید اطمینان اور راحت تھی۔

"ماحول اور خوشبوؤں کے بارے میں پھر کسی وقت... فی الوقت رنگوں کے بارے میں بات ہوتی ہے۔"

اس نے ایک بار اچھے استاد کی طرح ایک ایک آنکھ میں جھانک کر دیکھا۔ ان آنکھوں میں بچے کچے سوال چمک رہے تھے۔ یہ بات اس نے محسوس کر لی تھی۔

"لیکن..." اس ایک لفظ سے آنکھوں کی چمک کو دھندلا کر کے انھیں معمول کے مطابق بنا دیا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر اس کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی۔

"لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ میں تمھیں بنیادی رنگوں کی شناخت کرا دوں تا کہ زندگی کے کسی مرحلے پر تم یہ شکوہ نہ کر سکو کہ تمھیں براہِ راست مشاہدے سے دور رکھا گیا۔"

اب اس نے کمرے سے ہو کر اس چوبی ڈبے کو پیش کرتے ہوئے اور اس میں ہاتھ ڈال کر کئی سے سب پیالے باہر نکالے جو مختلف رنگوں کے تھے۔

وہ پیالے اس سے پہلے بھی اسی طرح موجود تھے۔ کھڑکی سے روشنی کی کرنیں براہِ راست میز پر پڑ رہی تھیں۔

اس نے پہلی صف میں دو چار پیالے تقسیم کر دیے۔ پچھلی صف کے طالب علم چپ چاپ بیٹھے ... سوال پوچھتے ... کی طرف جھانکنے کی تیاری میں ہی تھے کہ اس نے پرجوش انداز میں تنبیہ کی۔

"سب کا وقت آئے گا۔ سب کو ان بنیادی رنگوں کی شناخت کرائی جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ ان رنگوں کے خواص بھی بتائے جائیں گے۔ اور اختصار کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ ان رنگوں کا زندگی پر کس طرح اثر پڑتا ہے۔"

پچھلی صفوں کے طالب علم پھر اپنے اپنے مقامات پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مختلف رنگوں کے وہ دائرے ایک ایک ہاتھ میں گئے۔ اس اثنا میں وہ سیدھا کھڑا طالب علموں کے چہروں کے تاثرات کو بھانپتا رہا۔ کبھی کبھی وہ کھڑکیوں کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ صرف ایک بار سرسری طور پر اس نے دروازوں کے باہر کھڑے ان تمام افراد کو واروی کے انداز میں دیکھا۔

رنگوں کے دائرے اب واپس اس کے ہاتھ میں آ چکے تھے۔ اس نے ایک ایک دائرہ اٹھایا۔

''یہ سبز رنگ ہے۔ اسے ہرا رنگ بھی کہتے ہیں۔ یہ نیلا رنگ ہے۔ یہ سرخ رنگ ہے اور یہ ہے پیلا رنگ — کیا تم ان رنگوں کو پہچانتے ہو؟''

''جی ہاں... جی ہاں...'' کوئی خاموش نہیں رہا تھا۔

''ان رنگوں کو تم اپنے ہاتھوں سے چھو کر اور آنکھوں سے دیکھ کر خوب اچھی طرح محسوس کر چکے ہو۔ اسی کو تجربہ اور مشاہدہ کہتے ہیں۔''

''جی ہاں... جی ہاں...'' سب کی آوازیں بلند تھیں اور لہجے میں جوش تھا۔

''اب ان کے خواص سنو۔ سبز رنگ نہایت پاکیزہ رنگ ہے۔ تم میں سے بیشتر اس بات سے واقف ہیں۔''

''جی ہاں... جی ہاں...''

''ہمالیہ کی ترائی کے درختوں سے لے کر میدانی علاقوں کے کھیتوں کی فصلوں تک، وسطی علاقے کے جنگلات سے لے کر جنوب کے گھنے مرطوب بنوں تک، بلکش ویپ کے درختوں سے لے کر انڈمان کے جزیروں کے گھنے جنگلات تک، آسمان کو چومتے کنچن جنگا کے قدموں میں پھیلے دارجلنگ کے چائے بگان سے لے کر بحر بنگال کے سندر بن تک ایک ہی رنگ چھایا ہوا ہے — سبز رنگ — پتوں کا رنگ، کلوروفل کا رنگ، زندگی کا رنگ، توانائی اور تازگی کا رنگ۔ سبز رنگ۔ اسی سبز رنگ کے نباتات سے فضا میں پھیلی آلودگی کا سینہ چاک ہوتا ہے اور ہوا کا ذرہ ذرہ پاک ہوتا ہے۔''

ہم ردیف جملوں کی تال پر طالب علموں کے سر عقیدت آمیز اثبات میں تیزی سے ہلنے لگے۔

''اس رنگ کو نظر بھر کے دیکھو تو آنکھوں کو ایسی فرحت کا احساس ہوتا ہے جیسے عبادت کر کے

Scanned with CamScanner

انھیں دو۔ اس رنگ کو [illegible] دیکھنے سے حافظہ مضبوط ہوتا ہے۔ اس رنگ میں ایک ایسا جوہر ہوتا ہے جو محسوس [illegible] میں تحمل پیدا کرتا ہے، وسعت عطا کرتا ہے اور پھر روح، دل اور ذہن ایک سُر میں آ جاتے ہیں اور یہ سُر میں آ کر مستقبل کی راہ کا تعین کرتے ہیں۔ اعتبار، اعتماد اور ارادے کی مضبوطی کے ساتھ۔"

سب [illegible] طالب علموں کے ثبات میں ہلتے سروں کو دیکھ کر اس نے آہستہ سے [illegible] پوچھا [illegible]

"جو کچھ میں نے بیان کیا تم سب اسے اچھی طرح سمجھ گئے؟"

"جی ہاں... جی ہاں..." کورس کی طرح آوازیں ابھریں

دروازے کے باہر کھڑے [illegible] حسین کے درمیان کوئی چھوٹا سا [illegible] حسین کو [illegible] آواز [illegible] دیتا ہے۔ وہ لوگ درگاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں [illegible] ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے والے انداز میں بیان کر رہا تھا۔

[illegible] رنگ [illegible] اور آنکھ [illegible] رنگ [illegible] حسن و جمال [illegible] رنگ [illegible] ہے۔ [illegible] بادشاہ کی آمد کی رنگت، بادشاہ کا عمل [illegible] ہیں۔"

[illegible] مختلف [illegible] میں باندھے بیٹھے والے ان جاہ و جلال [illegible] طالب علموں [illegible] اکائی۔

"بالکل بالکل!... جی ہاں جی ہاں۔"

[illegible] سوال [illegible] کی۔

[illegible] ہو چکے تھے۔

[illegible] خیالات کی آزادی سب اسی

رنگ کی دین ہیں۔ اسی لیے انقلاب کو سرخ رنگ سے شناخت کرتے ہیں۔ سنا ہوگا؟''

''جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔ '' آوازیں بہت پُرشور تھیں۔

دروازے کے باہر کھڑے افراد نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ نیلے رنگ کا دائرہ اٹھا چکا تھا۔

''یہ نیلا رنگ ہے — آسمان کا رنگ، وسیع آسمان کا رنگ۔ خاموش سمندروں کا رنگ، بلند پہاڑیوں کی پیشانی پر جمی برف کا رنگ۔ اس رنگ میں گہرائی، گیرائی ہے۔ وسعت ہے، عظمت ہے۔ یہ رنگ سوچ میں وسعت اور وسعت میں گہرائی عطا کرتا ہے۔ یہ رنگ آنکھوں کو بینائی اور ذہنوں کو دانائی عطا کرتا ہے۔

''فطرت سے بھی اس رنگ کا گہرا تعلق ہے۔ جیٹھ کے مہینے میں چھوٹی سی نیلے رنگ کی ایک چڑیا آتی ہے کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ ہاتھ آنا تو ایک طرف، دیر تک نظر بھی نہیں آتی۔ بس ایک بوند پانی سے منقار تر کر کے اُڑ جاتی ہے۔ سمندر کی طرح گہرے نیلے رنگ کی آنکھوں والی شہر دمشق کی عورتیں باوفا ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھوں کی پتلی میں بس ایک جلوہ ہوتا ہے — جلوۂ محبوب۔ ان کی بارگاہ میں باقی سب معتوب۔ یہ رنگ محبت کی گہرائی کا استعارہ ہے۔ کیا تم میری باتوں کو سمجھ رہے ہو؟''

''جی ہاں جناب۔۔۔ جی ہاں جناب۔۔۔''

''شاباش۔''

اب اس نے آخری دائرہ اٹھایا۔

''یہ پیلا رنگ ہے۔ جذبوں کا رنگ، جاگتی آنکھوں کے خوابوں کا رنگ۔ ربیع کی فصل میں نوخیز لڑکی کے قد کی اونچائی کے برابر جب سرسوں کا پودا بلند ہو جاتا ہے تو اس پر پیلے پھول آتے ہیں اور نسائی آبادیوں میں داخل ہو جاتا ہے بسنت۔ جذبوں سے ناآشنا بچیاں، عہد شباب میں داخل ہوتی ہوئی، جذبوں کی جھنکار کو اپنے تلووں سے محسوس کرتی ہوئی نوخیز لڑکیاں، بدن کے اسرار سے آشنا ہو کر بار بار بھول جانے والی جوان عورتیں، بیتی رتوں کو یاد کرنے اور یاد کر کے رنجیدہ ہونے والی ادھیڑ عمریں اور ماضی کے بے محابا جنگل کی رات میں چمکنے والی سی شے کو کھوئی کھوئی آنکھوں سے یاد

Scanned with CamScanner

کرنے والی بوڑھی عورتیں — سب کی سب پیلے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ دوران سب کا دل رکھنے کے لیے اور اپنا دل بڑھانے کے لیے مرد بھی پیلے پیلے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ بسنت آیا رے... بسنت آیا رے... لگتا ہے زمین سے آسمان تک بس ایک ہی رنگ چھایا ہوا ہے۔ پیلا رنگ۔ تخلیق کے سے کا بنیادی رنگ — پیلا رنگ۔ یا میری، تم تم نہیں سمجھ رہے؟'

"نہیں نہیں، ہم سمجھ رہے ہیں صاحب" سب جوش میں بول اٹھے۔

اچانک دروازے پر لاٹھی کی دھمک سی ہوئی۔ سب کے سب ادھر متوجہ ہوئے۔ مجمع کے ایک جتھے نے اپنا نمائندہ بھیجا تھا۔ وہ لاٹھی نہیں تھی، چمڑے کا ایک چابک تھا جس میں موٹی موٹی گانٹھیں پڑی تھیں جن کی ضرب کی آواز لاٹھی کی آواز کے مماثل ہوتی ہے۔

اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر اس فرد کے پاس جا کر کچھ کہا۔ طالب علموں کو وہ شخص نظر نہیں آیا لیکن اس کے بعد سے، مضبوط اور محنتی ہاتھوں میں چمڑے کی مصنوعات تھیں، کاریگری سے بنائے گئے نئے فیشن کے جوتے تھے۔ کپڑے رکھنے والی چمڑے کی اٹیچیاں تھیں اور دولت ان کی طرف میں چپکی اٹھانے والے چھینکے، اور اسی قسم کی اور چیزیں۔

وہ فرد ان چیزوں کو جذباتی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر جھٹکے دے رہا تھا۔

سب نے دیکھا کہ وہ درسگاہ سے نکل کر جم غفیر کی طرف جا رہا ہے۔ وہ تمام لوگ مختلف جتھوں میں تقسیم تھے لیکن سب کے ہاتھوں میں چپکی والی آرائشی چیزیں تھیں جنھیں وہ تقریباً جیسی خوشی کے انداز میں اٹھائے ہوئے تھے۔ ان آرائشی چیزوں کے علاوہ ہر جتھے کے پاس اپنے پیشے یا مصروفیت سے متعلق کچھ سامان تھا جسے وہ اشتہار کے انداز میں لیے ہوئے تھے۔ دوسرے جتھوں نے بھی پیش قدمی کی لیکن پہلے جتھے والے نے غائبانہ کہہ کر روک دیا کہ پہلے ہمارا آدمی گیا تھا۔

تھوڑی دیر تک کسی ایک جتھے سے بات کرنے کے بعد وہ واپس درسگاہ میں آیا۔ چاروں رنگوں سے ... کو ایک نظر دیکھا اور معمول کے مطابق متوازن آواز میں گویا ہوا

"ان چاروں رنگوں کے خواص کے بارے میں تمھیں اچھی طرح سمجھا چکا ہوں۔ لیکن صرف ایک بار بتانے سے سبق یاد نہیں ہوتا۔ بس ایک خاکہ سا بن جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ ایک ایک کر کے پھر مختصراً ان چاروں رنگوں کے بارے میں وہی سب کچھ بتا دیا جائے اور یہ بھی کہ ہر رنگ کا زندگی پر کیا اثر ہوتا

Scanned with CamScanner

ہے۔''

''جی ہاں، ہم تیار ہیں جناب!''

''ب میں فہرست کو الٹا کر کے یعنی سب سے پہلے پیلے رنگ کے بارے میں اپنی بات دہراؤں گا۔ دھیان سے سننا۔ بار بار نہیں بتاؤں گا۔''

''پیلا رنگ... ''اس نے پیلے رنگ کا دائرہ اٹھایا۔

''پیلا رنگ موت کا رنگ ہے۔ تم نے پرانی کلاسیکل تصاویر دیکھی ہوں گی۔ اُن میں موت کے منظر پیلے رنگ سے رنگے جاتے تھے۔ نا... ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بات کو قرینے سے سمجھو۔ یہ پیلا رنگ بے پناہ اداسی کا رنگ ہے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ساری کائنات پر یہ رنگ اداسی پینٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ خود سورج، سورج کی کرنیں، کھیتوں میں کھڑی فصل، باغوں میں استادہ درخت حتیٰ کہ شفاف پانی کی نہریں — سب کے سب اسی رنگ میں ڈوب جاتے ہیں۔ جیسا کہ تمہیں اندازہ ہو چکا ہوگا، یہ ایک منحوس رنگ ہے۔

''جہاں سوکھا پڑتا ہے وہاں کی دھرتی پانی کی آس میں پھٹ جاتی ہے اور اندر سے جھانکتی ہے پیلی پیلی بدرنگ مٹی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ رات کی رانی کے شگفتہ پھول جو رات کے وقت اپنی خوشبو کے پنکھوں پر بٹھا کر کسی دوسری دنیا میں لے جاتے ہیں، صبح ہوتے ہی مرکر، مرجھا کر پیلے پڑ جاتے ہیں۔ تم نے غور کیا ہوگا کہ انسانی بدن کی سرخ وسفید جلد میں زخم ہو جائے اور مواد پھیل جائے تو پیلے رنگ کی پیپ نکلتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ خلا باز دوسرے سیاروں سے جو مردہ بے روح مٹی لائے ہیں وہ پیلے رنگ کی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا...''

''ہم سمجھ گئے جناب... ہم سمجھ گئے جناب...''

''تو کیا میں سمجھوں کہ میں نے اب تک پیلے رنگ کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ تم سمجھ چکے ہو؟''

بہت سی آنکھوں میں اشکال تھا اور بہت سی آنکھوں میں اعتبار۔ وہ دھیرے دھیرے، مناسب الفاظ میں کچھ بتاتا رہا اور دھیرے دھیرے اشکال والی آنکھیں اعتبار والی آنکھوں کی ہم جنس ہو گئیں۔

Scanned with CamScanner

دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ وہ ماہرانہ انداز میں دروازے سے باہر گیا۔ باہر کوئی شخص تار و تار رسیوں سے پھولوں کا گچھا ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا۔ اس کا بھتیجا بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ سب بیچ بیچ میں نعرے بھی لگا رہے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں پیش کر رہے تھے۔ وہ سنجیدگی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ انھیں خاموش کیا، پھولوں کو دیوار کے پاس رکھنے کو کہا اور ان سے کہا کہ وہ سب دروازے میں داخل ہوں اور سبز رنگ کا دائرہ واضح رہے۔

”میں بالکل الٹی ترتیب سے تمھیں بتاؤں گا۔ اس سے یکسانیت پیدا ہوتی ہے اور خلاقی کی موت ہوتی ہے۔ میں وہ دوا اور کالا سبز رنگ کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ یعنی کہ مختصراً یہ سمجھو کہ سبز رنگ نجاست، اور بیماری کا مخزن ہے۔“

سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

”کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟“ اس نے تادیبی نظروں سے سب کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔“

”اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ زہر کا رنگ کیا ہوتا ہے؟ زہر کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ جب کسی سانپ کا منہ بند ہوتا ہے تو اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ زہر کا رنگ دنیا میں سب سے زیادہ سبز ہوتا ہے۔ تم یہاں ہوتے ہیں؟ کچھ میں، کچھ کیا ہوتی ہے؟ سبز سے بچوں کا خون۔ زہریلی کائی جس میں طرح طرح کے مچھر اور مکھیاں پیدا ہوتے ہیں، کس رنگ کی ہوتی ہے؟ سبز رنگ کی۔ اور کیا تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ سبز رنگ کے درخت رات میں زہر اگلتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ۔ کیا تمھارے ماں باپ نے بھی تم کو نہیں بتایا کہ رات میں درخت کے نیچے مت لیٹو؟“

”ہاں... ہاں... بتایا تھا...“ بہت سی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

”شاباش! تم نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہوگا — اور مشاہدہ بہت بڑی چیز ہے — کہ جب کوئی چیز سڑنے لگتی ہے تو وہ سبز رنگ کی ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ روٹی جیسی مفید غذا بھی۔ گوشت جب سڑتا ہے تو اس کے کنارے پہلے سبز ہو جاتے ہیں۔ یعنی اتنی مثالوں سے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ سبز رنگ دراصل زہر کا، موت کا، نجاست کا اور بدترین حالت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟“

”جی ہاں... جی ہاں...“ ان سب کا جوش واپس آ رہا تھا۔

دروازے پر اس بار وہ جتھ کھڑا تھا جس کے ہر فرد نے بگلوں جیسی سفید پوشاک پہن رکھی تھی۔ ان میں کا ایک شخص آگے بڑھا۔ وہ دروازے کی آڑ میں اس زاویے سے کھڑا تھا کہ اس کا سراپا تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے سرخ و سفید چکنے ہاتھوں میں ایک خوش رنگ تھیلی نظر آ رہی تھی جو اپنے اندر کی اشیا کے بوجھ سے کھنچی پڑ رہی تھی۔ طالب علموں نے اسے باہر جاتے اور اس تھیلی والے سے بات کرتے دیکھا۔ دونوں کبھی سرگوشی میں بات کرتے کبھی دونوں کی آوازوں کا حجم زیادہ ہو جاتا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا تاثر تھا جس میں فکرمندی سے زیادہ سوچ کا عنصر نمایاں تھا۔ طالب علموں نے اسے واپس آتے دیکھا۔ کھڑکی سے داخل ہونے والی کرنیں اب اتنی روشن نہیں رہ گئی تھیں لیکن ان میں اتنا اجالا ضرور تھا کہ میز پر رکھے رنگوں کے تمام دائرے اپنے رنگوں کے ساتھ واضح نظر آ رہے تھے۔

"درمیان میں یوں بار بار میرا جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا مجھے بھی احساس ہے۔ لیکن کار منصبی میں ایسے اوقات بھی آتے ہیں جب درسگاہ کے اندر والوں کی ضروریات کے ساتھ ساتھ درسگاہ کے باہر والوں کی حاجت بھی سمجھنا لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ کسی کا کسی سے بھی کسی بھی وقت کوئی بھی کام پڑ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی فطری بات ہے جسے نہ سمجھنے والا احمق ہی کہلائے گا۔ کیوں؟"

"بے شک! بے شک!" سب نے تائید کی۔

"ہاں تو اب مختصراً نیلے رنگ کے بارے میں آموختہ دہرا لو۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ نیلا رنگ گندگی کی نشانی ہے جس چیز میں شامل ہو جائے اسے بھی گندہ کر دیتا ہے۔ تم نے علم الحیوانات کے استاد سے ضرور پڑھا ہوگا کہ قلب سے دو طرح کی نلیاں جسم کے اندر، دور دور تک جاتی ہیں۔ ایک میں شفاف خون ہوتا ہے جو قلب سے جسم کی طرف جاتا ہے۔ دوسری میں گندہ اور کثیف خون ہوتا ہے جو جسم سے قلب کی طرف واپس آتا ہے۔ شفاف خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور گندے اور کثیف خون کا رنگ..."

"نیلا! نیلا!" سب زور سے چلائے۔

"شاباش، شاباش۔"

"تم نے علم الطبیعیات میں پڑھا ہوگا کہ نیلے رنگ کی شعاعیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی

ہیں۔"

"جی ہاں... جی ہاں..."

"اور... اور یہ تو تمہارا روز کا مشاہدہ ہو گا کہ رذیل ترین کام کرنے والوں کا لباس گہرا نیلا ہوتا ہے۔ تم نے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر صفائی کرنے والے کرم چاریوں کی وردی اکثر دیکھی ہوگی؟ نیلے رنگ کی ہی ہوتی ہے۔"

"دیکھی ہے... دیکھی ہے..." طالب علموں نے اپنی معلومات کا اظہار با آواز بلند کیا۔

"تو اس مختصر گفتگو سے ہی یہ بات اب کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی اور پھر خود تمہارے اپنے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات ہے کہ نیلا رنگ دراصل گندگی اور رذالت کی علامت ہے۔"

"بالکل! بالکل!"

یہ کہہ کر اس نے دروازے کے باہر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انتظار تھا۔ طالب علموں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں انتظار کی جو ویرانی تھی وہ اچانک چمک میں بدل گئی۔ دروازے پر ایک ساتھ بہت سی آہٹیں ہوئی تھیں۔

وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

"اپنے کسی ایک شخص کو بات کرنے دیجیے۔ باقی دروازے سے دور ہٹ جائیں۔ تعلیم میں خلل پڑتا ہے۔"

آہٹیں دور ہو گئیں۔ کیونکہ باہر بھی دھوپ کمھلانے لگی تھی اس لیے طالب علم صرف اتنا دیکھ سکے کہ باہر جتنے والا شخص ہاتھوں میں کچھ اشیا لیے کھڑا تھا لیکن ان اشیا کی شکلیں واضح نہیں تھیں۔ کمان کی صورت کی کچھ چیزیں تھیں اور ایک چھوٹا سا تازہ شکار کیا ہوا جانور جو الٹا لٹکا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ سب دیوار کے پاس ان تمام چیزوں کے پاس رکھ دیجیے اور یہاں سے دور ہو کر اپنا کام کیجیے۔ تعلیم میں بہت حرج ہوتا ہے۔"

اندر آ کر اس نے سرخ رنگ کا دائرہ اٹھایا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی اب بہت مدھم ہو چکی تھی لیکن سرخ رنگ کا دائرہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

"یہ آخری بنیادی رنگ ہے جس کے خواص کے بارے میں آپ کو ایک بار پھر وہی سمجھانا ہے

Scanned with CamScanner

جو تم نیا پہلے بھی سمجھ چکا ہوں۔ صرف دہرانے کا کام ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں اور جیسا کہ میں بتا ہی چکا ہوں کہ سرخ رنگ تباہی اور بربادی کی علامت ہے، اور یہ رنگ انسانی دشمنوں کے سلسلے میں ہمیشہ سے اضافہ کرتا آیا ہے۔"

کسی طالب علم نے احتجاج کے انداز میں ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ اس نے بہت رسانیت سے سیدھا ہاتھ اٹھا کر اس طالب علم کو خاموش کیا۔

"پہلے سبق کا آموختہ پڑھ لیا کرو۔ اچھی طرح سمجھایا ہے۔ پھر بھی کوئی پہلو تشنہ رہ جائے تو سوال ضرور کرو۔ پہلے میری بات خوب غور سے سنو۔ پھر اس بات کو اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں پرکھو، پھر کوئی سوال کرو۔ سمجھے؟

"جی ہاں... جی ہاں..."

"آپ کو تاریخ کے استاد نے بتایا ہوگا کہ دنیا کے سب سے خوبصورت شہر بغداد میں جہاں دریائے دجلہ کو باندھ کر نہر کی طرح چوڑی پاٹ کر دیا گیا تھا اور جہاں پورا شہر دو جلدوں والی کتاب کی طرح کا بنا تھا اور جہاں ہر میل پر دجلہ کو پار کرنے کے لیے ایک مضبوط اور خوش نما پل تھا اور جہاں ایسے پچاس پل تھے، ان دو حصوں کے درمیان بنے تھے اور باغات میں طرح طرح کے میوے اور شاداب پھل تھے اور بے شمار انواع و اقسام کی خوشبوؤں والے پھولوں کے پودے تھے اور اونچائی کے پودوں کے درمیان محل روش بہ روش برق کی مانند چمکتے تھے۔ اور شاہی محلات تھے جن کی برجیوں کا سونا دجلہ کے پانی کو اور جن کے صدر دروازوں کے دو بڑے آئینے بغداد کی راتوں کو روشن رکھتے تھے اور جہاں کے کتب خانے تھے جن میں رکھی کتب کی جلد بندی تک سونے کی نقرئی جماعت طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک شمار نہیں کر سکتی تھی۔ اسی بغداد میں چنگیز خان کا پوتا آیا۔ اس کے ساتھ ٹڈی دل لشکر تھے اور اس کے سپاہیوں کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور ان کی پتلی چھوٹی چھوٹی داڑھیاں کرتیں ہوئی تھیں۔ پھر مشاہدہ ہوا۔ غلط کہا، معلوم ہوا۔ اور وہ ثبت معلوم ہوا کہ دجلہ کا پانی ایک ہفتہ تک سرخ رہا۔ سرخی تباہی کی علامت۔ تباہی کا نتیجہ تباہی کا ثبوت" کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ بولو۔ جواب دو!"

"نہیں نہیں۔ آپ سچ کہتے ہیں۔"

''مستزاد! جب روزانہ مغرب میں روشنی کے مخرج و منبع آفتاب عالم تاب کا خاتمہ ہوتا ہے تو مغربی آسمان کا کیا رنگ ہوتا ہے؟ بتاؤ۔''

''سرخ، بالکل لال... '' سب چیخ پڑے۔

''سرخ رنگ کو اپنا بتا کر، لوگوں کو اپنے پیچھے لگا کر کئی خانہ جنگیاں ہوئی ہیں، کتنی ہی براہ راست جنگیں ہوئی ہیں۔ معلوم ہے؟ تاریخ کے استاد نے کچھ پڑھایا ہے؟''

''ہم جانتے ہیں... ہم جانتے ہیں... '' سب کی آوازوں میں لجاجت بھری تائید کے گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔

''سڑک پر کوئی حادثہ ہو، شور ہو اور تم اس طرف گھوم کے دیکھو تو سب سے پہلے سرخ رنگ نظر آئے گا — خون کا رنگ۔''

''بالکل ٹھیک... بالکل ٹھیک... ''

''تپ دق کی بیماری میں جب پھیپھڑے مکڑی کے جالوں کی طرح کمزور ہو جاتے ہیں اور نفس کے تار ایک دوسرے میں الجھ جاتے ہیں اور جب آخری بار مریض کو الٹی ہوتی ہے تو وہ بھی سرخ رنگ کی ہوتی ہے۔ موت کی آخری چیخ، موت کی علامت، موت کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟''

''سرخ! سرخ!'' سب کے سب بولے۔

''شاباش! ہاں تم بتاؤ۔ تم کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے۔'' اس نے اس طالب علم کی طرف اشارہ کیا جس نے کچھ دیر پہلے ہاتھ اٹھایا تھا۔

''جی نہیں، کچھ نہیں... کچھ بھی نہیں... '' وہ بھی جوش میں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب تم آج کے سبق کو دہراؤ۔ اچھی طرح دہراؤ۔ آزادی کے ساتھ دہراؤ۔ اپنے تجربے و مشاہدے کی روشنی میں نتائج اخذ کر کے دہراؤ۔ میں واپس آ کر تمہارا سبق سنوں گا۔''

وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور جاتے وقت دروازہ بند کر گیا کہ باہر کی آوازوں سے کوئی خلل نہ ہو۔

کم روشنی کی وجہ سے میز پر رکھے مختلف دائروں کا رنگ اب مدھم پڑنے لگا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر ایک روشن دن دھیرے دھیرے ایک سیاہ دھند میں غرق ہو رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

کمرے کے اندر ہلکے اندھیرے میں سرخ، سبز نیلی اور زرد آوازوں کا ایک جنگل تھا جہاں آپس میں ٹکراتی آوازوں کی ایک بے تکان گردان تھی۔

دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ڈبے میں چاروں رنگوں کے دائرے سلیقے سے رکھے، ڈبا بند کیا اور ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کیا۔

''آج کے سبق کو آپ سب نے اچھی طرح سمجھ لیا؟''

''جی ہاں جناب۔''

''میں نے کسی رنگ کے بارے میں کوئی بات جھوٹ تو نہیں کہی؟ خلافِ حقیقت تو نہیں کہی؟''

''بالکل نہیں جناب۔''

''سبق اچھی طرح یاد کر لیا ہے؟''

''بالکل جناب۔''

''کون سنا سکتا ہے؟''

سب نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

''شاباش! لیکن اتنا وقت نہیں کہ سب سے سبق سنا جائے۔آپ میں سے کوئی بھی ایک اٹھ کر آج کا سبق سنا دے۔''

وہ سب کے سب نیم روشن کمرے میں ہیولوں کی طرح بیٹھے تھے۔ان میں سے کوئی یک آہستگی سے اٹھا۔اس کے انداز میں حد درجہ خود اعتمادی تھی۔اس کے لہجے میں اطمینان اور جوش کی آمیزش تھی۔

''خوشبو، ماحول اور رنگ زندگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔رنگوں کا سب سے زیادہ اثر مستقبل کی راہ کے تعین میں کام آتا ہے۔سبز رنگ کی زردی مائل نیلاہٹ میں تخلیق کا وہ مادہ ہوتا ہے جو کھیتوں میں فصلیں اگاتا ہے اور پھلی میں ناج پیدا کرتا ہے اور بہتے ہوئے شہروں کے کنارے ٹھہری نہروں میں استادہ ٹکملی داڑھیوں والے خچروں کی آوازوں سے باغات کے شاداب پھلوں کا رنگ اڑا دیتا ہے۔جب غزالوں کی سرمگیں آنکھیں مکڑی کے جالوں میں پھنس جاتی ہیں اور نفس کے تار الجھ جاتے ہیں تو

Scanned with CamScanner

سے جاں عورتیں بادشاہوں [illegible] سے بھری آنکھوں [illegible] جام شراب اور [illegible] قدموں میں جاتی ہے
مرغابی پرندے پہاڑوں کی چوٹیوں [illegible] رات کی منقار میں ایک بوند لیتے ہیں اور اپنے بیٹے کا
سرخ گوشت جام شراب میں [illegible] دیتے ہیں اور جب وہ سیاہ دانتوں سے سفید رنگ کا زہر کے
[illegible] ٹکڑوں سے [illegible] پیدا کرتا ہے [illegible] عورتیں بدن کے اسرار [illegible]
[illegible] ایک بار پھر [illegible] محسوس کرتی ہیں۔ خوب [illegible] سے [illegible]
گرمی ہوا میں [illegible] رات کے قدموں سے لپٹی [illegible] جیسی اونچی [illegible]
کے بدن کے [illegible] حصوں سے ٹکراتی ہیں [illegible] رہتے ہیں اور [illegible]
اپنی [illegible] اور [illegible] مضبوطی سے [illegible] ہیں اور [illegible] والی [illegible] عورتیں نیلے
رنگ کے چمکدار [illegible] میں [illegible] تلاش کرنے والی بوڑھی عورتوں
[illegible] میں [illegible] ہو جاتی ہیں [illegible] وقت سب [illegible] کائنات
ایک شفاف سیاہی میں [illegible] ہوتی ہے تب [illegible] سے نکلے چمکدار تیر اس سیاہی کو قاش
قاش کر دیتے ہیں اور [illegible] ایک چابک کی طرح چمکتی ہے اور اپنے وزن
سے [illegible] جس میں [illegible] ہوتی ہے جس کا
ذائقہ [illegible] سے اٹھتی [illegible] تیز [illegible] سرخ خون کی [illegible] سے [illegible] ہوتا ہے جو
چپے چپے [illegible] خوشبو [illegible] ایک اور طرح کا نشہ پیدا کرتا ہے جس کا [illegible]
پانی کی آگ میں [illegible] اب [illegible] نہیں [illegible] انسانی
بدن کی سرخ و سفید جلد [illegible] شراب [illegible] رات کی رانی [illegible] پھولوں [illegible] صبح صادق کے وقت
تک [illegible] کی طرح [illegible] طرح کا [illegible] سمندر کی طرح [illegible] موت کی طرح کالی ہوتا
ہے [illegible] کبھی [illegible] آوازوں سے دریا کا پانی سرخ کر
دیتے ہیں کبھی [illegible] جیسے [illegible] اپنے [illegible] نسائی میں دو رنگوں کا
خوش گوار [illegible] سفید [illegible] زندگی قائم ہے اور سیاہ خون سے زندگی کی [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] رنگ کا [illegible] ایک شریف النفس
بہادر شخص سمت مغرب سے [illegible] قبیلوں پر ایسے چھا جائے گا جس طرح

سرخ رنگ کی کائی زرد رنگ کے سمندر پر اور قرمزی طوفان مشرقی پہاڑوں پر چھا جاتا ہے اور جیسے گہرے سرخ بادل سبز آسمان کو ڈھانک لیتے ہیں اور تب زرد وحشت سرخ گلاب کی طرح کھلنے لگتی ہے اور سبز، سرخی، نیلا اور پیلا ہر رنگ ایک دوسرے کی گردنوں میں باہیں حمائل کر کے زار و قطار چیخنے لگتا ہے اور انسانی آبادی کا ہر جیتا آرائشی شیشہ سروں سے بلند ہو کے چھوٹے چھوٹے قدموں کی تھاپ پر رقص کر کے سسکنے لگتا ہے۔"

کمرے میں اب تاریکی در آئی تھی اور بولنے والا خاموش ہو چکا تھا۔ سارے کے سارے خاموش بیٹھے تھے جیسے ان کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں جو ذرا سی جنبش سے اڑ جائیں گے۔

اس نے ڈبہ مضبوطی سے پکڑے پکڑے ذرا جھجک کے ساتھ لیکن آواز کے وزن و وقار کو قائم رکھتے ہوئے پوچھا

"میں نے آج رنگوں کے بارے میں جو ضروری باتیں سیدھے سادے انداز میں بیان کیں اور پھر ان کا آموختہ کرایا اور پھر آزمائش کے طور پر تم میں سے ایک طالب علم کے منہ سے سنا، کیا... کیا تم سب اس سے اتفاق کرتے ہو؟"

"بے شک... بے شک..." خاموشی ٹوٹی اور سب نے تائید میں اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔

"کیا میں مطمئن رہوں کہ تم یہ سبق اب کبھی نہیں بھولو گے؟"

"کبھی نہیں... کبھی نہیں..." ان آوازوں میں اعتماد، اطمینان اور ایک طرح کی سرخوشی کا جذبہ تھا۔

"شاباش۔ اس سبق کو پختہ یاد اور دہراؤ۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکلا۔ تمام بچے اس کی طرف بڑھے۔ اس نے ان کے نمائندوں کو بلایا۔ جب سب اس کے پاس آ کر کھڑے ہو کر اس کی طرف بے چینی سے دیکھ رہے تھے تو اس نے پیچھے مڑ کر بند دروازے کے اندر سے آتی گردانوں کو سنا، دیوار کے پاس رکھی مختلف اشیا کو دیکھا اور بہت اعتماد کے ساتھ ان نمائندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا

"اب وہ سب تمہاری خواہش کے مطابق تمہارے کام کے لیے تیار ہیں۔"

Scanned with CamScanner

نمائندوں کے چہروں پر پھیلی خوشی کی چمک دیکھ کر، تمام جتھے والے اپنے اپنے جتھے کے ساتھ آرائشی اشیا فضا میں بلند کیے، سرخوشی کے عالم میں چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اس طرح دیوانہ وار رقص میں مصروف ہوئے جیسے ان کے قدم زمین پر نہیں آنے والی تمام انسانی نسلوں کے سروں پر پڑ رہے ہوں۔

❋ ❋

نیر مسعود

صبور قبیلہ

میں اپنا شہر چھوڑ کر آوارہ گردی نہ اختیار کرتا، مگر مجھے میرے شہر نے دھوکے بہت دیے۔ پہلا دھوکا محبت کا تھا۔ میں اس کی تفصیل کیا بتاؤں۔ اس کے بعد جو دھوکے مجھے دیے گئے ان کی بھی تفصیل نہیں بتاؤں گا۔ بس آخری دھوکے کا کچھ ذکر کرتا ہوں کیونکہ اس کے بعد میں آوارہ گرد ہو گیا۔

یہ دھوکا جائداد کا تھا۔ میرے پاس زمین کا ایک ٹکڑا رہ گیا تھا جس پر میں اپنا مکان بنانا چاہتا تھا لیکن اتنا پیسہ پاس نہیں تھا اس لیے زمین پر مکان کی صرف چوحدی کھینچ کر رہ گئی تھی۔ میں خود کرائے کے تنگ سے مکان میں رہتا تھا جو میری زمین سے متصل تھا۔ مکان کے مالک منشی صاحب تھے جنھوں نے اس کا ایک کمرا اپنے لیے روک لیا تھا۔ اسی کمرے میں ان کا، بستر سے لے کر باورچی خانے تک، سب کچھ تھا۔ باقی پورا مکان میرا تھا۔ منشی صاحب کا سگا سوتیلا کوئی نہیں تھا۔ جب میں باہر چلا جاتا تو وہی مکان کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کرتے تھے اور مکان کا کرایہ بھی کم لیتے تھے۔

پڑوس میں حاجی صاحب کا بڑا مکان تھا۔ ایک بار میں دورے پر سے واپس آیا تو دیکھا حاجی صاحب کے مکان کی توسیع ہو گئی ہے اور میری زمین کی چوحدی کے اندر کئی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ حاجی صاحب نیک آدمی تھے لیکن ان کے لڑکے کچھ شورہ پشت تھے۔ میں نے لڑکوں سے احتجاج کیا تو انھوں نے زمین کی قیمت دینے کی پیشکش کی۔ لیکن مجھے اپنی پشتینی زمین سے محبت تھی اور میں خیال ہی خیال میں اس پر اپنا مکان بنا ہوا، بلکہ اس کے صحن میں اپنے لگائے ہوئے درخت بھی، دیکھتا تھا۔ میں نے ان کی پیشکش قبول نہیں کی۔ وہ زمین چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے تو اپنے بعض بے عقل جاننے

Scanned with CamScanner

وہاں سے سب پر مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ منشی صاحب نے مجھے منع کیا تھا۔ کچھ دن تک مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں، پھر مجھے پتا چلا کہ عدالتی کارروائیاں اور وکیلوں کو اہلکاروں کا کاروبار میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں بھی سست، دور رہتا تھا اس لیے پانچ برس بعد مقدمہ میری طرف سے خارج ہو گیا۔

حاجی صاحب نے مقدمہ جیتنے کے بعد خود مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے آتے ہی طنزیہ گفتگو شروع کر دی۔ کہنے لگے

"تو آپ نے دیکھ لیا، نواب صاحب..."

میں نے ان کی بات کاٹی

"میں نواب نہیں ہوں۔"

میرا نوابوں کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں ایک معمولی خاندان کا معمولی آدمی تھا۔ میں نے پھر کہا

"اور یاد رہے، میں نواب اور رئیس نہیں ہوں۔"

"جی ہاں معلوم ہے،" انھوں نے کہا، "آپ کی زمین ہمیں پسند تھی۔ ہم نے اسے آپ سے خریدنا چاہا تھا۔ پیسے بھی اچھے دے رہے تھے لیکن آپ کا دماغ آسمان پر تھا۔ آپ نے ہم پر مقدمہ کر دیا۔ اب مقدمہ ہار کر آپ زمین پر آ گئے نا؟"

"نہ میں پہلے جب آپ کی بات نہ مانی تو دماغ آسمان پر پہنچا تھا، نہ میں زمین سے اوپر اٹھا تھا،" میں نے کہا، "مجھے اپنی زمین سے محبت ہے۔ میں اسے بیچنا نہیں چاہتا تھا۔"

"اور آپ نے اسے نہیں بیچا، لیکن وہ ہماری ہو گئی۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ چاہے لڑتے رہیں، لیکن اس سے پہلے آپ کو ہم سے ایک اور مقدمہ ہارنا ہو گا۔"

وہ دل دکھانے والی باتیں تھیں۔ میں نے ان کا جواب دینا چاہا لیکن منشی صاحب ساتھ تھے۔ انھوں نے آنکھ سے مجھے اشارہ کیا اور میں خاموش رہا۔ انھوں نے خود بھی کئی بار بولنا چاہا لیکن ہر بار چپ رہ گئے۔ حاجی صاحب کے جانے کے بعد انھوں نے کہا

"ان لوگوں سے مت الجھیے۔ ابھی ان کا دماغ گرم ہے۔ کچھ دن صبر کیجیے۔"

میں نے ان کی بات مان لی لیکن گھر سے نکلتے اور باہر سے آتے وقت میری نظر اپنی زمین پر ضرور پڑتی تھی، تو حاجی صاحب کے لڑکے اور ان کی گفتگو یاد آ جاتی تھی۔

حاجی صاحب، جیسا میں نے بتایا، نیک آدمی تھے۔ انھوں نے ایک دن مجھے بلایا۔ وہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے جس کے تمباکو کی خوشبو کمرے کے باہر ہی سے مجھے محسوس ہونے لگی تھی۔ انھوں نے پہلے چائے پلوائی، پھر حقہ میرے سامنے کر دیا۔ حقے کے تمباکو کی خوشبو مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے حاجی صاحب کو آداب کر کے مہنال ہاتھ میں لے لی، پھر کچھ دیر بعد اسے منھ سے لگائے بغیر حاجی صاحب کے سامنے حقہ رکھ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دے کر بولے

"تم بڑوں کے سامنے تمباکو نہیں پیتے؟ ایک ہمارے لڑکے ہیں۔ باپ کے سامنے انجن کی طرح دھواں منھ سے نکالتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں سگریٹ کے بغیر ہماری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں۔ بیٹے، وہ ہمارے کہے میں نہیں رہ گئے ہیں۔ تمھارا مکان جس طرح... جس طرح تمھاری زمین انھوں نے جھوٹے گواہوں کی مدد سے ہتھیالی، مجھے پسند نہیں آیا۔"

پھر انھوں نے اپنے پاس سے زمین کی قیمت مجھے دے دی اور کہا

"بیٹے، یہ رکھ لو۔ اس زمین سے تم کو جو محبت تھی اس کی تو قیمت نہیں دی جا سکتی لیکن... اگر کہو تو کہیں اور زمین خرید دیں۔"

میں دوسری زمین لے کر کیا کرتا۔ مکان بنوا نہیں سکتا تھا۔ اور اگر بنوا بھی لیتا تو اپنے اجداد والی زمین کی بات کہاں آ سکتی تھی۔ اپنا چھوٹا سا کرائے کا مکان میرے لیے کافی تھا، اس لیے میں نے حاجی صاحب سے تو کہہ دیا۔

"سوچ کر بتاؤں گا۔"

لیکن دل ہی دل میں سوچ چکا تھا۔ حاجی صاحب کو سلام کر کے آنے لگا تو انھوں نے کہا۔

"پیسوں کے بارے میں ہمارے لڑکوں کو کچھ نہ بتانا۔ زمین خریدنا ہو تو ہم سے کہنا۔ اتنے پیسوں میں تمھاری زمین سے اچھی زمین دلوا دیں گے۔"

وہ اپنے لڑکوں سے شاید ڈرتے تھے، لیکن میں سمجھتا ہوں لڑکے بھی بہت برے نہیں تھے۔ حاجی صاحب سے میری ملاقات کے دو ڈھائی مہینے بعد وہ پھر میرے یہاں آئے اور بہت معقول انداز میں بتایا کہ میری زمین ان کے مکان کی توسیع میں خلل پیدا کر رہی تھی اور انھیں پتا تھا کہ میں اپنی زمین فروخت نہیں کروں گا اس لیے مجبوراً انھوں نے زور زبردستی سے کام لیا۔ میں نے سوچا، "زور

زبردستی اور وہ بھی مجبور ہو کر۔" لیکن میں خاموش رہا۔ انھوں نے کہا

"جب تم نے مقدمہ دائر کر دیا تو ہم نے ضد میں آ کر زمین پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا جسے عدالت نے مان لیا۔ ورنہ ہمارا بالکل ارادہ نہیں تھا کہ تمھاری زمین مفت میں ہتھیا لیں۔"

میں نے ان کی باتیں بے دلی سے سنیں، اور جب انھوں نے مجھ کو اچھی خاصی رقم زمین کی قیمت میں دی تو میں نے اسی بے دلی سے لے لی۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ زمین کی قیمت مجھے حاجی صاحب دے چکے ہیں۔ لڑکوں کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی۔ میری زمین میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی جس کی مجھے ان سے شکایت تھی، اور اس شکایت کو زمین کی قیمت دور نہیں کر سکتی تھی۔

باپ بیٹوں کے دیے ہوئے روپے میں نے منشی صاحب کے پاس رکھوا دیے اور خود اپنا شہر چھوڑ کر آوارہ گردی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں شہر کے بیوپاریوں کا تیار مال دوسرے شہروں میں پہنچایا کرتا تھا اور اس کے لیے مجھے دورے بہت کرنا ہوتے تھے لیکن ان مسافرتوں میں میرا آنا جانا میرے اختیار میں نہیں ہوتا تھا، اس لیے اس کو آوارہ گردی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اب میں نے اصلی آوارہ گردی شروع کی۔

یہ آوارہ گردیاں بھی زیادہ تر ریل گاڑیوں سے ہوتی تھیں۔ میں ٹرینوں کے ڈبوں میں فلمی رسالے، چٹکلوں کے مجموعے اور گھٹیا ناول فروخت کرتا تھا۔ یہ کام مجھے پسند نہیں تھا لیکن میں صبر کے ساتھ اپنا کام کرتا تھا اور گاہکوں کو اپنے مال کی طرف متوجہ کرنے کے لیے واہیات حرکتیں کرتا تھا۔ کبھی کسی مجموعے کے ورق پلٹتا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگتا، کبھی کسی رسالے کی کوئی فلمی خبر پڑھ کر سناتا اور اس پر حیرت ظاہر کرتا، کبھی کسی ناول کا ادھورا پلاٹ بیان کرتا تھا۔ مجھے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی لیکن میں بڑے مزے لے لے کر ہر بات بیان کرتا جس طرح گاڑی پر کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والوں کو اپنا مال مزے دار لگتا تو بھی وہ اس کی تعریف کرتے تھے۔

اسی طرح میں نے پانچ چھ برس گزار دیے اور اپنے ملک کا بڑا حصہ گھوم کر دیکھ لیا لیکن میرا ملک بہت بڑا تھا۔ اب بھی اس کے بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں میرا گزر نہیں ہوا تھا۔

ایک بار میں جس ٹرین کا انتظار کر رہا تھا، وہ انجن کی کسی خرابی کی وجہ سے کئی گھنٹے تک نہیں آئی تو

Scanned with CamScanner

میں بغیر دیکھے بھالے ایک اور ٹرین میں سوار ہو گیا اور ٹرین چل پڑی۔ رات ہو چکی تھی۔ میں جس ڈبے میں داخل ہوا اس میں بہت کم مسافر تھے اور وہ بھی قریب قریب سب سو رہے تھے۔ صرف ایک شخص جاگ رہا تھا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے اگلے اسٹیشن پر اترنا ہے۔ اس نے مجھ کو غور سے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ اپنے لباس سے وہ خوشحال نظر آتا تھا۔ اس نے بار بار مجھ کو دیکھا، جیسے مجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہو، لیکن میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اس لیے کہ میں بہت تھک گیا تھا اور رات زیادہ آ گئی تھی۔

دیر کے بعد ٹرین کی رفتار دھیمی ہونا شروع ہوئی اور مجھ کو اس کے پٹریاں بدلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ مسافر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دروازہ کھولا اور پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"تم نہیں اترو گے؟"

اس کی آواز بہت گہری اور بلند تھی۔ مجھے پسند آئی۔

"نہیں،" میں نے کہا، "مجھے یہاں نہیں اترنا ہے۔"

"اس کے بعد کئی گھنٹے تک جنگل کا راستہ ہے،" وہ بولا، رکا، پھر بولا، "آگے جنگل ہی جنگل ہے۔"

میرا جی چاہا اس سے پوچھوں کہ یہ کون سی ٹرین ہے اور ہم کس خطے میں سفر کر رہے ہیں۔ مگر مجھے یہ اعتراف کرتے جھجک سی معلوم ہوئی کہ میں اس علاقے سے واقف نہیں ہوں۔

یہ ایک اجاڑ سا اسٹیشن تھا لیکن اس کا پلیٹ فارم بہت لمبا تھا۔ اس کی پکی زمین کے بیچ بیچ میں مٹی کے تھالے چھوڑ دیے گئے تھے جن میں کچن، جھکائن اور گل مہر کے درخت لگے ہوئے تھے۔ پانی کا ایک نل تھا۔ قلی کوئی نہیں تھا، روشنی کم تھی۔ میں اتنا ہی دیکھ سکا تھا کہ ٹرین روانہ ہو گئی۔ وہ اتر گیا اور مجھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے دیکھا، ٹرین کے مختلف ڈبوں سے کئی مسافر اترے۔

"یہ مجھے بار بار دیکھ کیوں رہا تھا؟" میں نے سوچا۔ پھر اسے بھول گیا۔ ٹرین قریب ایک گھنٹے تک تیز رفتار سے چلتی رہی، پھر اچانک اس کی آواز غائب ہو گئی اور رفتار دھیمی ہونے لگی۔ آخر وہ رک گئی۔ کئی مسافر جاگ اٹھے۔ کسی نے باہر کسی سے، غالباً گارڈ سے پوچھا

"کیوں بھائی صاحب، یہ گاڑی یہاں کیوں رکی ہے؟"

Scanned with CamScanner

"انجن میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کب تک ٹھیک ہوگا؟"

"پتا نہیں،" جواب ملا، "دیکھا جا رہا ہے۔"

"آج میری قسمت میں خراب انجن لکھے ہوئے ہیں،" میں نے سوچا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ خود بھی نیچے اتر آیا۔ خاصی لمبی ٹرین تھی اور جب میں اس کے سرے پر پہنچا تو پتا چلا میں انجن کے مخالف سمت چلا آیا ہوں۔ پھر بھی میں تھوڑا اور آگے بڑھا۔ پھر پلٹا تو میرے پیر کسی جھاڑی میں الجھ گئے، بلکہ جھاڑی میرے پیروں میں الجھ گئی۔ عجب جھاڑی تھی جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اس کی پتلی لمبی لمبی شاخیں سروں پر مڑی ہوئی تھیں اور میرے بدن پر لپٹ گئی تھیں۔ میں ایک حصے کو چھڑاتا تو اس کا دوسرا حصہ بدن کے کسی اور حصے، زیادہ تر ٹانگوں یا ہاتھوں میں لپٹ جاتا تھا۔ میں نے دریائی گھاس سوار کے بارے میں سنا تھا کہ پانی کے اندر اندر بڑھتی ہے اور آدمی کے بدن پر لپٹ جاتی ہے، بلکہ بچپن میں ایک بار میں خود بھی سوار میں پھنستے پھنستے بچا تھا۔ میرے تیراکی کے استاد بتاتے تھے کہ ایسے موقعے پر بدن کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا جائے تو سوار اپنے آپ الگ ہو جاتی ہے، ورنہ اگر بدن کو جھٹکے دے دے کر سوار سے نکلنے کی کوشش کی جائے تو وہ بدن کو اور جکڑ لیتی ہے۔ نتیجے میں کبھی کبھی آدمی ڈوب کر مر جاتا ہے۔

لیکن یہ دریا نہیں تھا، جنگل تھا، اور یہ سوار نہیں، کوئی جنگلی جھاڑی تھی جو مجھے چھوڑ نہیں رہی تھی۔ دیر کے بعد میں نے سوار والی تدبیر آزمائی اور آخر جھاڑی نے آہستہ آہستہ مجھے چھوڑ دیا۔ اور اب مجھے اپنے آس پاس کا ہوش آیا۔ انجن نے روانگی کی سیٹی ضرور بجائی ہوگی لیکن میں اس وقت شاید جھاڑی میں الجھا ہوا تھا۔ بہت دور پر جاتی ہوئی ٹرین کا آخری ڈبا میری نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ میں شاید تھوڑی دور تک اس کے پیچھے دوڑا بھی لیکن یہ حماقت تھی۔ اب اس کی روشنیاں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ صرف پٹڑی پر اس کے پہیوں کی ہلکی سی جھنک باقی تھی، پھر وہ بھی غائب ہو گئی۔ بس کسی جھینگر کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے آواز کی سمت کا اندازہ نہیں ہوا لیکن وہ غالباً میرے بائیں ہاتھ پر جنگل سے آ رہی تھی۔ جنگل پٹڑی کے دونوں طرف تھا اور اب مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آواز میرے داہنے ہاتھ سے آ رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

میرا دماغ سن ہو رہا تھا، پھر بھی مجھے کئی خیال آئے۔ پہلا خیال یہ تھا کہ میں ایک بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ دوسرا خیال اس مسافر کا آیا جو پچھلے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔ میں نے سوچا مجھے بھی اس کے ساتھ اتر جانا چاہیے تھا۔ پھر خیال آیا کہ میں اس کے ساتھ کیوں اترتا۔ ٹرین جنگلوں کے راستے پر جارہی تھی۔ ٹرین میں اس کے ڈبے میں محفوظ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے چل کر انجن خراب ہوگا اور مجھ پر وحشت کا دورہ پڑے گا اور میں گاڑی سے اتر کر بے تحاشا نکلوں گا۔ میں نے سوچا اب یہی صورت رہ گئی ہے کہ جدھر سے آرہا ہوں پٹری کے سہارے ادھر ہی چلوں۔ گاڑی تیز رفتار سے ایک گھنٹے تک چل کر رکی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پچھلے اسٹیشن تک پہنچنے میں بہت دیر لگے گی، لیکن اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ اتنا فاصلہ پیدل طے کروں۔ اور میں چل پڑا۔

میں پٹری سے متصل صاف راستے پر اور کبھی پٹری کے اوپر چل رہا تھا۔ لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ سردی بہت سخت پڑ رہی ہے۔ اندھیرا گھپ تھا۔ چاندنی غالباً آخری تاریخیں تھیں۔ آسمان پر بادل تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے چاندنی برائے نام سی روشنی جھلک جاتی تھی، اور کبھی ہلکی سی بارش ہو جاتی تھی۔ پٹری کے دونوں طرف جنگل کے گھنے درختوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ ان کے نیچے ٹھنڈک اور بارش سے کچھ پناہ ملے گی، میں جنگل میں اتر گیا اور اپنے خیال میں پٹری کے متوازی چلنے لگا۔ یہ ایک رات میں میری دوسری حماقت تھی۔ اس کا احساس ہوتے ہی میں نے جنگل سے نکل کر پٹری پر واپس آنا چاہا۔ لیکن اب پٹری کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ہر طرف جنگل ہی جنگل تھا۔

بارش کچھ اور تیز ہوئی۔ میرا بدن کپکپانے لگا۔ بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے وہی اختیار کی اور گھنے درختوں کے نیچے نیچے تیز قدموں سے چلنا شروع کیا۔ اس سے بدن میں کچھ گرمی آئی تو جنگل مجھے ڈرانے لگا۔ جنگلی درندے، زہریلے کیڑے، حتیٰ کہ بھوت پریت بھی میرے تصور میں زندہ ہونے لگے۔ لیکن جنگل خاموش تھا۔ اس خاموشی میں میرا احساسِ تنہائی اور شاید سب سے زیادہ بڑا۔ چاندنی کی ہر جھلک کے ساتھ مجھے اپنے آس پاس سفید چادریں سی بچھی ہوئی دکھائی دیتیں۔ یہ جنگل کے نشیب تھے جن میں بھرا ہوا بارش کا پانی کسی کسی رخ سے جھلک جاتا تھا۔ میں ان سے ہٹ کر زمین ٹٹول ٹٹول کر بڑھنے لگا۔ اس میں میری رفتار دھیمی ہوئی اور سردی نے مجھے کاٹنا شروع کر دیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ میرے بائیں طرف جنگل تھوڑا کھلا ہوا ہے، اور ادھر کچھ دور

گذر رہے ہیں۔

وہ ڈاکو تھے یا بھوت پریت؟ لیکن اس وقت اس سنسان جنگل میں مجھے بہت غنیمت معلوم ہوے۔ میں ان کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے ان کو آواز دینا چاہی لیکن اُسی وقت میں پانی سے بھرے ہوے ایک گڈھے میں جا پڑا، کیونکہ ان لوگوں کی وجہ سے میں اپنے پیروں کے نیچے کی زمین سے غافل ہو گیا تھا۔ گڈھا گہرا نہیں تھا، پھر بھی میں گھٹنوں سے اوپر تک بھیگ گیا۔ میرے منھ سے ایک چیخ نکلی جو ان لوگوں نے سن لی۔ انھوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور دو تین آدمی میرے قریب آ گئے۔

"کون؟ کون ہے؟" ایک نے پوچھا۔

سردی سے میرے دانت بج رہے تھے۔ میں صرف اتنا کہہ سکا

"ہم ہیں۔"

"ہم کون؟"

"مسافر ہیں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"معلوم نہیں۔ ہم گاڑی سے نیچے اترے تھے۔ اس کا انجن خراب ہو گیا تھا۔ ہم نیچے ہی تھے کہ گاڑی..."

"مگر تم جنگل میں کیا کر رہے ہو؟ ادھر کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اس گہری اور بلند آواز کو میں نے پہچان لیا اور تعجب ہے کہ اس نے بھی میری آواز کو پہچان لیا۔

"تم ہو؟" اس نے کہا، "میرے ساتھ کیوں نہیں اترے؟ تم ہم میں سے ہو؟"

"ہم کون؟" میں نے بھی پوچھا۔

"ملاقات میں آئے ہو؟" کسی اور نے پوچھا۔

"کیسی ملاقات؟"

گہری آواز والا میرے بالکل پاس آ گیا۔

"اوہو، تم تو بھیگے ہوے ہو" اس نے کہا۔

"ہاں، پانی کا گڈھا..."

Scanned with CamScanner

جب میری آواز بند ہوگئی اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ ان لوگوں نے آپس میں جلدی جلدی کچھ باتیں کیں۔ پھر دو تین آدمیوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور ہم جنگل کے کھلے ہوئے راستے پر آگے بڑھے۔ میں سردی سے کانپتا ہوا ان کے سہارے چلتا رہا، یہاں تک کہ ہم جنگل کے ایسے حصے میں پہنچ گئے جہاں دور دور تک چھوٹے خیمے لگے ہوئے تھے۔ روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے وہاں بہت سے آدمی نظر آئے۔ لیکن میرا ذہن دھندلا ہو رہا تھا، اس لیے میں ان کو ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ مجھے ایک خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ خیمے کیا تھے، بانسوں کے سہارے چادریں ڈال دی گئی تھیں جن سے چھولداریاں سی بن گئی تھیں۔ دو آدمی میری چھولداری میں آئے۔ میرا گیلا لباس اتار کر ایک بڑی چادر اڑھا دی گئی۔ آدمیوں نے ہاتھوں سے میرے بدن کو رگڑنا شروع کیا۔ یہ مجھے اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مجھے نہیں معلوم کس وقت میرے نیچے بستر بچھایا گیا اور کب مجھے ایک بھاری کمبل اڑھایا گیا۔ میں گہری نیند سو گیا۔ بیچ میں ذرا دیر کو میری آنکھ کھلی تو چھولداری کے باہر الاؤ روشن تھا اور اس کی گرمی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

اب صبح ہو رہی تھی۔ بستر سے اٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن چھولداری کے باہر جنگل کا کچھ کھلا ہوا حصہ مجھے دکھائی دے رہا تھا اور اس حصے میں مستقل لوگ آ رہے تھے۔ میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ عام شہری معلوم ہو رہے تھے لیکن کچھ کچھ دیر بعد ایسے لوگ بھی آ رہے تھے جن کا تعلق قبائل یا کسی برادری سے ہو سکتا تھا۔ ان کے لباسوں پر دور کے سفر کی گرد تھی اور ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ سب لوگوں کو کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ کھانوں کی رنگارنگی دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ شاید سب لوگ اپنا اپنا کھانا ساتھ لائے ہیں۔ مجھ کو یہ بھی خیال آیا کہ میں نے کب سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ لیکن بھوک مجھے بالکل نہیں تھی، شاید میرے سوتے میں ان لوگوں نے مجھے دودھ وغیرہ پلا دیا تھا۔

کھانا جلد ہی کھا لیا گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ جنگل کے کسی دوسرے حصے میں چلے گئے۔ ان کی بہت دھیمی دھیمی آوازیں میں سن سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہی گہری آواز والا آدمی میری چھولداری میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے تو کچھ کھانے کو کہا۔ میں نے انکار کیا تو میری طبیعت کو پوچھا۔ میں نے بتا دیا کہ اب قریب قریب ٹھیک ہوں، اور پوچھا

Scanned with CamScanner

"باہر مجمع کیسا ہے؟"

"ہماری ملاقات کا دن ہے۔"

ملاقات کا لفظ میں نے دوسری بار سنا تھا اور اس بار بھی وہیں سوال کیا۔

"کیسی ملاقات؟"

"ہم سال میں ایک بار ملتے ہیں۔"

میں نے اس بار پھر اپنا ایک سوال دہرایا:

"ہم کون؟"

"ہم صبور قبیلے والے ہیں۔"

"صبور قبیلہ؟" میں نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا، "میں ملک کے اکثر قبیلوں سے واقف ہوں لیکن صبور قبیلے کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"یہ کوئی باقاعدہ قبیلہ نہیں ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو صبر کرتے ہیں۔"

"کس بات پر صبر؟"

"جن باتوں پر دوسرے لوگ صبر نہیں کر پاتے۔"

ہماری گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ باہر سے کسی نے بہت نرم لہجے میں کہا

"ابھی ملاقات شروع نہیں ہوئی ہے۔ تم وہاں جاؤ۔ باقی میں دیکھتا ہوں۔"

میرا ساتھی اٹھ کھڑا ہوا اور ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ یہ بوڑھا مگر مضبوط بدن کا آدمی تھا۔ میرے ساتھی نے مجھے بتایا:

"اس ملاقات کا انتظام یہی کر رہے ہیں۔"

میں نے اٹھ کر سلام کیا اور بوڑھے نے سر کے اشارے سے جواب دے کر آہستہ سے مسکرایا۔ اس کے چہرے پر بڑی بزرگانہ شان تھی۔ مجھے اس کی موجودگی میں لیٹے رہنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پھر لٹا دیا اور آہستہ سے

"ابھی تم ٹھیک نہیں ہوئے ہو،" پھر پوچھا، "تم یہاں کیسے آ گئے؟"

میں نے مختصر لفظوں میں اپنا حال بتا دیا اور آخر میں کہا

''مجھے صبور قبیلے کے بارے میں بتایئے۔''

''بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے سن کر ہم میں شامل ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے یہاں ان کے نام لکھ لیتے ہیں۔'' میں نے اس سے کئی سوال کیے اور کئی باتیں اس نے خود بتائیں۔ مجھے کچھ باتیں ٹوٹی ٹوٹی یاد رہ گئیں، جیسے:

''قبیلے میں داخلے کی شرط کیا ہے؟''

''کچھ نہیں، صرف صبر۔''

''قبیلے میں کس مذہب کے لوگ ہیں؟''

''ہر مذہب کا آدمی ہے۔''

''اس کا علاقہ کون سا ہے؟''

''ملک کے ہر حصے میں یہ قبیلہ موجود ہے، ہر حصے کا انتظام وہیں کے لوگ کرتے ہیں۔''

''انتظام کیسا؟''

''بس کچھ کچھ دن بعد ملاقات۔''

''کیسی ملاقات؟'' میں نے پھر اپنا ایک سوال دہرایا۔

''جیسی سب ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ہم مل کر بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کا حال سنتے سناتے ہیں۔''

''لوگ قبیلہ چھوڑ بھی دیتے ہیں؟''

''ہر ایک کو اختیار ہے۔ جس سے صبر نہیں ہوتا وہ خود ہی الگ ہو جاتا ہے۔''

''آپ کی مخالفت بھی ہوتی ہے؟''

''زیادہ نہیں۔ کبھی کبھی یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ہم اندر اندر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے بھی لوگ قبیلے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہماری کوئی خفیہ جماعت نہیں ہے۔ یہاں ہر چیز کھلی ہوئی ہے۔''

میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر بولا:

''پھر بھی، معلوم نہیں کیوں، مجھے صبور قبیلے سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔''

اس نے بڑی اداسی کے ساتھ کہا

''بہت لوگوں کو صبر کرنے والوں سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کو ہم کیا کریں؟''
پھر وہ اٹھ کر چلا گیا اور مجھے پھر نیند آ گئی۔

معلوم نہیں کتنی دیر یا کتنے دن بعد میری آنکھ کھلی۔ اب جنگل خالی تھا۔ صرف میری چھولداری باقی تھی۔ مجھے میرے کپڑے پہنائے جا چکے تھے۔ تین آدمی غالباً میرے جاگنے ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ میرے اٹھنے کے بعد انھوں نے میری چھولداری بھی تہہ کر دی۔ میں ان کے ساتھ جنگل کے کھلے ہوئے حصے کی طرف سے باہر آ گیا۔ وہ تینوں کسی قبائلی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں نہیں سمجھ سکا لیکن وہ آپس ہی میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر اٹک اٹک کر میری اپنی زبان میں مجھ سے پوچھا کہ تم کس گاڑی پر جا رہے تھے۔ میں اس کا جواب نہیں دے سکا۔ ہم آگے بڑھتے گئے، یہاں تک کہ شاہراہ پر نکل آئے۔ انھوں نے شاہراہ کے متوازی ریل کی پٹری مجھے دکھائی اور بتایا کہ ہماری پشت پر کون سا اسٹیشن ہے اور آگے کون سا۔ دونوں میرے مانوس اسٹیشن تھے۔ وہ تینوں مجھ سے گلے مل کر جنگل کی طرف واپس چلے گئے اور میں اگلے اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔

جنگل سے نکل کر شہری اسٹیشن پر آنا بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ ریل گاڑیوں پر سفر کرنا میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے اپنے مکان کے ایک درجے سے دوسرے درجے میں جانا۔ اسٹیشن پہنچ کر میں سامنے پڑنے والی پہلی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اور جب مجھے پتا چلا کہ یہ گاڑی بہت لمبا سفر کرے گی اور اس کے راستے میں میرا اپنا شہر بھی پڑے گا تو مجھے ویسی ہی خوشی محسوس ہوئی جیسی کسی مسافر کو اپنے گھر لوٹتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ اور میں نے اسی وقت واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

وطن کے اسٹیشن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن اتنے دن میں شہر بہت بدل گیا تھا، یہاں تک کہ مجھے گھر پہنچنے میں دشواری ہوئی، لیکن بہرحال پہنچ گیا۔ دیکھا کہ صرف منشی صاحب اور ان کا مکان جیسا تھا ویسا ہی ہے، باقی بہت انقلاب ہو گئے ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق مجھ سے تھا۔

منشی صاحب نے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور پہلی خبر یہ سنائی کہ حاجی صاحب اور ان کا پورا خاندان اپنی جائداد فروخت کر کے کسی غیر ملک میں جا بسا ہے۔ دوسری خبر یہ کہ حاجی صاحب کے لڑکوں نے میری زمین اور اس پر بنے ہوئے کمرے وغیرہ مجھے لوٹا دیے ہیں۔ منشی صاحب نے زمین

کے کاغذات وغیرہ میرے حوالے کر دیے جو میں نے انھیں کے پاس رکھوا دیے۔ روپے جو حاجی صاحب اور ان کے بیٹوں نے مجھے دیے تھے، ان کا منشی صاحب نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن وہ بھروسے کے آدمی تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے کچھ اور کاغذات دیے۔ میری ساری رقم انھوں نے کہیں لگا دی تھی اور اب اگلے مہینے وہ رقم دوگنی ہو کر مجھے ملنا تھی۔ وہ کاغذات بھی میں نے انھیں کے پاس رہنے دیے۔ اتنی مدت کی آوارہ گردی اور گاڑیوں کے اندر کتاب فروشی سے میرے پاس بھی اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی جو جنگل میں اترتے وقت بھی اور وہاں سے باہر آتے وقت بھی میرے پاس موجود تھی۔ میں نے وہ رقم بھی منشی صاحب کے حوالے کر دی اور کہا:

''کاغذات ابھی اپنے پاس رکھیے۔ میں دورے پر سے واپس ہوں گا تو دیکھا جائے گا۔ آپ نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔''

''میاں احسان کیسا؟'' انھوں نے کہا: ''آپ کو آپ کے صبر کا پھل ملا ہے۔''

اس وقت مجھ کو صبور قبیلے کا خیال آیا۔ مجھے قبیلے کی ملاقات یاد آئی۔ اس میں شریک ہونے والوں کی ہیئتیں یاد آئیں۔ جنگل میں اپنا قیام یاد آیا۔ سب سے زیادہ اس بزرگ کی اداسی یاد آئی۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال آیا کہ میں نے حاجی صاحب سے بھی اور ان کے بیٹوں سے بھی الگ الگ زمین کی خاصی قیمت وصول کی ہے جو منشی صاحب کی بدولت دوگنی ہو گئی ہے اور میری زمین تعمیرات کے ساتھ مجھے واپس مل گئی ہے۔

منشی صاحب کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کا آخری جملہ مجھے یاد رہ گیا:

''اب آپ دوروں پر مت جائیے اور اپنا مکان بنوائیے۔''

میں اپنا مکان بنوانے میں لگ گیا۔ بیچ بیچ میں کئی بار مجھے صبور قبیلے کا سرسری سا خیال آیا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں نے واپسی کے راستے میں فیصلہ کیا تھا کہ میں بھی قبیلے میں شامل ہو جاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد مکان کی تعمیر کا سلسلہ طول پکڑتا گیا اور میں اس میں ایسا الجھا کہ صبور قبیلے کو بھول بھال گیا۔

❋❋

حسن منظر

غیرت

گھر واپس لائے جانے پر قدرت اللہ کو مطلق تعجب نہیں ہوا۔ سب کچھ ویسا تھا جیسا اس کے خیال میں تھا۔ گھر ایک قدرتی نالے کے ڈھال پر تھا۔ گھر میں ایک نئی چھوٹی بچی تھی جو ضرورت کے بس چند لفظ بول سکتی تھی۔ لڑکا گھر میں نہیں تھا کیونکہ صبح کے دس بجے تھے۔ بڑی لڑکی چولھا پھونکنے سے اٹھ کر اسے سلام کرنے آئی تھی اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ بیوی ادھیا گئی تھی اور بدرنگے کپڑے پہنے تھے۔

اس کے جیل سے لوٹ آنے کی خوشی سوائے چہروں کے کسی چیز سے ہویدا نہیں تھی۔

مکان اس کا تھا لیکن وہاں نہیں تھا جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ پہلا گھر اس نے ایک پکی آبادی میں کچھ خود بنایا تھا کچھ ایک مستری سے بنوایا تھا۔ اس میں ایک بلب کی بجلی بھی تھی اور گھر کے باہر کمیونٹی ٹیپ تھا۔ لوگ وہاں بیس بائیس سال سے رہ رہے تھے اور بیس بائیس ہی سال سے سنتے آرہے تھے، بلدیہ یہ زمین بیچ چکی ہے اور لوگوں کو بغیر کسی معاوضے کے اپنے گھر چھوڑ کر کہیں جانا ہوگا۔ اس علاقے میں گلیاں تھیں، دکانیں تھیں، بجلی کے کھمبے تھے اور لوگوں کے پتے تھے۔

نیا گھر ایسی جگہ پر تھا جہاں ایک دو کے سوا سب گھر ٹین اور پھونس کے تھے۔ پانی دور سے لانا پڑتا تھا۔ نیچے جو نالہ بہہ رہا تھا، عورتیں اس میں برتن اور کپڑے دھوتی تھیں اور جب گرمی زیادہ ہو تو بچے اس میں نہاتے بھی تھے۔ یہ اچھی بات تھی، نالے کے صاف اور گندے ملے جلے پانی کے چھڑکاؤ سے، جب اسے رکی ہوئی بالٹیوں میں اوپر لوگوں کو لے جایا جا رہا ہو، اس کے دونوں کنارے سرسبز

Scanned with CamScanner

تھے۔ خود پتھروں پر، جو جا بجا پانی میں ابھرے ڈوبے نظر آتے تھے، کائی جم گئی تھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے اُگ آئی تھی اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ اس پانی میں سے جو بو آتی تھی جب بچے اس سے نہا کر آتے تھے، وہی بو ان کے جسم سے آتی تھی۔ نالے کے دونوں کناروں پر درخت بھی تھے۔ لیکن یہاں نہ دکانیں تھیں، نہ کمیونٹی ٹیپ، نہ گھروں کے پتے۔

قدرت اللہ جانتا تھا اس کے حوالات، عدالت اور جیل کے سفر نے گھر کا دیوالہ نکال دیا تھا۔ پہلے بکری بکی تھی —— یہ بات بیوی نے تھانے میں بتائی تھی جہاں قدرت اللہ بند تھا اور بیوی اس کی ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ اس وقت اس کا چھٹا مہینہ تھا۔

بعد میں جیل کے سفر میں جب یہ بات پکی ہو گئی تھی کہ اس نے جرم کیا تھا، ایک ملاقات پر بیوی نے بتایا کہ گھر بیچنا پڑے گا' وہ جسے تم نے پناہ دی تھی کہ تمھارے وطن کا رہنے والا ہے، جب کام کرنے لگے گا تو اپنا گھر بنالے گا، زور ڈال رہا ہے کہ اس تیس گز کے ٹکڑے کو خریدنے کے پیسے اس نے دیے تھے، اس لیے ہم گھر خالی کریں، وہ اسے بیچے گا۔

قدرت اللہ کو اپنی گھر والی پسند تھی۔ خوبصورت تھی، صفائی ستھرائی والی عورت تھی، نماز روزے کی پابند تھی، لیکن اس کی یہ بھاجی مارنے کی عادت اسے پسند نہیں تھی۔ اب بھلا یہ بھی کوئی موقع تھا یا جگہ کہ وہ اسے یاد دلاتی جسے تم نے گھر میں جگہ دی تھی...

خود قدرت اللہ پڑھا لکھا آدمی نہ سہی، اپنے دستخط کرنے والا گورنمنٹ ملازم تھا، انگوٹھے کا نشان سرکاری کاغذوں پر نہیں لگاتا تھا۔ اس کی نماز پہلے قل، سجدہ، رکوع اور التحیات وغیرہ تک محدود تھی لیکن تھا وہ نماز روزے کا پابند اور جن دنوں اس نے مکان کے لیے تیس گز کا پلاٹ ایک آدمی سے خریدا تھا، پہلی بار اکیس روپے زکوٰۃ کے بھی دیے تھے جسے سوچ کر اسے ہمیشہ طمانیتِ قلب محسوس ہوتی تھی۔

بیوی کی دو چار بار جیل کی آمد نے اسے وقفے وقفے سے مکان کے کوڑیوں کے مول بکنے، نیا گھر نالے کی اونچان پر بنانے، دوسری بچی کے پیدا ہونے اور بڑی کے پردے میں بیٹھنے، زندگی کی ان تمام منزلوں سے اسے بروقت آگاہ رکھا۔

بڑی لڑکی کے پردے میں بٹھائے جانے کا مطلب تھا، گھر کے خرچے میں اور تنگی —— وہ ماں

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ان گھروں میں کام کرنے جاتی تھی جو پچھلے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ نثار اور پھونس کے گھر میں جا کر وہ اپنی چھوٹی بہن کو سنبھالنے لگی۔

پھر وہ وقت آیا ماں بھی کام پر جانے کے لائق نہیں رہی اور بیٹا گھر سنبھالنے لگا جو مقررہ تاریخ پر پہلے ماں کے ساتھ باپ سے ملنے آتا تھا، پھر اکیلا آنے لگا؛ اور جب آتا تھا، کچھ نہ کچھ باپ کے لیے لے کر آتا تھا— حلوہ، گلگلے یا جو کچھ بھی بڑی بہن اس دن بنا پائے، کچھ نہ ہو سکے تو گھر کی روٹی، چٹنی اور کھچڑی ہی سہی۔

قدرت اللہ نے ان چند سالوں میں نعمت اللہ کو بڑے ہوتے دیکھا تھا جب وہ ماں کے ساتھ آتا تھا لیکن جس دن سے اس کی ماں نے بتایا تھا، ''فکر مت کرو، یہ دن بھی گزر جائیں گے، تمھاری طرح تمھارا بیٹا بھی حق حلال کی روزی گھر میں لانے والا ہے، صبح سے گیا تیسرے پہر گھر آتا ہے، بھوکا پیاسا، ہاتھ منھ گندے، کپڑے چیکٹ اور دن کی کمائی لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ ایک پیسہ اپنے پر خرچ نہیں کرتا ہے،'' قدرت اللہ نے خوش ہو کر پوچھا تھا، ''کیا کرتا ہے؟''

''کچرا— کچرے کا کاروبار۔''

قدرت اللہ ہنس پڑا۔ کچرے کا کاروبار۔ اس نے وہ لڑکے لڑکیاں دیکھے تھے جو دن بھر کچرا چنتے تھے۔ اس کچرے میں صرف شیشیاں، ٹین کے ڈبے، کاغذ، چیتھڑے ہی نہیں ہوتے تھے، دھار دار ٹین کے ٹکڑے بھی ہوتے تھے، نکیلے، کھال کو چاقو کی طرح کاٹ دینے والے شیشے کے ٹکڑے، سوئیاں لگی ہوئی سرنجیں اور کبھی کبھی اس سب کے نیچے چھپے ہوئے کنکھجورے اور بچھو بھی... کاروبار ان کا ہوتا ہے جنھیں یہ مزے کی چیزیں پہنچائی جاتی ہیں، ان کا نہیں جنھیں دن بھر کی محنت کا صلہ بس چار پیٹوں کے بھرنے کو رزق ملتا ہے۔

پھر بھی قدرت اللہ خوش ہوا۔ اس نے زندگی میں نہ کبھی جعل سازی کی تھی، نہ جس دفتر میں وہ کام کرتا تھا، وہاں آنے والوں سے اندر پرچی پہنچانے کا کچھ لیا تھا۔ اس دن اسے نعمت اللہ اپنی عمر سے بڑا لگا، جس کے اوپر کے ہونٹ پر رواں نکل آیا تھا— لیکن وہ اسے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔ اس کے ہاتھ چوڑے اور مضبوط تھے اور اس کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے پر اسے ناخنوں میں سیاہ میل تو نظر آیا لیکن کہیں بھی کوئی بڑا کٹ نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

اگلی ملاقات پر بیٹے نے خوش ہو کر بتایا، ''جن لوگوں نے تمہیں پھنسوایا تھا، صاحب، اس کا سیکریٹری، امپورٹ ایکسپورٹ والا اس کا دوست اور وکیل تھوڑے دن میں یہیں تمہارے ساتھ ہوں گے۔ سب خود پھنس گئے۔''

قدرت اللہ دم بخود تھا۔

''یہ بھی کھل گیا دستخط تمہارے نہیں تھے۔''

اس شام جیل سپرنٹنڈنٹ نے بھی اسے یہ خوشخبری سنائی، ''تمہارا کیس پھر کھلے گا۔''

گھر لائے جانے پر سوائے اس کے کہ اس میں اتنی تبدیلی آ گئی تھی کہ ٹانگوں سے معذور ہو جانے کی بنا پر نماز بیٹھے بیٹھے پڑھتا تھا اور اس کے لیے شاید پچھلی نوکری پر جانا ممکن نہیں ہو گا، خود اسے کوئی چیز گھر میں نئی یا انجانی نہیں لگی۔ ٹاٹ کی جانماز بھی نظر آ رہی تھی، چھپر کے بانس سے لٹکتا ہوا قرآن شریف بھی۔ اس کے جزدان میں سے جھانکتی ہوئی تسبیح، مونجھ کی کنگھا کنگھی اڑسنے کی چٹیا بھی وہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا آئینے کے پاس۔ بیوی کا چہرہ خوشی سے کھلا تو جا رہا تھا کہ شوہر تین سال بعد یا آخر گھر آ گیا لیکن اس پر شرمندگی نہیں تھی کہ وہ جیل کاٹ کر آیا ہے۔ نہ ہی کسی قسم کی خجلت قدرت اللہ کے چہرے پر تھی۔ جیل جانے سے پہلے اسے اپنے کردار کی پاکیزگی کا احساس نہیں تھا۔ وہاں سے لوٹ آنے پر وہ اس پر مفتخر نہ سہی، اس سے آگاہ ضرور تھا۔

پچھلی جگہ نئی جگہ سے اتنی دور نہیں تھی۔ یہاں سے بھی ملنے والے آئے، وہاں سے بھی۔ وہ لڑکا بھی آیا جو قدرت اللہ کی بیوی کا رشتے دار تھا اور ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ اس نے زیادہ توجہ قدرت اللہ کے ٹخنوں کو دی جن پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ حادثے کی پوری کہانی سنی ایکس رے دیکھے اور مطمئن ہو کر بولا، ''خالو، زیادہ تو نہیں کہہ سکتا ہوں مگر میرا خیال ہے آپ چلنے پھرنے کے لائق ہو جائیں گے۔''

آنے والوں کا سلسلہ دو تین دن لگا رہا۔ سب آئے لیکن اس کا ہم وطن نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ آنے والوں کی گنتی کم ہو گئی اور قدرت اللہ کو سونے کے لیے زیادہ وقت ملنے لگا۔ بیوی ابھی اتنی ٹھیک نہیں ہوئی تھی کہ جن دو گھروں میں کھانا پکانے صبح شام جاتی تھی، وہاں ایک وقت بھی جا سکے، یا دو میں سے ایک گھر ہی سہی۔ بڑی بیٹی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ نعمت اللہ صبح کی چائے پی کر کھاد کی نائلان کی بوری

کندھے پر ڈالتا تھا اور قسمت کا لکھا؛ منہ سے نکل جاتا تھا۔

لینے لینے قدرت اللہ کے کاموں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ چھوٹی بچی کو باہر جانے سے روکے کیونکہ اس کی کوشش ہوتی تھی ڈھال پر جا نے بڑھے اور پانی میں جا کر اور بچوں کے ساتھ چھپا چھپ کرے۔ لیکن یہ اتنا محفوظ کھیل نہیں تھا کہ ہر عمر والے اس میں شریک ہوں۔ پانی میں کہیں کہیں چھپے ہوئے گڑھے تھے اور وہ کئی بچوں کی جان لے چکے تھے۔

تیسرا پہر تھا کہ رشتے داروں میں سے ایک پہلی بار قدرت اللہ سے ملنے آیا۔ اس کی باتوں میں جو ہمدردی تھی وہ قدرت اللہ کو اچھی نہیں لگی۔ اگر اتنے ہی ہمدرد تھے تو اس وقت کیوں نہیں بولے تھے جب پچھلے علاقے میں اس کی بیوی کو گھر سے بے گھر کیا جا رہا تھا اور بے گھر کرنے والا، جسے قدرت اللہ نے اپنے گھر میں بسایا تھا، اس ہمدرد کا قریبی رشتے دار تھا۔ پھر نہ بھی اس وقت دکھائی دیے تھے جب وہ حوالات میں تھا اور بیوی اس کی ضمانت کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی، ایک ایک کی منتیں کرتی تھی، نہ کسی پیشی والے دن عدالت میں آئے۔ آج اچانک یہ کیوں ہمدردی ابھر آئی۔

جب وہ سب بھاوج کی صحت کا حال، تینوں بچوں کی عمریں اور آگے کیا پروگرام ہے، پوچھ چکا تو اس نے پوچھا: "نعمت اللہ کہاں ہے؟"

قدرت اللہ کی بیوی نے چڑ کر کہا: "تمھیں نہیں معلوم؟"

اس نے کہا: "مجھے اپنی ہی فکروں سے چھٹکارا نہیں۔"

قدرت اللہ نے کہا: "کام پر گیا ہے۔"

"کہیں ملازم ہے؟"

"نہیں، نوکری اسے کون دلواتا، مزدوری کرتا ہے۔"

"کیسی مزدوری؟" ہمدرد کا چہرہ بتاتا تھا اس کے دماغ میں وہ سوال نہیں ہے جو اس نے پوچھا تھا۔

قدرت اللہ نے سانس بھر کر کہا: "پڑھنے کے دن ہیں، کپڑا بیچنے جاتا ہے۔"

"اچھا!" اس نے مصنوعی تعجب سے کہا: "کچھ ماں کے لاتا بھی ہے یا نہیں؟" پھر جو بات اس نے پوچھی، تو بات کی اسے سن کر قدرت اللہ اور اس کی بیوی پر جیسے بم گرا ہو۔ بڑی بچی کے ہنڈیا بھجے

Scanned with CamScanner

ہوئے ہاتھ بھی رک گئے۔ چھوٹی البتہ اپنا گانا گاتی رہی۔

قدرت اللہ کی بیوی نے غصے سے کہا، ''جو ایسا کہتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔ ایسوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

ہمدرد مہمان پانی کا گلاس ہاتھ سے رکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، ''خود کو بھی جھوٹا کہہ لوں!'' اور باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد جھونپڑی میں اگر کوئی سنتا تو آس پاس کی جھگیوں میں کی جانے والی ایک ایک بات سن سکتا تھا۔

قدرت اللہ کی بیوی اس کے گھر آنے کے وقت تھوڑا بہت روئی تھی، مگر اس وقت پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ قدرت اللہ خاموش بیٹھا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا اس کی غیر حاضری میں گھر میں کیا کیا ہوا تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم تھا گھر کی بہت سی چیزیں بک گئی تھیں، پہلے بڑی بیٹی پردے میں بیٹھی، اس کے ساتھ ہی بیٹے کا اسکول چھوٹا، پھر چھوٹی پیدا ہوئی، اب سال سے کچھ ہی کم سے بیوی بھی گھر میں بند ہو کر رہ گئی تھی اور بیٹے نے گھر سنبھال لیا تھا۔

بہت دیر بعد اس کے سکتے کو بیوی نے توڑا: ''اب مجھے تعجب ہو رہا ہے پہلے نعمت اللہ گھر آتے ہی نہ ٹھیک سے ہاتھ دھوتا تھا، نہ منھ، روٹی کی ڈلیا کھکوڑنے لگتا تھا۔ اب پندرہ بیس دن سے وہ بات نہیں رہی ہے۔''

''یا بات نہیں رہی ہے،'' قدرت اللہ نے مردہ آواز میں پوچھا۔

''منھ پر رونق لیے لوٹتا ہے۔ بن پوچھے تو کھانے کے لیے ہاں کر دیتا ہے،'' بیوی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''سچ کہتی ہے تجھے ایسا لگا؟''

عورت نے سر اوپر نیچے ہلایا اور بولی، ''گھر ہوتا پھر بھی خالی پیٹ ہے۔ جو بن سامنے رکھ دیتی ہے، کھا لیتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد نعمت اللہ تھکا ہارا گھر لوٹا۔ اس کے ہاتھ صاف تھے نہ چہرہ۔ اس نے آج کے سوئے کی یافت ماں کو تھمائی اور جوتے اتارنے کو تھا جو اس نے اسی کام کے لیے فٹ پاتھ پر بکنے

والے جوتوں میں سے دیکھ کر خریدے تھے، ایسے جن میں سے کوئی کیل اندر گھس کر پیر کو زخمی کر سکے نہ کوئی ٹوٹا ہوا دھار دار شیشہ، کہ قدرت اللہ نے اسے پاس آنے کو کہا اور جیسے ہی وہ پاس آیا، گریبان سے پکڑ کر پوچھا: "سچ بتا کہاں سے آرہا ہے؟"

"سیٹھ کو مال دے کر۔"

اور بغیر صفائی کا موقع دیے اس کے منھ اور سر پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

نعمت اللہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، یہ سب کس پاداش میں ہے۔ اس نے فریاد کی نظروں سے ماں کو دیکھا: یا انھیں کیا ہو گیا ہے؟

جب ماں بیٹے کو باپ کے وحشیانہ ستم سے چھڑا رہی تھی، قدرت اللہ نے ہانپتے ہوئے کہا: "کچرا بیچنے کو جاتا ہے یا خیرات کی روٹی کھانے کو؟"

نعمت اللہ نے پوچھا: "کون کہتا ہے؟"

"میں نے کبھی زکوٰۃ نہیں لی، روزوں کا کفارہ نہیں لیا اور تو اس لائن میں بیٹھ کر روٹی کھاتا ہے جو حاجی اکبر کے ہوٹل کے باہر لگتی ہے۔ پھر بیٹھے بیٹھے خودسی ـــ"

٭٭

''اکادمی بازیافت'' کی کتابیں ''سٹی پریس'' میں دستیاب ہیں

خواب، ہوا اور خوشبو
(نظمیں)
جمیل الرحمٰن
قیمت:300روپے

بجھے رنگوں کی رونق
(شاعری)
آصف رضا
قیمت:250روپے

دو مصور
(آرٹ اور سوانح)
شفیع عقیل
قیمت:400روپے

چار جدید مصور
(آرٹ اور سوانح)
شفیع عقیل
قیمت:600روپے

تصویر اور مصور
(آرٹ)
شفیع عقیل
قیمت:600روپے

مصوری اور مصور
(آرٹ)
شفیع عقیل
قیمت:600روپے

کتابِ رفتہ
(غزلیں)
زراست رضوی
قیمت:200روپے

سمندر راستہ دے گا
(شاعری)
نسیم سید
قیمت 300روپے

آکسیجن
(افسانے)
نجم الحسن رضوی
قیمت:200روپے

آپ بیتی پاپ بیتی
(خود نوشت سوانح)
ساقی فاروقی
قیمت:300روپے

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں صدیق عالم کی چند کہانیوں پر مشتمل ایک انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کہانیاں ان کے دو مجموعے "لیمپ جلانے والے" سے منتخب کی گئی ہیں جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ صدیق عالم مغربی بنگال کے [illegible] میں پیدا ہوئے اور 1984 سے کلکتے کے باشندے ہیں۔ اس شہر کی زندگی کے خدوخال ان کی کہانیوں میں واضح طور پر ابھرتے ہیں۔ ان کا ناول "چارنک کی کشتی" جسے انھوں نے بڑی عظم کی ہیئت میں لکھا، کلکتہ شہر کی کہانی کو چند کرداروں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ صدیق عالم کی کہانیوں کے موضوعات [illegible] شہر اور [illegible] میں رہنے والے عام لوگوں کی زندگیوں کے دکھ ہی ہیں، لیکن ان کی کہانیوں کو ان کی ہیئت کے ایک ترقی یافتہ اور منفرد احساس کی وجہ سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ صدیق عالم کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "آخری چھاؤں" تھا۔ ان کی کہانیاں ہندوستان کے اردو جریدوں "شب خون"، "سوغات" وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن پاکستان کے اردو پڑھنے والے ان سے مناسب طور پر واقف نہیں۔ صدیق عالم کی کہانیوں کا یہ انتخاب اسی کمی کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے۔

Scanned with CamScanner

صدیق عالم

ڈھاک بن

جھرنا ہیمبرم کی آنکھوں میں سیلن بہت آسانی سے اترتی تھی۔ اتنی آسانی سے کہ صبح نیند سے جاگ کر دونوں پپوٹوں کو الگ کرنے کے لیے اسے انگلیوں کا اچھا خاصا زور لگانا پڑتا۔ آج تو اس کی داہنی آنکھ آدھی کھل پائی تھی اور اسی حالت میں وہ ادھر اُدھر گھوم رہی تھی، صبح کے کام کاج کر رہی تھی، سوّر کی ناند صاف کر رہی تھی۔ اور اس کی داہنی آنکھ میں تھا کہ دن گھستا چلا آ رہا تھا۔ اسے کسی طور اس آنکھ کو پورا کھولنا ہوگا تاکہ آسانی سے بند کر سکے۔ اس نے کئی بار کوشش کی مگر پپوٹوں کے کنارے پھر بھی جڑے رہے۔ آخر میں تھک کر اس نے ایک بیڑی سلگالی جسے وہ خود بناتی تھی، اور بھک بھک دھواں نکالتے ہوئے اپنے مجروح دانتوں سے تنکے کھینچ کھینچ کر بانس کی ٹوکری بننے لگی۔ اس کے بیٹے رائسن ہیمبرم کو شہر نے مانگ لیا تھا اور اب وہ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے اپنے ہتھوڑے اور دوسرے اوزار لے کر گھومتا۔ اس کے شوہر سنگرو نے مہوے کا ٹھرا پی پی کر اپنا پیٹ تنا بڑا کر لیا تھا کہ اسے شہر کے سرکاری اسپتال میں اندر سے چیر کر ٹھیک کرنا پڑا۔ مگر پھر وہ زیادہ دن تک زندہ نہ رہ پایا۔ اس نے اتنا غصہ اپنے اندر بھر لیا تھا کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی رکھیل آرتی سردار کو اتنا مارا اتنا مارا کہ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ اس دن گاؤں والوں نے فیصلہ کیا کہ سنگرو شرابی ہو گیا ہے اور سنگرو مرنے والا ہے اور اب سنگرو کسی بھی دن جنگلی بدروحوں کے شکنجے میں ہوگا جو اسے اڑا کر ڈھاک کے جنگل میں لے جائیں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیڑوں کے کھوکھلوں میں بھٹکتا رہے گا اور راہ گیروں پر عجیب وغریب چہرے بناتا رہے گا۔

Scanned with CamScanner

ایک دن منگرو کا بھوت آئے گا! جھرنا ہیمبرم خود سے کہہ رہی تھی۔ اور وہ ہر کام آسان کر دے گا۔ وہ سوٗروں کے طویلے میں رہنا شروع کر دے گا اور سوٗروں کی گری بڑھ جائے گی۔ وہ مرغیوں کے ڈربے میں رہنا شروع کر دے گا اور ان کے لیے ہرے ہرے پیڑ اور جھاڑیوں کے نچلے حصوں میں اگائے گا۔ اور سلائی کنڈ کے بڑے پتھر سے پھوٹتے جھرنے میں پانی ہی پانی ہوگا۔ میں نے منگرو کے لیے جنگل کے کھوکھل صاف کروائے ہیں تاکہ اپنے آرام کے لیے اسے ڈھاک کے جنگل کی طرف لوٹنا نہ پڑے بلکہ انھیں میں سے کسی میں وہ آرام سے لیٹا رہے ٹھیک اسی طرح جس طرح جب وہ زندہ تھا لیٹا رہتا تھا۔

وہ لوگ کانا پہاڑ کے باشندے تھے۔ اسے کانا پہاڑ اس لیے کہتے تھے کہ جب سورج اس کی چوٹی کو چھو کر ڈوبتا تو کانی آنکھ کی شکل اختیار کر لیتا۔ کانا پہاڑ کے بارے میں بہت ساری باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً اس پر بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے قبائلی گاؤں اب اپنے پرانے رکھ رکھاؤ سے ہٹتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ پر عیسائی مشنری حاوی ہو گئے ہیں اور کچھ نے ہندو دیوی دیوتاؤں کو اپنا لیا ہے۔ مگر جو افواہ سب سے زیادہ گرم تھی اور جس نے لوگوں کو مضطرب کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ اب کانا پہاڑ سے روحیں منتقل ہو رہی ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں سے ناخوش ہیں اور ایک دن آئے گا جب پہاڑ کے گربھ سے آگ ابلے گی اور پیڑ پودے گھر دوار اس طرح جلیں گے جس طرح جنگل میں آگ پھیلنے سے کیڑے مکوڑے جلتے ہیں۔

شاید یہی وجہ تھی کہ منگرو کے اندر اس قدر غصہ بھرا ہوا تھا۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے تیر اور بھالے تیز کیا کرتا۔

مگر اس نے کبھی تیر نہیں چلائے، بھالا نہیں اٹھایا۔ وجہ بے وجہ مہوا پیتے پلاتے رہنا، ڈھلان میں ہفتہ وار ہاٹ میں مرغے لڑانا اور ہباڑ یا کھیلنا جہاں سے وہ بہت سارے سکے جیت کر آتا اور کبھی کبھار ہار کر بھی۔ مگر جھرنا ہیمبرم جانے کیسی جادوگرنی تھی، دو وقت کا ابلا ہوا اناج اور گوشت اس کے برتن میں عین وقت پر دھرا ہوتا جن کی طرف منگرو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا، مگر کھائے جاتا، جیسے یہ سب کچھ اسے اچھا نہ لگ رہا ہو، جیسے اس کے اندر کی آتما اسے پھنکار رہی ہو۔ اور جب اس اندرونی ملامت سے وہ ہار جاتا تو آرتی کے پاس چلا جاتا۔ آرتی جو جانے انجانے کتنوں ہی کی مشترک رکھیل

تھی اور جسے مہوے سے شراب کشید کرنے کا فن آتا تھا اور جس کا شوہر اسے ہر کسی کے پاس بیچنے کے لیے بے چین رہتا۔

''بت کراری بہو ہے، بس ایک باتلی ٹھرا سرکار اور دس روپے۔'' وہ اکثر پہاڑی راستے سے گزرنے والے سیاحوں کی گاڑیوں کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی بغل میں آرتی سر جھکائے کھڑی رہتی، اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کرتی رہتی۔ اپنی ساڑی کے پلو کو منہ میں ٹھونستی جاتی۔

''یہ شہری لوگ!'' وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

اور جب جھرنا ہیمبرم اکیلی رہ گئی تو کتنوں نے ہی اسے گونے کی پیشکش کی۔ وہ تو کریاں اچھی بنتی تھی۔ اس کے جانور بیماری سے نہیں مرتے تھے اور جنگل کے ان گوشوں سے وہ بخوبی واقف تھی جہاں بدلتے موسموں کی مناسبت سے سوکھی لکڑیوں کی بہتات ہوتی۔ اس کے بالوں میں چاندی کے تار جاگنے لگے تھے اور اس جیسی تجربہ کار عورت کا سہارا قابل قبائلیوں کی ہمیشہ کی ضرورت رہی ہے۔

صرف جھرنا ہیمبرم کو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی منگرو کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ صرف منگرو کہیں اور تھا اور وہ کہیں اور۔ جنگل میں کیکر، شہتوت اور بچھوتی کی جھاڑیوں میں جہاں سانپ اپنی کینچلی چھوڑ جاتے وہ منگرو کے پیروں کے نشان ڈھونڈتی۔ مگر پھر اسے یاد آتا، آتماؤں کے پیر نہیں ہوتے... نہیں پیر تو ہوتے ہیں، مگر انھیں زمین پر رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی جھرنا ہیمبرم خود بھی پریت آتما کی شکل اختیار کر لیتی اور اسے لگتا وہ کیکر کی جھاڑیوں پر بہ آسانی چل سکتی ہے۔ اس کے اندر اسے آزمانے کی ہمت تو نہ تھی مگر وہ، آتماؤں کا مذاق بھی اڑانا نہیں چاہتی تھی۔

جس دن رائسن اپنے سے بھی دگنی عمر کی ایک عورت کے ساتھ وارد ہوا جس سے اس نے بیاہ کر لیا تھا تو بڑے غصے میں دکھائی دیا۔ اس دن پہلی بار جھرنا ہیمبرم کو منگرو کی بہت ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ اکیلی ہو گئی ہے۔

''یہ سب کچھ اب زیادہ دن نہیں چلنے کا، ماں!'' رائسن نے گھر کے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا۔ ''اب زیادہ سے نہیں ہے جب ہماری ماں بنے گی اور ہمیں اگلے دنوں کے بارے

میں بھی سوچنا چاہیے۔''

''اگلے دن؟'' جھرنا ہیمبرم نے معصومیت سے پوچھا۔

''میرے ریلوے کوارٹر میں دو کمرے ہیں،'' راکسن نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ کھانس بھی رہا تھا۔ ''اور بواری جب ماں بنے گی تو ہمیں کسی نہ کسی کی ضرورت تو ہوگی ہی۔ رہا ایک کمرہ تو اسے ہم کرائے پر دے سکتے ہیں۔''

دو ہفتے راکسن اور بواری جھرنا ہیمبرم کے ساتھ رہے۔ بواری اور جھرنا ہیمبرم کسی حد تک ہم عمر بھی کہی جا سکتی تھیں۔ اس لیے دونوں گھل مل گئیں۔ بواری کے کولہے پیچھے کی طرف نکلے ہوئے تھے اور اس کے سامنے کے تین دانت نقلی تھے جنھیں رات کے وقت کھول کر اسے پانی کے پیالے میں ڈبو کر رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بار بار اپنے دونوں کان جھاڑتی اور نقلی دانتوں سے ہنستی۔

''میرا باپ شروع میں میرے بیاہ سے خوش نہیں تھا جیسا کہ میرے باپ کو ہونا چاہیے۔ وہ میرے لیے اور بھی اونچے سپنے دیکھتا تھا۔ مگر میری سوتیلی ماں نے میرا ساتھ دیا۔ ہم نے ہنومان چوک کے مندر میں شادی کی۔ میری تین بہنیں ہیں اور سب کی سب میری ہی طرح سندر ہیں پر ہمیں مردوں کا کیا کال ہے۔''

جھرنا ہیمبرم زیادہ تر اس کی باتوں کا سرا ٹھیک سے پکڑ نہ پاتی۔ مگر پھر بھی اسے پتا تو تھا کہ اس کے بیٹے کی بہو اپنے دل کا بوجھ اس کے سامنے ہلکا کر رہی ہے۔ راکسن تو جھونپڑی سے تھوڑی دور بانس کے جھنڈ کے سامنے بچھی چارپائی پر لیٹا لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور اپنی انگلیاں چٹخاتا رہتا۔ اور یہ وہی جگہ تھی جہاں دس سال پہلے تک چیتا اور بن سور آیا کرتے تھے۔

''ارے، یہ سب کتنی بکواس ہے،'' وہ بیچ بیچ میں چلا اٹھتا۔ ''اس کانا پہاڑ میں ڈھنگ سے جینے کا کچھ تو سادھن ہونا چاہیے۔''

بواری ضرورت سے زیادہ کھاتی تھی اور اسے ہر وقت لوٹا لے کر جھاڑیوں کے پیچھے گڑھیا کی طرف جانا پڑتا۔

''مجھے تو لگتا ہے ماں، مجھے جلد سے جلد اسے بیٹنا شروع کر دینا چاہیے،'' راکسن ماں کو آنکھ مار کر کہتا۔ ''اس جیسی عورت ___ لیے اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کا باپ سالا انجن کا خلاصی

Scanned with CamScanner

تھا جو اسٹیم انجن سے ریٹائرڈ تو ہو چکا ہے مگر انگاروں کی سی آنکھیں رکھتا ہے۔ صرف بواری اس سے نہیں ڈرتی۔ اور اس کی یہی بات تو مجھے بھاتی ہے۔"

گاؤں میں جتنے بھی جھونپڑے تھے سب ایک دوسرے سے الگ الگ مختلف اونچائیوں پر کھڑے تھے۔ ایک دو جگہ باڑ کے اندر مکئی اور سورج مکھی کے پودے تھے۔ جھرنا ہیمبرم کے کتے تھابا نے بواری کو شروع سے ناپسند کر دیا تھا۔ وہ بیٹا جھجک دور کھڑا اس پر بھونکتا رہتا۔ سورنا ندمیں چھینکتے رہتے، جھرنا ہیمبرم نوکری بنی رہتی اور رائسن چارپائی پر سگریٹ کی تیز می راکھ کو دھیرے دھیرے ہوا میں منتشر ہوتے دیکھتا رہتا۔

واقعی یہ سب کوری بکواس ہے، وہ دل ہی دل میں سوچتا۔ اور اس کتے کو مہمانوں کی قدر کرنی چاہیے۔ میری غیر حاضری میں اس گھر کا تو کباڑا ہی ہو گیا ہے گویا۔ بڑھو کے مرنے کے بعد کچھ بھی تو نہیں سدھرا ہے یہاں۔

اور دو ہفتے بعد رائسن ہیمبرم اپنی بیوی بواری اور ماں جھرنا ہیمبرم کو لے کر گاؤں سے چلا گیا۔

اور بس میں تین گھنٹے اور رکشا میں پندرہ منٹ کے سفر کے بعد تینوں ریلوے کے ایک پرانے کوارٹر کے دروازے پر پہنچ گئے جس کی قدیم طرز کی محرابی چھت پر جھاڑیاں اور پیپل کے پودے اگے ہوئے تھے۔ یہاں آنکھوں کے سامنے ریلوے کی پٹریاں چمک رہی تھیں اور جھرنا ہیمبرم کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کوئلہ جلانے کا اتنا تیز دھواں جانے کہاں سے پھیل رہا تھا اور یہاں پیڑ پودوں پر ایک عجیب سی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ زمین توے کی طرح سپاٹ اور سیاہ تھی اور جدھر بھی نظریں اٹھاؤ صرف کوے ہی کوے تھے اور انسان بھی انسان جو کوؤں کی طرح ہی غلیظ تھے اور کالک سے لپٹے ہوئے انھیں کی طرح ڈھیٹ نظر آ رہے تھے۔ پہلے دن سے ہی جھرنا ہیمبرم کو گھر کا پورا کام کاج سنبھالنا پڑا اور چونکہ کرایہ دار ابھی مل نہ پایا تھا، رائسن نے دوسرے کمرے پر تالا دے رکھا تھا۔ اس لیے جھرنا ہیمبرم کو اپنا بستر باورچی خانہ کے دروازے کے پاس آدھے گھرے ہوئے برآمدے پر لگانا پڑا جہاں سے پٹریوں کے اوپر پھیلے ہوئے کالک زدہ تار اور تاروں بھرا آسمان دکھائی دیتے تھے۔

اندر کمرے سے بواری اور رائسن کے کھلکھلا کر ہنسنے، چومنے اور ایک دوسرے کو پیار بھری گالی

گالیوں سے نوازنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ آدھی رات سے قبل دونوں باری باری سے جھرنا ہیبرم کے سوتے ہوئے جسم کو لانگھ کر غسل خانے کے اندر جاتے۔ مگر جھرنا زیادہ تر وقت جاگتی رہتی اور ایسے اوٹ پٹانگ وقت میں سو جاتی جب بواری کو اس کی ضرورت ہوتی۔

"جب سے کوارٹر آئی ہے، بڑھیا کو تو مزہ ہی مل گیا ہے،" بواری کوسنے دیتی۔ "ٹھنگ سے دو وقت کا کھانا بنانا تو آتا نہیں، پسر کر یوں سوتی ہے جیسے سارا جگ جیت آئی ہو۔"

اب تو رواسن نے نل سے پانی لانا بند کر دیا تھا۔ نل پر پانی کے لیے بڑا ہنگامہ ہوتا۔ اکثر جھرنا خالی ڈول کے ساتھ واپس لوٹتی۔ اور اس پر بواری کا عتاب نازل ہوتا۔

"غیر کو تو آدمی گالی بھی دے لے، مگر اپنے پر کیسے تھوکے؟" بواری اپنے خصم کو سناتی۔ "جی میں تو کہتی ہوں، آپ تو ادھر توجہ دیتے ہی نہیں۔ بس اکیلے مجھے ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ بڑھیا تو خالی ڈول لے کر واپس آجاتی ہے اور مجھے نل پر جا کر گالی گلوج کرنی پڑتی ہے۔"

"سب بکواس سن رہا ہوں میں،" رواسن کہتا۔ "میرا خیال ہے بڑھیا جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ جلد ہی سیکھ جائے گی۔ ارے اب اس میں جلانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تم بواری بس جلد سے جلد ایک بچہ دے دو، یہ گھر بھر جائے گا۔ کیوں نہ آج ہم ایک نیا طریقہ اپنائیں؟"

اور پچھلے پورے دو سال سے دونوں اسی کوشش میں تو مصروف تھے۔ جھرنا ہیبرم کے آنے کے بعد اب تو دن میں بھی وہ ایک آدھ کوشش کر لیتے۔ فرصت کے وقت جھرنا کوارٹر کے دروازے کے باہر اکڑوں بیٹھی زمین پر کسی تنکے سے لکیریں کھینچتی رہتی، ٹرینوں کو گزرتے دیکھتی رہتی۔ اسے دھواں اگلتے ہوئے اسٹیم انجن زیادہ اچھے لگتے جن کے ڈرائیور سر پر غلیظ رومال باندھے رہتے اور اس عجیب و غریب بڑھیا کی طرف تاکتے رہتے جسے اس شہر کی بھاشا بھی نہیں آتی تھی۔ پٹریوں پر بھاگتے کتوں کو دیکھ کر اسے اپنا جھبرا یاد آجاتا۔ سؤروں کو تو اس نے پڑوسیوں کو امانت کے طور پر سونپ دیا تھا، مگر جھبرا کو کون سنبھالتا؟ کتنی دور تک وہ پہاڑی راستے پر بھاگتا آیا تھا اور بس کے پیچھے پیچھے اس نے دوڑ بھی لگائی تھی۔ جھرنا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ دبی دبی آواز میں کوئی پہاڑی گیت گانے لگتی جسے وہاں کوئی سمجھ نہ پاتا، یہاں تک کہ اندر سے بواری کی پکار سنائی دیتی۔

"بڑھیا، باہر کیا خصم پھانس رہی ہے کہ اب تک آنکھیں سجی ہوئی ہیں؟ کتنا درد ہے میرے

Scanned with CamScanner

بدن میں۔ مگر کوئی مجھے اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھے تب نا!"

رات کو اکثر رائسن دیر سے شراب پی کر لوٹتا اور باورچی خانے کے دروازے پر پڑے ہوئے جسم سے اسے چڑ ہو جاتی۔

"جی چاہتا ہے ایک لات جماؤں اسے۔ یہ بھی سونے کا کوئی وقت ہے بھلا؟ اور کھانا کون کھلائے گا؟ یہ سب تیرے کارن ہے کہ بواری کے پیٹ میں بچہ ٹھہر نہیں پا رہا ہے۔"

"اور کیا!" بواری اندر سے تائید کرتی۔ "ذرا سمجھا دو اسے، کبھی جو مالش کا تیل گرم کر کے میرے بدن پر لگایا ہو۔ میری تو کمر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔"

"ارے گھبرانے کی بات نہیں، پہلے کچھ کھا لینے دو، بڑی بھوک لگی ہے۔ پھر میں تیری کمر کا درد ٹھیک کر دیتا ہوں۔ میرے پاس ایک خاص نسخہ ہے،" رائسن آنکھ مار کر کہتا۔ "اور ذرا دیکھ، کیا لایا ہوں تیرے لیے۔ بہت ہی خستہ مال پوے ہیں۔ پسند ہیں نا تجھے؟ پراٹھا بھی تو کھا لینا کہ پھر سے لوٹا لے کر سو دو دن تک پڑے ہے۔"

"ارے، میرے پیٹ میں تو کچھ پچتا ہی نہیں۔"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے، گھر کے اندر سنڈاس جو ہے۔"

کبھی کبھی بواری باپ کے گھر چلی جاتی۔ اس وقت گھر میں سناٹا رہتا اور دونوں ماں بیٹے کی دبی ہوئی محبت لوٹ آتی۔

"ارے اماں، بواری سے کہوں گا اب کے بازار سے تمھارے لیے تانت کی ساڑی لا دے۔ اور یہ سڑی گلی چپل، مجھ سے تو یہ برداشت نہیں ہوتی، جانے تم کیسے انھیں گھسیٹتی پھرتی ہو؟"

"ارے اماں ذرا ٹھیک سے کھایا کرو، تم تو سوکھتی جا رہی ہو۔ یہی حال رہا تو تمھارے باقی کے دانت بھی جھڑ جائیں گے۔"

"ارے اماں، اب کے بواری سے کہوں گا تمھیں ریلوے ٹاکیز میں سنیما دکھا کر لائے۔"

مگر بواری دن بدن شکی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ٹونا ٹوٹکا بھی کر کے دیکھ لیا تھا، سادھو سنتوں اور پیر فقیروں کے مزاروں کے درشن بھی کر لیے تھے، منگا بھوت والے برگد پر سیندور کی پوجا بھی کی تھی اور تجربہ کار چھنال بوڑھیوں سے سن کر رائسن کے ساتھ ہر وہ طریقہ آزما لیا تھا جو بچہ پیٹ میں رکھنے

Scanned with CamScanner

کے لیے ضروری ٹھہرتا ہے، مگر تھی وہ بانجھ کی بانجھ۔ اور آخر کار اس کی بجلی جھرنا بیسرم پر ہی ٹوٹی۔

"یہ سب اس کے کارن ہے۔ اس نے اپنے مرد کو کھایا اور اب میرے پیٹ سے بچے چرا رہی ہے۔"

"چپ رہو رنڈی،" رانسن چلاتا۔ "میری پیاری رنڈی!"

"میں کہتی ہوں، ضرور اس میں کچھ بات ہے۔ میں نے اکثر کچھ سائے آنگن میں چلتے دیکھے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں، کبھی تم غور سے بڑھیا کو نہیں دیکھتے۔ کل صبح میں نے جب اسے دیکھا تو وہ مری پڑی تھی۔ مگر اسے جب ہلایا تو اس نے اپنی سیلن بھری آنکھیں کھول دیں اور اپنے سفید دانتوں سے بھوتنی کی طرح ہنس دی۔"

"میں کہتی ہوں یہ رات کو نیند میں چلتی ہے اور اپنے گیتوں کے ذریعے بدروحوں کو بلایا کرتی ہے۔"

مگر رانسن زیادہ دن تک ماں کا دفاع نہ کر سکا۔ اب تو بیوی نے کھلے عام جھرنا کو گالی دینا شروع کر دیا تھا۔

"ہر رات اس چڑیل کو مجھے لانگھنا پڑتا ہے۔"

"ہر صبح اس کی لاش دیکھنی پڑتی ہے۔"

"ہر دوپہر، جب میں سوتی ہوں، جانے یہ کہاں جاتی ہے۔ لوگوں نے اسے مُڑے ہوئے پیروں سے چلتے دیکھا ہے۔"

اور جب بات حد سے گزر گئی تو ایک دن رانسن نے جی بھر کر شراب پی، گھر آیا اور ماں کے جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے جا کر ریل کی پٹری پر ڈال دیا۔ جھرنا اٹھی اور لنگڑاتے تاروں کی ناکافی روشنی میں اس سمت ہو لی جدھر اس کی دانست میں اس کے پہاڑ تھے۔

گھر پہنچنے میں اسے تین دن لگے۔ اس ایک سال کے عرصے میں اس کے اور بھی بہت سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ جب پہاڑ نے بیسرم کو دیکھا تو اس نے اپنی جھاڑیوں اور پیڑوں والی بانہیں پھیلا دیں اور سورج کا تاپہاڑ پر گویا ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا اور رنگین سروں والے گرگٹ سوکھے پتوں پر بھاگتے بھاگتے رک گئے اور اپنے سر موڑ موڑ کر جھرنا بیسرم کو تاکنے لگے۔ اور جب جھرنا بیسرم گاؤں

سے کچھ دور، جہاں تک بس کے کنڈکٹر نے ترس کھا کر اسے لفٹ دی تھی، ایک چٹان پر بیٹھی اپنے بالوں سے تنکے نوچ نوچ کر نکال رہی تھی تو اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

ٹھنڈا سورج کو سر پر اٹھائے کھڑا تھا۔

''گھر لوٹ کر آگئی مالکن؟'' کتے نے کہا۔

''ہاں رے۔'' جھرنا ہیمبرم نے کتے کے سر کو تھام کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میرا بچہ بڑا دکھی ہے ٹھنڈا۔ مجھے جلد سے جلد انصاف مانگنے ڈھاک کا جنگل جانا ہوگا۔''

ڈھاک کا جنگل! ڈھاک کا جنگل! کتا راستے بھر بھونکتا رہا۔

کبھی ڈھاک کے جنگل میں صرف ڈھاک کے پیڑ رہے ہوں گے، مگر حال کے برسوں میں دوسری قسم کے پیڑ بھی جگہ جگہ اگ آئے تھے۔ انھیں میں سے چھتیان کے ایک پیڑ پر منگرو نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ اس کی کھوکھلی شاخ پر، ہاتھ پر سر رکھے لیٹا رہتا اور اپنی مڑی ہوئی ٹانگ ہلایا کرتا۔ یہاں وہاں بھونیا کے پیڑوں میں گلابی پھول کھلے ہوئے تھے اور املتاس کے پھل لانبے اور وحشی انداز میں جھولتے رہتے اور ڈھاک کے بونے پیڑوں میں دھول اور ہوا سرگوشیاں کرتی رہتیں جن میں کمتر درجہ کی روحیں بلبلایا کرتیں۔

''خاموش رہو بے مطلب کے پلو!'' منگرو کی آواز سے روحیں دہل جاتیں اور وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے پیڑوں اور جھاڑیوں کے پیچھے پناہ لینے لگتیں۔ ''یہ بھی کوئی زندہ انسانوں کی جگہ ہے کہ دانت نکوس رہے ہو؟ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے علاوہ تم آتماؤں کو اور کچھ آتا بھی ہے؟''

''بغاوت!'' روحیں دوبارہ چلاتیں۔

اور ان نعروں کو سن کر منگرو کا پیٹ ہنسی سے پھولنے لگتا۔ وہ چھتیان کے پیڑ سے زمین پر چھلانگ مارتا اور ڈھاک کے پیڑوں کی آڑ سے نکلی ہوئی روحوں کے کولھوں پر لات لگایا کرتا۔

''تم اسی قابل ہو'' وہ کہتا۔ ''اور شاید یہ لات تھوڑی بہت عقل تمھارے پیٹ میں ڈال دے۔''

مگر جھرنا ہیمبرم جب ڈھاک کے جنگل میں وارد ہوئی تو روحوں کی آپس میں صلح ہو چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈھاک بن میں سرے سے روحوں کا وجود ہی نہ ہو۔

Scanned with CamScanner

منگرو نے چیتیان کی کمزور شاخ سے سر موڑ کر جھرنا بیبرم کو دیکھا اور مسکرایا۔

"آ گئی میری مہوا کی ترنگ۔ ذرا دیکھو، مرنے کے بعد بھی اسے میری ضرورت ہے جیسے زندگی بھر کا دکھ لے کر بھی جی نہیں بھرا۔ آہ، ہماری ناریوں کو اور کتنا بوجھ چاہیے۔"

تھمبا کا سینہ کانپ رہا تھا۔ وہ سر کو زمین پر گاڑ کر غرا رہا تھا۔ اس کی دم ٹانگوں کے بیچ چھپتی جا رہی تھی۔ اسے بدروحیں کبھی پسند نہیں تھیں۔ اسے ان کی عادت بھی نہ تھی۔

"وہ دکھی ہے، بہت دکھی ہے۔" جھرنا گھٹنوں کے بل گر کر رو رہی تھی، مٹی چہرے پہ مل رہی تھی۔

"اچھا!" منگرو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "تب تو میں بھی دکھی ہوں۔"

"آہ منگرو، ایک سال تک میں نے اس کا دکھ دیکھا۔ آہ، ہمارے بچے دکھی ہیں۔"

منگرو کود کر چیتیان کے پیڑ سے نیچے اترا اور جھرنا کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر کے بال تن کر کھڑے ہو گئے۔ بہت ساری روحوں نے پتوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ وہ اپنی لانبی زبانوں سے دانت چوس رہی تھیں اور منگرو کی مصیبت سے خوش تھیں۔

"عورت! میرے قریب نہ آنا، ورنہ میں تیرا ٹینٹوا دبا دوں گا۔ میں پہاڑ پر گدھوں کو اڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا جیسا کہ تم چاہتی ہو۔"

"چاہے وہ اپنا بچہ ہو؟" جھرنا بیبرم نے بڑھ کر منگرو کا کرتا پکڑنا چاہا۔

"دور ہٹ!" منگرو کود کر پیچھے ہٹ گیا اور اپنی ایڑیوں پر بلند ہوتا چلا گیا جسے دیکھ کر کمتر آتماؤں کے دل کانپنے لگے۔ "مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جاتا۔ اتنی کمزوری کے ساتھ زندہ رہنا کیا مطلب رکھتا ہے۔ عورت اپنے ناخن تیز رکھ اور زبان کی نوک پہ انگارے۔ سانپوں میں مجھے کوبرا سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"انہیں بچہ دے دو منگرو۔ ان کی زندگی آسان ہو جائے گی۔"

"ہرگز نہیں!" منگرو دانت پیس رہا تھا۔ "تو پہاڑ سے نیچے گئی اور انھوں نے تیرے بال سفید کر ڈالے۔"

"منگرو..."

"تجھے زندہ رہنے کے لیے کسی کی ضرورت تو نہیں تھی جھرنا؟ تو ریچھ کی طرح طاقتور تھی۔ تو تو

Scanned with CamScanner

اکیلی پہاڑ کی رکھوالی کر سکتی تھی۔ پھر بھی، جب تو کمزور پڑ ہی چکی ہے تو میں تجھے لڑنے کے لیے ایک ہتھیار دیتا ہوں۔" وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ وہ ایک دیودار کے تنے پر چڑھتا نظر آیا۔ اس نے اپنی آنکھیں خاردار جھاڑیوں پر ٹانگ دیں اور کان پتوں پر لٹکا دیے۔ اس کے دانت پتھروں پر گرتے چلے گئے اور اس کے بال الگ الگ رینگنے لگے۔ جھرنا بھیرم نے اپنے سامنے ایک چھوٹے سے نقارے کو پڑا پایا۔ منگرو اس کے سامنے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ نقارے کے چمڑے کی کھال پر اپنی سوکھی جھریوں والا ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"اس نگاڑے کے لیے ہم روحوں نے کتنی محنت کی تھی۔ اسے مٹی کے نقاب پہن کر ناچنے والوں سے چھینا تھا جب ان کا جتھا نیچے شہر کی طرف جا رہا تھا اور نشے میں تھا۔ جب بھی تیرا دکھ تجھے چاٹنے تو اپنی ساری چوٹ اس کو دینا۔ یہ تیرا دکھ بانٹ لے گا، تیرا کام آسان کر دے گا۔ اسے بجانے کے لیے ایک مڑی ہوئی لکڑی بنا لینا اور اسے تیل پلانا جس کی ہم روحوں کو قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔"

منگرو چٹیان سے پیڑ کی طرف اڑتا دکھائی دیا۔ روحوں نے اپنے سر جھاڑیوں اور پتوں کے اندر کر لیے۔ منگرو نے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اپنی ایک ٹانگ ہمیشہ کی طرح موڑ لی اور سیٹی بجانے لگا۔

"چل بھاگ یہاں سے!" اس نے کہا۔

نقارے کی آواز زیادہ تر رات کی تنہائی میں سنائی دیتی۔ اب نقارے کی چوٹ سے جھرنا بھیرم نے گاؤں کے لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ کہاں سے ملا اسے یہ نگاڑا؟ یہ بڑھیا عجیب و غریب کارنامے دکھاتی ہے۔ ایک سال بعد بھی اس کے تمام سؤر زندہ رہے تھے اور تھکاوٹ نے تین جنگلیوں کو کاٹ کھایا تھا جو گوشت کے لیے اس کا اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر یہ نگاڑا ایک عجیب واقعہ تھا۔ اسے سمجھنا مشکل تھا۔ مگر بڑھیا ہر رات جس دلجمعی سے اسے بجاتی وہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ بوڑھا منگل باسکے ایک دن لنگڑاتا ہوا جھرنا بھیرم کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے بیڑی قبول کی اور کھانستا رہا۔ جھرنا نے نگاڑا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ بوڑھا باسکے سارے گاؤں اور اس کے چرند و پرند کی طرف سے آیا تھا۔

"اس کا چمڑا مضبوط ہے اور لکڑی کا تو جواب نہیں جس پر یہ تنا ہوا ہے،" منگل باسکے نے بیڑی

Scanned with CamScanner

پیٹتے ہوئے کہا۔ ''کوئی وجہ تو ہوگی کہ تم اسے اس طرح راتوں کو بجاتی ہو؟''

''میرے رائسن کو اس کی ضرورت ہے۔''

''شاید۔'' منگل بانکے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہمیں اس سے کیا لینا۔ ہر کسی کو اپنے ڈھنگ سے دکھ جھیلنے کا حق ہے۔''

لگتا ہے بیٹے کی مار کھا کر دماغ پھر گیا ہے، اس نے گاؤں والوں کو بتایا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے۔

اور گاؤں والوں نے جھرنا ہیمبرم کو معاف کر دیا۔ مگر جھرنا کی ہر رات امیدوں بھری تھی۔ وہ دل لگا کر آدھے گھنٹے تک نقارہ پیٹتی اور صبح کا سینہ کانپتا رہتا۔ اور پھر واقعی معجزہ ہو گیا۔ نقارے نے چمتکار دکھایا۔

جاڑے کی ایک کہر آلود صبح رائسن دروازے پر کھڑا تھا۔ جھرنا اس سے لپٹنا چاہتی تھی، مگر رائسن سرد مہری کے ساتھ چپ چاپ کھٹیا پر بیٹھ گیا اور بیڑی پھونکتا رہا۔ اس نے وقت پر کھانا کھایا اور بانس کے جھنڈ کے پیچھے جا کر زمین پر لیٹ کر دھوپ کھانے لگا۔ اگلے پورے ہفتے تک اس نے بہت کم بات کی۔ وہ گاؤں میں آوارہ گھومتا پھرا۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔

''بواری کیسی ہے؟'' آخر ایک دن جھرنا ہیمبرم نے پوچھ ہی لیا۔

''اچھی ہے۔'' رائسن نے بتایا۔ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی گھنگھریالی داڑھی اگ چلی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ لگ رہا تھا اندر ہی اندر اسے کچھ کھرچ رہا تھا۔ اس نے نقارے کو تعجب اور تمسخر سے دیکھا۔

''تو اب اس کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے؟ کیا بکواس ہے۔''

مگر بیٹے کے آنے کے بعد جھرنا کو نقارے کی ضرورت نہ تھی، اس لیے اس نے اسے بانس کی ایک پرانی چٹائی کے اندر لپیٹ کر رکھ دیا۔ اب وہ پہلے کی جیسی جھرنا ہیمبرم بن گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں منگرو کی شکر گذار تھی۔

''شاید اب میں واپس نہ جاؤں۔ ان شہروں میں کوئی زندگی نہیں ہے ماں،'' ایک دن رائسن نے اعلان کیا۔

"بواری کو کب لا رہے ہو؟"

رائسن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر ایک ہفتے کے اندر یہ جواب جھرنا ہیبرم کو دوسری طرح سے مل گیا جب شہر سے پولیس کا ایک دستہ آ کر رائسن کو حراست میں لے کر چلا گیا۔ رائسن پر بواری کے خون کا الزام تھا جس کے مردے کو اس نے ریل کی پٹری پر ڈال دیا تھا تا کہ اسے ایک حادثہ قرار دے سکے۔ مگر وہ اس وقت اتنا پیے ہوئے تھا کہ اسے آس پاس کا ہوش نہ تھا اور کئی لوگوں نے اسے بواری کے جسم کو پٹری پر ڈالتے دیکھا تھا۔

اس کے جانے کے بعد جھرنا لٹی لٹی سی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی رہی، بانس کے جھنڈ کے اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان میں پرندوں کو چکر لگاتے دیکھتی رہی۔ اس رات گاؤں والوں نے پھر سے نقارے کی آواز سنی اور یہ آواز رک رک کر رات رات بھر سنائی دیتی رہی۔ مہینوں بیت گئے۔ جھرنا ہیبرم کے بدن پر گوشت برائے نام رہ گیا اور اس کے چہرے کی ہڈیاں ابھر نکل آئیں۔ ہر وقت اس کی آنکھیں بے چینی لیے اپنے گڈھوں میں گھومتی رہتیں۔ اس کے آدھے سور بیماری سے مر گئے اور جس دن وہ تصبا اور پھٹے ہوئے نقارے کے ساتھ ڈھاک کے جنگل کی طرف گئی۔ اس دن آسمان پر گھنے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ڈھاک کا جنگل سنسان پڑا تھا۔ اس نے نقارے کو منگرو کے مچان کے پیڑ سے لٹکا دیا اور منگرو کو جنگل میں ڈھونڈتی رہی۔ ڈھاک کا جنگل خاموش تھا۔

اس کی آواز پہاڑ کے اوپر سے دوسرے پہاڑ تک جا کر لوٹ آئی جیسے تیز ہوا اسے کاندھوں سے ڈھو کر لے گئی ہو اور واپس لے آئی ہو۔

"منگرو! یہ نقارہ تو اب کچھ بھی نہیں کرتا۔"

ڈھاک کا جنگل اب پوری طرح خاموش بھی نہ تھا۔ ڈھاک کے بڑے بڑے پتوں پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے پتوں کے پیچھے کچھ سرسرا رہا ہو، مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے ہوا تیز ہو گئی، آسمان بجلی کے کڑکنے سے آر پار پھٹتا چلا گیا اور تیز بارش اور ہوا میں پیڑ زمین بوس ہوتے گئے۔ جھرنا اور تصبا نے ڈھاک کے ایک پیڑ کے تنے سے لپٹ کر سر کو دونوں بانہوں کے اندر کر لیا۔ ان کی پیٹھ اور کولھوں پر بارش تازیانے لگا رہی تھی، اولے

برسا رہی تھی۔

"واپس نہ چلیں مالکن؟" تھمبا بیچ بیچ میں جھرنا سے سرگوشی کر رہا تھا۔ مگر واپسی ناممکن تھی جب تک طوفان فرو نہ ہو جاتا۔ اور جب طوفان فرو ہوا تو سارا جنگل گیلا، اداس اور خاموش تھا۔ اپنے سارے پانی برسا کر بادل بدمست ہاتھیوں کی طرح واپس جا رہے تھے۔ جھرنا اور تھمبا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ڈھاک کے جنگل میں اب صرف ڈھاک کے پیڑ رہ گئے تھے۔ املتاس، مہوا اور چھتیان کے سارے پیڑ جن پر آتمائیں رہتی تھیں اور وہ بھی جس پر منگرو رہتا تھا، نگاڑے کے ساتھ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

صدیق عالم

لیمپ جلانے والے

تم سفر کے بارے میں سوچ کیسے سکتے ہو؟ ایک نئی دنیا کے لیے خود کو تیار کرلو۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ ابھی امکانات نے اپنے تمام دروازے کھولے ہی کہاں ہیں۔

لیمپ پوسٹ

گلی سے نکلتے ہی نکڑ پر ایک آہنی لیمپ پوسٹ واقع ہے جس پر پرانے وقتوں میں کبھی کیروسین تیل کا لیمپ جلا کرتا ہوگا۔ اب وہ لیمپ اپنے پنجرے اور شیشوں سمیت غائب ہو چکا ہے۔ اب کھمبے پر صرف ایک بریکٹ بچی ہے جس پر کبوتر یا کوے بیٹھے پہرہ دیا کرتے ہیں۔

ایک دن اس کا ایک اور مصرف بھی نکل آتا ہے جب ایک بھکاری اس بریکٹ سے لٹک کر خودکشی کر لیتا ہے۔ لیکن اس واقعے کو ایک دہائی گزر چکی ہے۔ میں پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اپنے پنشن یافتہ ہونے تک میں نے اس لیمپ پوسٹ کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا جو دور سے ایک ٹوٹی ہوئی صلیب کی مانند دکھائی دیتا ہے اور رات کے دھندلکے میں ایک لمبے لاغر انسان میں بدل جاتا ہے جس کا صرف ایک ہاتھ ہو۔

"تم مجھے نظر انداز نہیں کر سکتے۔" ایک دن لیمپ پوسٹ نے جھک کر میرے داہنے کان میں کہا کیونکہ اب میں اسی کان سے کچھ سن پاتا ہوں۔ میں نے مضطرب ہو کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ کہیں

کسی نے دیکھ لیا تو؟ جانے وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کر بیٹھے۔

"اور تم اتنے حیران کیوں ہو؟"

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم کوئی زندہ چیز نہیں ہو۔ تم اس طرح جھک نہیں سکتے، نہ بات کر سکتے ہو۔ یہ تو ایک بالکل ہی غیر حقیقی بات ہے۔"

"میں جھک تو گیا ہوں،" کھمبے نے کہا۔

مگر وہ تن کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے کیونکہ چینی دندان ساز شا ئنگ فو اپنے رکشا میں واپس لوٹتا نظر آتا ہے۔ یہ شا ئنگ فو ہے جس نے میرے تمام غیر ضروری دانت نکالے ہیں اور تمام غیر ضروری دانت لگائے بھی ہیں جن کے پیچھے میرا کافی وقت صرف ہوتا ہے اور جنھوں نے، ایک طرح سے دیکھا جائے تو، نفسیاتی طور پر مجھے شا ئنگ فو کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں وہ واحد دندان ساز ہے۔ شاید مجھے کسی بی ڈی ایس سے رجوع کرنا چاہیے۔ اب اس طرح کے تعلیم یافتہ ڈاکٹر آنے لگے ہیں، اگرچہ چینی دندان سازوں کی ساکھ ابھی کم نہیں ہوئی ہے۔ شا ئنگ فو نشے میں ہے۔ وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے بڑے سے گھر کا لکڑی کا سرخ پھاٹک کھلتا ہے اور وہ رکشا کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے۔ اب یہ رکشا کل صبح ہی نکلنے والا ہے۔

"شا ئنگ فو بے اولاد ہے،" کھمبے نے مجھ سے سرگوشی کی ہے۔ "اور اس کی بیوی اس سے عمر میں دس سال بڑی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا؟"

"وہ شہر کا واحد چینی باشندہ ہے۔ تمھیں اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے؟"

"ارے ہاں، بالکل تمھاری طرح وہ بھی اپنا ایک اینٹیک ویلیو (antique value) رکھتا ہے۔" میں ہنستا ہوں۔ "مجھے تمھاری ہمدردی سمجھ میں آتی ہے۔"

اور اس سے پہلے کہ کھمبا کوئی جواب دے، میں اپنے گھر کی طرف چل دیتا ہوں۔ گھر کے دروازے پر میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ کھمبا سنسان سڑک پر اداس کھڑا ہے اور شا ئنگ فو کی کوٹھی میں اوپر کا ایک کمرہ روشن ہو گیا ہے۔

دن کے وقت یہ کھمبا کس قدر بدنما اور غیر ضروری دکھائی دیتا ہے۔ پان کھانے والے اس پر

Scanned with CamScanner

انگلیوں کا چونا صاف کرتے ہیں اور جنسی امراض کے ماہر اس پر اپنے اشتہار چپکاتے ہیں، جبکہ سڑک پار شانگ فو کی کوٹھی اس کھمبے کی طرح قدیم ہوتے ہوئے بھی اس پر رنگ و روغن جاری ہے۔ حال ہی میں اس کی دوسری منزل پر واقع کھپریل کے ایک چھپر کے اوپر ایک مرغ بادنما نصب کیا گیا ہے جسے شانگ فو کے رشتے داروں نے منچوریا سے بھیجا ہے، جہاں وہ سویابین کی کاشت کرتے ہیں۔

''میں نے ایک پورا دور دیکھا ہے۔ میں نے انگریزی دور حکومت میں ہندوستانی فوج کو مارچ کرتے ہوئے برما کے محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے،'' کھمبا مجھے بتا رہا ہے۔ ''اور میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے جب عادی مجرم اور پاگل لوہے کے کڑے پہنا کر سڑک پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔''

''مجھے ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟'' میں کہتا ہوں۔ ''تم وہی باتیں کہہ رہے ہو جو سب جانتے ہیں۔''

''میں نے بنگال کے دونوں قحط دیکھے ہیں۔''

''آہ!'' میں مایوسی سے سر ہلاتا ہوں۔ ''تم سے بات کرنا بے کار ہے۔''

کھمبا چپ ہو جاتا ہے۔ ایک چیل آ کر اس کی بریکٹ پر بیٹھ گئی ہے۔ بریکٹ کمزور ہے۔ وہ بہت مشکل سے پرندے کا بوجھ سنبھال پا رہی ہے۔ پرندے کو آرام نہیں ملتا۔ وہ اڑ کر شانگ فو کی کوٹھی کے مرغ بادنما کی طرف چلا جاتا ہے جو واپس لوٹتے ہوئے مون سون کے سبب گھڑی کے رخ پر چکر لگا رہا ہے۔

''یہ شانگ فو، یہ میرے سامنے پیدا ہوا،'' آخر کار کھمبا کہہ اٹھتا ہے۔

''یہ ہوئی نا کوئی بات!'' میں سرتاپا توجہ بن جاتا ہوں۔

''اس کا باپ بل کا انچی تھا،'' کھمبا کہتا رہا۔ ''وہ شنگھائی سے زبردستی پانی کے جہاز پر مزدور بنا کر لایا گیا تھا۔ مگر خضر پور کی بندرگاہ میں وہ اس چینی جہاز سے بھاگ نکلا۔ اس کے بڑے سے چہرے پر ایک اکلوتا تل تھا جس سے دو لانبے بال نکلے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں تھیں ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ نظر نہیں آتی تھیں۔ مگر سب کو پتا تھا اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا آسان کام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی چٹائی پر لیٹا رہتا اور پائپ سے افیم کے کش لگایا کرتا۔''

Scanned with CamScanner

کھمبا پھر دو دن تک خاموش رہتا ہے اور مجھے شک ہونے لگتا ہے ــــ کیا یہ میرا واہمہ تھا؟ کیا سچ مچ میں بڑبڑا رہا ہوں؟

''شاید تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو!'' تیسرے دن میں اسے اکساتا ہوں۔ مگر کھمبا خاموش رہتا ہے۔

''ایسا نہیں کہ میں تمہاری باتوں میں یقین نہیں کرتا،'' میں کہتا ہوں۔ ''مگر تم سمجھ سکتے ہو، میں آج کا انسان تو ہوں نہیں۔ میں نے بھی اس ملک کو تقسیم ہوتے دیکھا ہے، میں نے بھی اس کی سڑکوں پر نفرت پھیلانے والوں کی تعداد کو بڑھتے دیکھا ہے، بلکہ ان میں سے کچھ تو اب ہمارے ملک کے نمائندے بن کر دوسرے ملکوں میں بھی جانے لگے ہیں۔ میں بھی دیکھ سکتا ہوں کہ کس طرح دن بہ دن لوگ نقل و حمل میں استعمال ہونے والے جانوروں کی طرح جینے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔''

''اور تم اس ملک کے قوانین نافذ کرنے والوں کے بارے میں بات نہیں کرو گے؟'' یکایک کھمبا کہہ اٹھتا ہے۔ ''جو اپنے شہریوں کے مقصد تک کو کچل لینا چاہتا ہے۔''

''میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں، میں خود ایک سرکاری دفتر میں اپنی زندگی گزار آیا ہوں۔'' میں شرمندگی سے کہتا ہوں۔ ''لوگوں کے ساتھ سدوہت کرنے کے عمل میں میں بھی برابر کا شریک رہا ہوں۔ اور اب میری حیثیت ایک نا سزا یافتہ مجرم سے بھی بدتر ہے۔ میرے ضمیر پر ایک بڑا بوجھ ہے۔''

''آہ! اور میں تمہیں ایک اچھا انسان سمجھ رہا تھا۔''

میں کھمبے کو اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مگر مجھے معلوم ہے میری زندگی میں ایسا کوئی نادر واقعہ کبھی پیش نہیں آیا جو کسی کے لیے دلچسپی کا حامل ہو۔

میں اس شہر میں پیدا ہوا، بڑا ہوا، نوکری کی، بچے پیدا کیے اور اب پنشن یافتہ ہوں۔ میرے بہی خواہوں اور میری بدگوئی کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو ایک لمبی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان سے مجھے بچنا بھی پڑتا ہے اور گاہے بگاہے مجھے ان کی ضرورت بھی پڑتی رہتی ہے۔ زندگی کے آخری موڑ پر کھڑے ہو کر آپ دیکھتے ہیں آپ کے ساتھ نیا کچھ بھی نہیں ہوتا، سارے رشتے ناتے، واقعات و حادثات خود کو دہراتے رہتے ہیں۔ حافظے کا دیو آپ کو اپنے چنگل میں لیے اڑتا رہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

میرے گھر والوں کا خیال ہے میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بلا وجہ بیمار پڑتا ہوں اور بلا وجہ ٹھیک ہو جاتا ہوں۔ میں ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں اور اب میرے اور بچوں کے درمیان ایک نسل کا فاصلہ ہو چکا ہے۔ میں انھیں افق پر غائب ہوتے دیکھتا رہتا ہوں، بلکہ ان میں سے بہت سارے تو سمندر پار جا چکے ہیں۔ سماج میں رہ کر مجھ سے جن باتوں کی توقع کی جاتی ہے، میں ان میں پورا نہیں اترتا اور مجھے خود اس پر حیرت ہوتی ہے، کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنی زندگی سماج کے مروجہ اصولوں کو دھیان میں رکھ کر گزاری ہے۔ میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر کھڑکی کے رخ لیٹا آسمان کی طرف تاکتا رہتا ہوں جس میں شاہ تنگ فو کا مرغ باد نما اونچا چکر لگاتا رہتا ہے۔ میری کتابوں کی الماری کے شیشے دھندلے پڑ چکے ہیں، اس پر لگے ہوئے قفل پر زنگ چڑھ چکا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بہتیری کتابوں کو میں نے چھوا تک نہیں ہے جبکہ ایک وقت تھا میں ان کی تلاش میں ٹرین اور بسوں میں میلوں کی مسافت طے کیا کرتا تھا۔ ہر سال نہ جانے کون میری مغربی دیوار پر ایک کیلنڈر ٹانگ جاتا ہے۔ اس بات سے لاپروا کہ مجھے اب اس کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ کیلنڈر ہوا کی زد میں آ کر دیوار کے پلستر پر ایک نیم بیضوی لکیر کھینچ ڈالتا ہے اور دن بہ دن اسے کسی زخم کی طرح گہرا کرتا جاتا ہے۔ کبھی کبھار میں چونک کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ کون ہوں میں؟ اس سیارے پر میرا کام کیا ہے؟ جانے کتنا وقت لگ جاتا ہے تب جا کر میں اس قابل ہو پاتا ہوں کہ زمان و مکاں کے نظام میں خود کو دریافت کر سکوں۔ اس بار سردی زوروں کی آئی ہے۔ میں ایک لمبی بیماری کا شکار ہو جاتا ہوں۔ موسم سرما عمر دراز لوگوں کے لیے دوسری دنیا کی طرف کوچ کرنے کا موسم ہوتا ہے۔ کیا میں اس سفر کے لیے تیار ہوں؟ میرے جسم کی ہڈیاں سوکھ چکی ہیں۔ مجھے ٹھنڈ کے خلاف بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اکثر میرے نہ چاہنے پر بھی میری کھڑکی میں کہرا ابھر جاتا ہے۔ میرے گھر والے مجھ سے پریشان ہیں۔ میں انھیں اپنی کھڑکی بند کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کبھی جب مرغ باد نما کہرے میں تحلیل ہو کر نظر سے غائب ہو جاتا ہے تو مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ میں اپنی عینک ڈھونڈ کر اس کے اندر سے آسمان کا جائزہ لیتا ہوں۔ وہ مجھے کہیں گردش کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ پھر نظر آنے لگتا ہے۔ وہ بہت دھیمی رفتار سے چکر لگا رہا ہے، شاید گھڑی کے رخ پر... نہیں، شاید گھڑی کے مخالف۔ ہاں وہ گھڑی کے مخالف چکر لگا رہا ہے۔ پھر وہ غائب ہو جاتا ہے مگر اب مجھے اطمینان ہے۔ میں بستر پر

Scanned with CamScanner

لیٹ کر چین کی سانس لیتا ہوں۔ لحاف اور کمبل اپنی رطوبت بھری ناک تک کھینچ کر مسکراتا ہوں۔ اگر اس جاڑے سے گزر پایا تو شاید دوبارہ شانگ فو کے کلینک جاؤں۔ میرے کچھ اور دانت ہل رہے ہیں۔ شاید اس بار شانگ فو میرے دانتوں کے ساتھ کوئی چمتکار کر سکے۔ دنیا کتنی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ سائنس الہ دین کے جن کی طرح انسان کو اپنی ہتھیلی پر لیے اڑ رہی ہے، اس کی ہر خواہش پوری کرتی جا رہی ہے۔ اگلے سو سال کے اندر ہمارے لیے کرنے کو کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔ ہماری حیثیت ایک تماش بین سے زیادہ کی نہ ہوگی۔

سردی میں کمی آگئی ہے۔ دوسرے تمام عمر دراز لوگوں کی طرح میری بھی طبیعت سدھرنے لگی ہے۔ ایک عرصے کے بعد میں گہری نیند سویا ہوں اور اب رات ہو چکی ہے۔ رات صاف ہے، کہیں پر کہرے کا نام و نشان نہیں۔ کھڑکی سے آسمان دکھائی دے رہا ہے جس میں تارے روشن ہیں۔ میرے لیے گرم سوپ لایا جاتا ہے۔ میں پیٹ بھر کر پیتا ہوں۔ پھر سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید یہ آدھی رات کا وقت ہے جب میں اپنے بستر سے اتر کر دو چار قدم چلتا ہوں۔ اس سے زیادہ تازہ دم میں نے زندگی میں کبھی خود کو نہ محسوس کیا ہوگا۔ میں کمبل کو اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ میرے سب سے چھوٹے بیٹے کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ اپنے کمپیوٹر پر کچھ پرنٹ کر رہا ہے۔ وہ کبھی شاعر بننا چاہتا تھا۔ وہ شاعر اس کے اندر جانے کہاں گم ہو گیا۔ کچے آنگن سے گزر کر میں صدر دروازہ کھولتا ہوں اور اب میں باہر فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا۔ سڑک پر شانگ فو کا گھر تاریک پڑا ہے۔ چاند کرۂ ارض کے دوسرے نصف پر چمک رہا ہوگا جسے دھوپ میں لوگ دیکھ نہ پا رہے ہوں گے۔ اس پوری سڑک پر صرف میرے کمرے کی کھڑکی سے روشنی کا ایک مثلث فٹ پاتھ سے گزر کر سڑک پر گر رہا ہے۔ میری کھڑکی کے نیچے ایک متروک سنگ میل ہے جس پر بچے دن کے وقت کرکٹ کھیلتے ہیں اور رات کے وقت میں بیٹھتا ہوں۔ میں اس پر بیٹھ کر (میں اپنے کولھوں میں اس کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں) سامنے کھڑے لیمپ پوسٹ کی طرف تاکتا ہوں۔ اس کا ہیولا مجھے دکھائی دیتا ہے۔ میں سڑک پار شانگ فو کی بالائی منزل کے چھپر کو تاکتا ہوں۔ مرغ بادنما گھر کے خاکے سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ اگر تارے کچھ اور روشن ہوتے!

ہوا بند ہے۔ سڑک کی دونوں جانب دور تک ایک بھی انسانی سایہ نہیں۔ کل ملا کر یہ میری

Scanned with CamScanner

زندگی کی ایک اچھی رات ہے۔ اور جب میں یہ سوچ رہا ہوں، مجھے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ دو آدمی اپنے کندھوں پر ایک سیڑھی سنبھالے ہوئے ایک اُجالیے اور کنستر کے ساتھ میرے سامنے سے گزرتے ہیں۔ دونوں اپنے اُجالیے کی روشنی میں مسکرا کر میری طرف تاکتے ہیں اور کھمبے سے سیڑھی ٹکا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

''لیمپ جلانے والے...'' میں حیرانی سے سوچتا ہوں مگر سنگ میل پر بیٹھا رہتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں، پہلا آدمی سیڑھی پر چڑھ کر بریکٹ تک پہنچ گیا ہے، دوسرا اسے کنستر تھما رہا ہے... اور تب، میرے خدا! میں اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ پہلی بار میں دیکھتا ہوں کہ لیمپ پوسٹ کی بریکٹ سے ایک لیمپ لٹک رہا ہے جس کے اندر وہ پیرافین انڈیل رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کو پیرافین کا کنستر واپس دے کر اُجالیہ لے لیتا ہے اور تب وہ واقعہ ہوتا ہے جو اس کہانی کا اہم موڑ ہے۔ لیمپ اپنے رنگین شیشوں کے اندر جل اٹھتا ہے۔ سیڑھی ہٹالی جاتی ہے اور وہ دونوں سیڑھی کندھوں سے لٹکائے واپس لوٹتے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر دوبارہ مسکراتے ہیں اور سڑک پر چلتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔

ایک پل کے لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ مگر میرے یقین نہ کرنے پر بھی لیمپ پوسٹ کی روشنی سڑک پر پھیل رہی ہے اور آس پاس کی دیواروں پر جاگتی ہے۔ میں لیمپ پوسٹ کے پاس جاتا ہوں۔

کیا واقعی! میں ششدر سا لیمپ پوسٹ کو جلتے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس میں سفید، ہرے اور نیلے شیشے لگے ہیں۔ اندر فیتہ خاصی لمبی لو دے رہا ہے جس نے اپنے دندانے دار بیرم کے سبب ماہی دم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ لیمپ فلزکاری ایک نادر نمونہ ہے جس کے بالائی سرے کی مجوف سطح کو انگلستانی تاج کی شکل دے دی گئی ہے۔

''ہاں!'' لیمپ پوسٹ کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ ''یہ میری زندگی کی ایک اچھی رات ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے سب کچھ صحیح سمت کی طرف لوٹ رہا ہے۔''

''مجھے سوچنے دو،'' میں کہتا ہوں۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے سڑک کی دونوں جانب دور تک قدیم دور کے یہ دو رویہ لیمپ روشن دکھائی دیتے ہیں۔ اسی درمیان آسمان پر کچھ نئے تارے بھی، بڑی

Scanned with CamScanner

تعداد میں آگئے ہیں جن کی روشنی میں شاشگ فو کا مرئی بادنما نظر آنے لگا ہے۔ مجھے اپنی رگوں میں گرم خوں دوڑتا سنائی دیتا ہے۔ ''کیا یہ ممکن ہے؟''

''بالکل!'' لیمپ پوسٹ وثوق کے ساتھ کہتا ہے۔ ''اچھے دنوں کی شروعات کبھی بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھو ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا صحیح سمجھ پا رہے ہیں۔''

''وہ تو ہے۔'' میں کھمبے پر اپنے دونوں ہاتھ ٹکا کر اوپر تاکتا ہوں جہاں لیمپ اپنے شیشوں کے اندر جل رہا ہے اور اس کے پس منظر میں تارے محدب آسمان پر اپنے جاوداں سفر پر رواں ہیں۔

''اور میں سمجھ رہا تھا یہ میری زندگی کی آخری سردی ہے۔ واقعی یہ ایک نئی شروعات ہے۔ ابھی سفر کا موسم نہیں آیا۔''

''تم سفر کے بارے میں سوچ کیسے سکتے ہو؟'' لیمپ پوسٹ کی آواز میں ہمدردی ہے۔ ''ایک نئی دنیا کے لیے خود کو تیار کر لو۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ ابھی امکانات نے اپنے تمام دروازے کھولے ہی کہاں ہیں۔''

''شکریہ!'' میں مسکراتا ہوں اور لیمپ کی مدھم روشنی میں سڑک پر چلنے لگتا ہوں۔ میں اس روشنی کے حلقے کے آخری سرے سے لوٹ آتا ہوں، اسے آنکھوں میں بھر کر کھڑا رہتا ہوں۔ آنکھیں کھول کر مسکراتا ہوں۔

''واقعی امکانات نے اپنے کچھ دروازے کھولے تو ہیں۔''

رات کا باقی حصہ میں سنگ میل پر بیٹھ کر گزار دیتا ہوں۔ میری آنکھیں لیمپ پوسٹ کے رنگین شیشوں سے ہٹتی ہی نہیں... یہاں تک کہ کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دیتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں لوٹتا ہوں اور بڑی گہری نیند سو جاتا ہوں۔ دن کا بڑا حصہ بیت چکا ہے جب میں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ سورج آسمان پر نہیں ہے۔ میں کھڑکی کے باہر تاکتا ہوں۔ کہرا سڑک پر ادھر سے ادھر پھیل رہا ہے۔ میری غشی ابھی دور نہیں ہوئی ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ میں رات کے واقعے کو یاد کر کے مسکرانا چاہتا ہوں، لیکن مسکرا نہیں پاتا۔ میں اولین ضروریات سے فراغت پا کر باہر سڑک پر آتا ہوں اور میری نظر لیمپ پوسٹ کی طرف اٹھ جاتی ہے جو اب وہاں نہیں ہے۔ اب اس جگہ پر ایک اونچے بجلی کا کھمبا ری کے سہارے کھڑا کیا جا رہا ہے۔ میں گھبرا کر سڑک پر دور تک نظر دوڑاتا

Scanned with CamScanner

ہوں۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں دیکھ لیا ہے؟ مگر سڑک پر تا حدِ نظر اسی طرح کے کھمبے کھڑے ہیں یا نصب کیے جا رہے ہیں۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" میں ایک رسی کھینچنے والے سے پوچھتا ہوں۔ وہ ایک ان پڑھ مزدور ہے۔ وہ میری بات سمجھ نہیں پاتا۔

"بس دو دن کی بات ہے جناب، پھر آپ لوگوں کو یہاں رات کی جگہ دن دکھائی دے گا۔"

ایک خوش پوش اوورسیئر مداخلت کرتا ہے۔ اور تب مجھے پرانا لیمپ پوسٹ زمین پر پڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بریکٹ اس کے برابر رکھی ہوئی ہے۔

"یہ کیا کیا تم نے؟" میں اس سفید پوش شخص سے کہتا ہوں جو کام کی نگرانی کر رہا ہے۔ "یہ فیصلہ لینے والے تم لوگ ہوتے کون ہو؟ ہم سے ہماری راتوں کو چھیننے کا حق تمھیں کس نے دیا؟"

وہ شخص کچھ نہ سمجھ کر سر ہلاتا ہے مگر احتراماً خاموش رہتا ہے۔ میں جھک کر گرے ہوئے کھمبے پر اپنی ہمدردانہ انگلیاں رکھتا ہوں۔

"خداحافظ!" کھمبے نے مجھ سے سرگوشی کی ہے۔ "اپنے آنسوؤں پر قابو رکھو۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔"

"اسے نہ چھونا!" مجھے اوورسیئر کی تنبیہ سنائی دیتی ہے۔ "یہ سرکاری پراپرٹی ہے۔"

"خداحافظ!" میں کھمبے کو جواب دیتا ہوں اور مڑ کر اوورسیئر سے مخاطب ہوتا ہوں۔ "تم اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جاؤ گے۔"

وہ لوگ بجلی کے کھمبے کو گاڑ کر پرانا کھمبا ٹرک میں لاد کر چلے گئے ہیں۔ صرف ایک راج مستری مزدور کی مدد سے اس کی بنیاد کو سیمنٹ ریت اور کنکریٹ سے بھر رہا ہے۔ سورج نے بادل کے کناروں سے ایک پل کے لیے جھانکا ہے اور مجھے لیمپ پوسٹ کے سنگِ میل پر بیٹھا پایا ہے۔ شانگ نو کا مرغ بادنما تیزی سے چکر لگا رہا ہے، جیسے اس پر دورہ پڑ گیا ہو۔ دو رویہ گھروں کے باورچی خانوں کا دھواں کہرے میں ملنے لگا ہے۔ اس سڑک پر شام کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ میری بائیں پسلیوں میں ایک ٹیس ابھرتی ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں لوٹتا ہوں۔ دو دن تک یہ درد مجھے بے چین رکھتا ہے۔ میں نے اس بارے میں کسی کو بتایا نہیں ہے۔ تیسری رات مجھے گہری نیند آ جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہے۔ یوں مجھے لگتا ہے میں اس نیند سے کبھی جاگ نہ پاؤں گا۔ میں خواب میں لیمپ پوسٹ کو دیکھتا ہوں جس سے میٹ بھاری ٹپ رہا ہے۔ میں شانگ فو کے باپ کو بھی دیکھتا ہوں جو چٹائی پر لیٹا ہوا پائپ پی رہا ہے۔

"یہ سب اپنے اپنے کرم کا پھل ہے،" وہ کہتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں وہ اپنی بغیر آنکھوں والی آنکھوں سے مجھے تاک رہا ہے۔

ایک نشے کے بعد میں سڑک پر آتا ہوں۔ سنگ میل اپنی جگہ پر نصب ہے۔ مرغ بادنما سرخ آسمان کے نیچے دھیرے دھیرے چکر لگا رہا ہے۔ نئے لیمپ پوسٹ کے نیچے بچے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ میں سنگ میل پر بیٹھا بیٹھا دن کو دم توڑتے دیکھ رہا ہوں۔ اندھیرا اچھا خاصا پھیل چکا ہے جب مجھ پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ لڑکے کرکٹ کھیل کر جا چکے ہیں اور میں اکیلا سنگ میل پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کوئی راہگیر اندھیرے میں مجھ سے ٹکرا نہ جائے۔ شانگ فو کی کوٹھی کی بالائی منزل کی کھڑکیاں روشن ہوگئی ہیں۔ کہرا شہر کی کثافت کے ساتھ مل کر گھنا اور گہرا ہوگیا ہے۔ ابھی میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی ہے کہ لیمپ پوسٹ کی چوٹی پر ایک جلی، یرقان زدہ روشنی جاگ اٹھتی ہے۔ میں اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔ دھیرے دھیرے لیمپ کی روشنی میں شدت آجاتی ہے اور آخرکار یہ پوری آب و تاب کے ساتھ جل اٹھتا ہے۔ کہرے کے باوجود یہ لیمپ ہر شے کو اپنی حیرت انگیز روشنی کی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ کتنی بے باکی سے ہر دیوار پر اپنی پیلی یرقان زدہ روشنی پھیلا رہا ہے، یہاں تک کہ شانگ فو کا مرغ بادنما بھی اس میں صاف نظر آ رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں شہر کی کسی اجنبی سڑک پر چلا آیا ہوں۔ میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے چلا جاتا ہوں۔ یہ ایک بہت بڑا سوڈیم لیمپ ہے اور کم از کم پچیس فیٹ کی اونچائی پر ہونے کے باوجود اس کی پیلی روشنی اتنی تیز ہے کہ میں اپنے ہاتھ کی لکیروں کو بھی پڑھ سکتا ہوں۔

"ہیلو لیمپ پوسٹ، کیسے ہو؟"

میں کھمبے پر ہاتھ رکھ کر اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔ لیمپ پوسٹ کسی دیو کی طرح کھڑا اپنے غفرتی لیمپ کی واحد آنکھ سے میری طرف سرد مہری سے تاک رہا ہے۔ اس کی روشنی زرد سیال کی طرح میری آنکھوں میں بھر رہی ہے۔ وہ میری بات کا جواب نہیں دیتا۔ شاید اسے ایک بہت بڑے رتبے پر

روشنی پھیلانی پڑتی ہے اور میرے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہے۔

میں شکست خوردہ گھر کے اندر لوٹتا ہوں۔ سوڈیم ویپر لیمپ کی زردی مل روشنی میرے کمرے میں بھر گئی ہے اور کمرہ اجنبی دکھائی پڑ رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس جاتا ہوں، ایک نظر نئے لیمپ پوسٹ پر ڈالتا ہوں، دوسری نظر مرغ بادنما کی طرف دوڑاتا ہوں جو اتنی دوری کے باوجود صاف گردش کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ آہ! اب اس کا اسرار ختم ہو چکا ہے۔ میں کھڑکی کے دونوں کواڑ سختی سے بند کر کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔

آنکھیں بند کرتے ہی مجھے پرانا لیمپ پوسٹ دکھائی دیتا ہے جس کے سامنے سے لیمپ جلانے والے سیڑھی اٹھائے ہوئے گزر رہے ہیں۔ میں بھکاری وبھی دیکھتا ہوں جو لیمپ پوسٹ سے لٹک رہا ہے اور جس کے دونوں ہاتھ ایڑیوں تک لانبے ہو گئے ہیں۔ اور پھر مجھے ناٹک فوٹو ماپ دکھائی دیتا ہے جو ایک پتلی چٹائی پر لیٹا ہوا پنکھا جھل رہا ہے۔

"یہ سب اپنے اپنے کرم کا پھل ہے۔" وہ افیم کی تلی سے منہ بنا کر کہتا ہے۔

٭٭

صدیق عالم

کبھی دو پیر فرتوت

Sleeping as quiet as death, side by wrinkled side, toothless salt and brown, like two old kippers in a box.
Dylan Thomas : Under Milk Wood

بہت عرصہ نہیں گزرا کہ کلکتہ کے ایک پبلک پارک میں دو پنشن یافتہ بوڑھوں کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ چھ برس پہلے دو مختلف تاریخوں میں دونوں سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوئے تھے اور تب سے تاریخ ان دونوں کو اس دن کے لیے تیار کر رہی تھی جب دونوں ایک ہی بنچ پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے پائے جائیں۔

بظاہر دونوں بوڑھے اپنی اپنی زندگی جی چکے تھے اور اب اپنے بچے کھچے لمحوں کا مصرف نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر عمر کے اس آخری مقام پر پہنچ کر بھی دونوں میں قطبین کا تضاد تھا۔

پہلا بوڑھا گذشتہ چھ برسوں سے، یعنی جب سے وہ ریٹائر ہوا تھا، بشرطیکہ وہ کلکتہ سے غیر حاضر نہ ہو، ہر شام باقاعدہ پارک کے اندر گھاس کے میدان کے کنارے استادہ لکڑی یا سیمنٹ کے بنچوں کی قطار میں کسی نہ کسی بنچ پر دکھائی دیتا آرہا تھا۔ وہ بہت کم گو تھا اور جب وہ بنچ پر بیٹھتا تو اپنی چھتری کو دونوں ٹانگوں کے بیچ رکھ کر اس کے عمودی حصے پر ٹھوڑی ٹکا دیتا۔ عموماً وہ کسی دور افتادہ خالی بنچ کو ترجیح

دیتا۔ مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ تقریباً ہر بنچ پر لوگ قابض ہوتے۔ اس صورت میں وہ اس پر اکتفا کرتا جس پر کم سے کم تعداد میں لوگ بیٹھے ہوں اور وہ اس کے کنارے اس طرح دبک کر بیٹھ جاتا جیسے مخاطب کیے جانے پر وقت ضائع کیے بغیر چھتری اُٹھا کر چل پڑے گا۔ ان چھ برسوں میں اس کی داہنی آنکھ کا آپریشن ہو چکا تھا اور اس کی بھنوؤں کے بہت سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کی چندیا صاف تھی اور اکثر شام کی پیلی پھیکی دھوپ میں وہ کسی لاش کے مانند نظر آتا جو قریب واقع میڈیکل کالج کے مردہ گھر سے سڑک پار کر کے یہاں چلی آئی ہو۔ کل ملا کر اس کا چہرہ کسی پنشن یافتہ مثالی سرکاری نوکر کی طرح تھا جو اپنا سب کچھ آفس کے احاطے کے اندر چھوڑ آیا ہو۔

دوسرا بوڑھا، چونکہ وہ ریلوے کی سروس سے سبکدوش ہوا تھا، اس لیے اسے سال میں دو پاس مل جاتے اور وہ اندرون ملک کی سیر کرنے نکل جاتا۔ جوانی کے آخری دور میں جوئے کی لت نے اسے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ مگر حال کے برسوں میں وہ زیادہ تر مذہبی مقامات (بنارس، پوری، تارکیشور وغیرہ) کا رخ کرنے لگا تھا۔ اس نے پوری کے ایک آشرم میں کٹیا بھی خرید رکھی تھی، باقی کی عمر وہاں سکون سے گزارنے کے لیے۔ مگر فی الحال وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں ہو پایا تھا، اس لیے وہ اپنے شب و روز اخبارات کی ورق گردانی کرنے، اپنی عمارت کے باہر چبوترے پر بیٹھے رہنے اور اونگھنے میں گزارا کرتا یا پبلک پارک کا رخ کرتا۔ اکثر اونگھنے کی حالت میں لاشعوری طور پر وہ خود کو اتی پوڈیز* پر کھڑا پاتا جہاں اس کے چاروں اطراف بحرالکاہل کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہوتیں۔ مگر ان موجوں پر بھی ریس کورس کے گھوڑے تیر رہے ہوتے یا تاش کے جوکر کشتیوں پر چپو چلا رہے ہوتے یا گرداب رولیٹ** کی شکل میں چکر لگاتے ہوئے اس کا پیچھا کرتے۔ یہ اتی پوڈیز اسکول کے دنوں سے اس کے ذہن میں بس گئے تھے جب جغرافیہ کے استاد نے اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں زمین کی صحیح شکل واضح کرنے کے لیے ایک گلوب کا سہارا لیا تھا۔

ایک شام جب سورج تھکا ہارا، پارک کی چہار دیواری کے باہر لگائے گئے کدم اور کرنج کے پیڑوں کے اوپر آخری دم لے رہا تھا اس نے گلو تھنے سے ایک بچے کو دیکھا جو آیا کے ساتھ گھاس کے میدان سے گزر رہا تھا۔ بچہ جانے کیوں ان دونوں کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہنس پڑا اور دور تک مڑ مڑ کر ہنستا رہا۔ پہلا بوڑھا اس بچے کی ہنسی کے معمے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے ایک اور ہنسی کی آواز

Scanned with CamScanner

سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ اسی کا ہم عمر ایک آدمی تھا جو بنچ کے دوسرے کنارے بیٹھا تھا۔

"وہ کیوں ہنس رہا تھا؟" اپنی مرضی کے خلاف بوڑھے نے پوچھ لیا، گرچہ اس بچے کی ہنسی سے زیادہ اپنے ہم عمر کی ہنسی اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے یہ دیکھ کر کہ ہم دونوں کتنے بوڑھے ہیں۔" اس کے ہم عمر نے جواب دیا اور ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میں اس بچے کی عمر کا ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔" بوڑھے نے خود بخود بچے کی طرفداری شروع کر دی۔ "اور بوڑھے بھلا ہوتے بھی کس لیے ہیں؟" اسے اپنے آخری جملے کی فراخدلی پر خود اسے حیرت ہوئی۔

"ہم تم جیسے رنگین بوڑھوں میں ہنسنے کے لیے، اور کس لیے۔" اس کا ہم عمر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر اس نے اپنی ہنسی روک دی اور اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ "ایک راز کی بات بتاؤ۔ کیا تم مرنے کے بعد اپنے پوسٹ مارٹم کی اجازت دو گے؟"

"عجیب سوال ہے۔ اس وقت میں انہیں روکنے کے لیے زندہ کب رہوں گا؟"

"وصیت نامے کے ذریعے تم اس سلسلے میں ان کی رہنمائی تو کر ہی سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے اگر موت کے حالات نارمل رہیں تو۔"

"ارے ٹھیک ہے، تب کا تب دیکھا جائے گا۔" بوڑھے نے ٹالنے کے لیے کہا۔ مگر اسے اندر ہی اندر اس سوال نے مضطرب کر دیا تھا۔ پل بھر کے لیے وہ وسیع و عریض میدان کی طرف تاکتا رہا جس پر موسم گرما میں سرکس کے شامیانے اور تنبو تنتے۔ چارے کے باہر رنگین کارڈ بورڈ کے ڈبوں کی طرح ایک ترتیب سے جیسے ابھی کوئی تماشا شروع ہونے والا ہے گا اور نہیں رہیں دور کر دے گا۔

"تو بھی وہ چپ کیوں رہا تھا؟" اس نے سوچا۔

بعد میں اسے یہ سوچ کر تعجب ہوتا۔ وہ اس اجنبی سے اتنی ساری باتیں کہہ گیا تھا جو اس کی کسی بات سے قطعی طور پر مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ مگر کچھ بڑے پراسرار طور پر دوسری شام بھی اس کی ملاقات ہوئی اور تیسری شام بھی۔ پھر ہر شام ان کی ملاقات ہونے لگی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کا نام نہیں پوچھا تھا اور نہ وہ اپنے ذاتی معاملات پر گفتگو کرتے تھے، اور یہ اچھا

تھا۔ اس طرح بہت سارے تکلیف دہ موضوعات سے احتراز کیا جا سکتا تھا۔

"تم ہمیشہ یہ چھتری لیے ہوئے کیوں نظر آتے ہو؟" ایک دن دوسرے بوڑھے نے پوچھ لیا، "جبکہ موسم اچھا جا رہا ہے۔"

"اپنی چھتری کے بغیر میں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہوں،" بوڑھے نے ناخوشگواری کے ساتھ کہا۔ "دراصل ساری زندگی میں اسے ڈھوتا آیا ہوں اور اب اس سے احتراز میرے لیے ممکن نہیں۔"

"ایک چھتری سے تم تحفظ کی کون سی امید رکھ سکتے ہو؟"

"کیوں!" بوڑھے نے تنک کر کہا۔ "دھوپ اور بارش کا ذکر نہ بھی کروں تو بھی اس کے بہت سارے فائدے ہیں۔ فرض کر لو ہم لوگ اس بنچ پر بیٹھے ہیں اور ایک سانپ گھاس کے اندر سے رینگ کر ہماری ٹانگوں کے درمیان نکل آیا ہو۔ ہم اس سے اپنا دفاع تو کر ہی سکتے ہیں۔ یا یوں سمجھ لو کہ ایک رات تمہیں لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے اور تم وقت بچانے کے لیے کارمائیکل ہاسپٹل کا راستہ اپنا لیتے ہو جہاں تمہیں فٹ پاتھ پر ایک لاش پڑی ملتی ہے۔ تم اس چھتری کی نوک سے چھو کر دیکھ تو سکتے ہو کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔ اور سچ پوچھو تو مجھے یاد نہیں میں نے کتنی بار خود کو اس کے سہارے آوارہ کتوں کے حملوں سے بچایا ہے۔"

"بہت خوب، اور پھر اس چھتری کا ایک اور فائدہ بھی تو ہے۔" دوسرے بوڑھے کو اپنی ہنسی روکنے میں شدید محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ "تم بنچ پر بیٹھے ہو کہ تم دیکھتے ہو ایک ایسے آدمی کا سامنا ہو جانے کا خدشہ ہے جس سے تم ملنا نہیں چاہتے اور تم چھتری کھول کر آرام سے اس کے پیچھے دبک لیتے ہو۔ ہے نا یہ کمال کی بات! ہاہا!" وہ معمول کے مطابق کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

"تم سرکس میں جوکر رہ چکے ہو کیا؟"

"نہیں، میں بارہ سال تک کلکتہ میں ہوگلی ندی کا کیچڑ چھانتا رہا ہوں،" بوڑھے نے جوابی تمسخر کیا۔

پارک کے اندر سیر کے لیے وقف وسیع و عریض میدان کے تین اطراف فینسنگ والی تھی جس سے لگے گھنے یا آم جیسے پیڑوں (بادام، گل مہر، اشوک، چھتیان، نارنگی) کی قطار۔ ان پیڑوں کے

بیچ مناسب فاصلوں پر سیمنٹ یا لکڑی کے بنچ زمین پر آڑے ترچھے نصب تھے۔ سیر کرنے والوں کے لیے پارک کے اندر میدان کو چاروں اطراف سے گھیر کر تارکول کی ایک سڑک بچھائی گئی تھی۔ جب رات کی روشنیاں باہر کی عمارتوں کو اندر سے جگمگا دیتیں تو دو ایک جگہ کارپوریشن کے لگائے گئے ہیلوجن لیمپ کے باوجود میدان نیم تاریکی میں ڈوبنے لگتا جس کا فائدہ لوٹنے کے لیے بہت سارے جوڑے آتے اور گھاس کے دبیز قالین پر بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے وقت گزارتے۔ دونوں بوڑھے لاتعلقی سے ان کی طرف دیکھتے رہتے جیسے جو خرافات وہاں ہو رہی تھی اس سے انھیں کوئی تعلق نہ ہو۔ یوں بھی عرصہ ہوا کہ انھوں نے سماج کی برائیوں پر اپنا ناقدانہ فیصلہ دینا بند کر دیا تھا۔

''زندگی ایک بڑا اکتا دینے والا کھیل ہے،'' ایک دن دوسرے بوڑھے نے فلسفیانہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔ ''اوپر والا بڑا خطرناک اسکورر ہے۔ تم کتنے بھی گول کرو، گول برابر کر دیتا ہے۔ آخر میں تمھیں صفر ہی ہاتھ آتا ہے۔''

''تم کیا مرنے کے بارے میں سوچنے لگے ہو؟''

''مر کر کیا فائدہ ہوگا؟ پیڑ پھل پھول دینا بند کر دے یا اس پر پتے نہ بھی آئیں تو بھی اس کا کھڑا رہنا اچھا ہے۔ ارے اس کے اندر سانپ اور گلہریاں تو پناہ پا ہی سکتے ہیں۔''

دن کی ڈھلتی ہوئی روشنی میں دونوں کی عینکیں اس طرح جل اٹھتیں جیسے گرانڈ ہوٹل کی شو ونڈو سے دو Dummies لا کر ایک دوسرے کے روبرو رکھ دی گئی ہوں۔ پہلا بوڑھا چونکہ دھوتی کرتا پہننے کا عادی تھا اس لیے دوسرے بوڑھے کے مقابلے میں، جو پرانی تراش کی پتلون اور شرٹ پہن کر آتا، زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا۔

''تم جسمانی طور پر اب بھی چست ہو اگر تمھارے کپڑے کی بات مان لی جائے۔ شاید مجھ سے زیادہ لمبی عمر پاؤ گے تم۔''

''بدعا مت دو،'' دوسرے بوڑھے نے کہا۔ ''میرے دادا پچاس تک پہنچتے پہنچتے بستر سے لگ گئے مگر اس کے بعد بھی وہ تیس برس تک زندہ رہے۔ سب کی ناک میں دم کر دیا تھا بڑے میاں نے۔ یہ کہنا مشکل ہے۔''

پھر دوسرے بوڑھے کو ایک ترکیب سوجھی۔ ''کیوں نہ ٹاس کر لیں۔ اگر ہیڈ ہوا تو تم لمبی عمر پاؤ

گے اور نیل ہوا تو میں زیادہ عرصے تک زندہ رہوں گا۔"

اس سے پہلے کہ پہلا بوڑھا کچھ کہتا، اس نے ایک پانچ کا سکہ نکال لیا اور اسے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان تھام کر بوڑھے کی طرف پرامید نظروں سے تاکنے لگا۔

پہلا بوڑھا ایک ٹک اس کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کی پتلیاں ساکت تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ یکایک اس نے دوسرے بوڑھے کی طرف جھک کر کہا

"ہیڈ تم لو، ٹیل میرا رہنے دو۔"

دوسرے بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سکہ ہوا میں اچھالا۔ سکہ اپنے محور پر اوپر اٹھا اور گردش کرتا ہو بنچ کے سامنے گرا اور پھر لڑھکتا ہوا بنچ کے نیچے ہری گھاس کے اندر چلا گیا۔ دونوں بوڑھے بنچ سے اتر کر سکے کو تلاش کرنے لگے۔ سکہ لمبی گھاس کے جنگل میں جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ دوسرا بوڑھا بنچ کے نیچے ہاتھ لے جا کر گھاس کے اندر انگلیاں دوڑانے لگا۔ پہلے بوڑھے نے اسے مدد دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔ دونوں بنچ کے نیچے، اس کے پیچھے اور دونوں طرف سکے کو تلاش کرتے رہے، مگر مٹی زرخیز ہونے کے سبب وہاں اتنی کثرت سے گھاس اگی تھی اور اب دن کی روشنی گھنے پیڑوں کے سبب یہاں اتنی مدھم پڑ گئی تھی کہ سکہ ملنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ پھر بھی دونوں گھاس کے اندر انگلیاں دوڑاتے رہے یہاں تک کہ گیلی مٹی سے ان کی انگلیوں پر دھبے پڑ گئے۔ بنچ کے سامنے سے گزرنے والے حیرت اور دلچسپی کے ساتھ دونوں بوڑھوں کی طرف تاک رہے تھے۔ ان میں سے کچھ تو رک بھی گئے تھے۔

"لگ رہا ہے بوڑھوں کی بتیسی گم ہو گئی ہے،" ایک جوان لڑکے نے فقرہ کسا اور دونوں سکے کی تلاش چھوڑ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ دونوں بنچ کا کنارا تھام کر ہانپ رہے تھے جیسے کوئی لمبی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ پھر دونوں کی نظریں ملیں اور انہیں احساس ہوا کہ واقعی سکے کا گم ہو جانا تو ان کی خواہش کے مطابق ہوا تھا۔ اگر سکہ مل جاتا تو؟ کم از کم اب تو دونوں خوش تھے۔

مگر دوسرے بوڑھے کو تشفی نہیں ہوئی۔

"ہم کوئی دوسرا طریقہ اپنا سکتے ہیں،" اس نے کہا۔

"کیا؟"

Scanned with CamScanner

"وہ آدمی جو ہماری طرف آ رہا ہے ہم اس سے نام پوچھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان ہوا تو تم زیادہ عرصے تک زندہ رہو گے اور اگر ہندو ہوا تو میں۔"

"اور اگر وہ عیسائی نکلا تو؟ اس طرف کی آبادی میں عیسائی بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔" دوسرے بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"پھر تو ہمیں کسی تیسرے کو اپنے کھیل میں شریک کرنا پڑے گا۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں اس سے کیا فائدہ؟ یہ دنیا ہر معاملے میں اتنے خانوں میں بٹی ہے کہ ان کے لیے ہمارے پاس دنیا کے سارے سکے بھی کم پڑ جائیں گے۔"

پہلا بوڑھا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کھیل میں دلچسپی لینے لگا تھا، ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ مگر ہر دوسرے دن اس کی ملاقات تو گویا قسمت کا اٹوٹ فیصلہ بن کر رہ گئی تھی۔ جب وہ اپنی کمزور ٹانگوں اور چھتری کے سہارے اپنے گھر سے پارک کا فاصلہ طے کرتا تو اکثر وہ دوسری طرف واپس جانا چاہتا۔ مگر کوئی ان دیکھی طاقت اسے دوسرے بوڑھے کی طرف، پارک کے اس مخصوص گوشے کی طرف کھینچ کر لے جاتی۔

"تمہیں اس کا اندازہ ہے..." ایک دن دوسرے بوڑھے نے دوبارہ کہا۔ "اپنی باقی زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے ہم اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

"تمہارا ارادہ کیا ہے؟ کیا میں پھر سے کسی کام سے لگ جاؤں؟ یا کسی سماجی تحریک میں شامل ہو جاؤں؟"

"ارے نہیں!" دوسرا بوڑھا مسکرایا۔ "ہماری عمر کے بوڑھے بھلا کس کام کے ہوتے ہیں؟ ہم تو بس جیتے جی ضعیف ہیں۔ مجھے تو ڈارون آشرم بالکل صحیح لگتا ہے جس کے مطابق بوڑھوں کو جنت رسید ہو جانا چاہیے اور چھٹیاں لے لینا چاہیے۔ اس سے دنیا کی بہت ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ نئی دنیا نئے لوگوں کی ملکیت ہو گی۔ یہ خیال کیسا ہے تمہارا؟ میں نے تو آشرم میں ایک کٹیا بھی خرید رکھی ہے۔ بس اس کا ایک حصہ خالی ہے۔ بالکل سمندر کے کنارے ہے یہ۔"

"میں نے اپنا بیٹا ۱۹۴۷ء کے مذہبی فسادوں میں کھو دیا، بلکہ یوں سمجھو آگ میں جھونک دیا۔"

"عجیب بات ہے۔"

"ہاں۔"

"اور تمھیں لگتا ہے اس سے تمھاری آتما کو شانتی ملی ہے؟"

"کم از کم اب اس طرح کے غلیظ واقعات سے اوپر اٹھ کر میں انھیں صحیح صحیح دیکھنے کا عادی تو ضرور ہو گیا ہوں۔"

دوسرا بوڑھا کسی وجہ سے پھر مسکرانے لگا تھا۔

"ایک بات بتاؤں،" اس نے سرگوشی کی۔ "مجھے لگتا ہے ایک بار ہمیں پھر سے کوشش کرنی چاہیے۔ شاید اس بار کوئی نتیجہ نکل آئے۔"

"آخر اس سے ہم میں سے کسی کو کیا فرق پڑ جائے گا؟ پہلے کوئی بھی مرے، دوسرے کے لیے بات ایک ہی ہے۔ جلد یا دیر ہم اپنی اپنی چتا میں ہوں گے۔ پھر بھی اگر تمھاری ضد ہے تو یہی سہی۔"

"ارے نہیں، مذاق نہیں۔ میں تو سنجیدہ ہوں۔ اچھا چلو اسے کچھ دیر کے لیے ٹالتے ہیں۔ جانے کیوں کبھی کبھی مجھے تم سے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

دوپہر کی طرف بارش ہوئی تھی اس لیے کلکتے کی فضا دھل گئی تھی اور آسمان میں اس وقت تارے بڑے بڑے اور روشن دکھائی دے رہے تھے۔ دوسرے بوڑھے نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ شاید وہ کسی نئے فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے انگلی اٹھا کر قطب تارے کی طرف اشارہ کیا جو سورج ڈوبتے ہی طلوع ہو گیا تھا۔

"دیکھ رہے ہو نا، یہ بادام کے دونوں پیڑوں کے بیچ چمک رہا ہے۔ مگر میرا خیال ہے، آدھے گھنٹے کے اندر اندر یہ داہنے پیڑ کی چوٹی پر ہوگا۔ کیوں نہ ہم میدان کا ایک چکر لگا کر لوٹ آئیں؟ اگر تارہ پیڑ کی چوٹی کو چھو نہ سکا تو تم لمبی عمر پاؤ گے۔"

"لمبی عمر کسے چاہیے؟ پھر بھی اگر تمھیں ضد ہے تو یہی سہی۔"

اور دونوں بوڑھے میدان کے کنارے کنارے تارکول کی سڑک پر چل پڑے۔ پہلے بوڑھے کی رفتار ارادی طور پر تیز تھی۔ دوسرا بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے اپنی لمبی پتلی ٹانگوں پر چلتا آ رہا تھا۔

"بڑے تیز چل رہے ہو،" پیچھے سے دوسرے بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے لمبی عمر پا کر ہی رہو گے۔"

''بکواس ہے یہ تو۔'' پہلے بوڑھے نے رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا کیونکہ خود اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی جس سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ''قدرت کے انتظام میں اس طرح کی بکواس سے کیا فرق پڑنے والا ہے؟''

''پھر تم اتنی تیز کیوں بھاگ رہے ہو؟ تم اپنے دل کا کباڑا کر لو گے۔ اپنی بوڑھی عمر کا کچھ تو خیال کرو۔''

''ایک عجیب بلا ہو تم۔'' پہلے بوڑھے نے چلتے چلتے کہا۔ ''تمھیں تو سیاست میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ جگہ تم جیسے گندے لوگوں کے لیے ٹھیک ہے۔''

وہ بغیر پیچھے مڑے چلتا رہا اور اس نے میدان کی نیم روشنی میں آدھا راستہ طے کر لیا۔ دوسرا بوڑھا، جو بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا، بھتی خیز انداز میں سر ہلا رہا تھا۔ پہلا بوڑھا رک گیا اور سانسیں درست کرنے لگا۔

''استاد جیسے چلو گے تو قطب تارا ہاتھ سے جاتا رہے گا۔'' اسے اپنے پیچھے بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

''شٹ اپ! تم چپ نہیں رہ سکتے؟ تمھارے منھ سے بدبو آتی ہے بوڑھے۔''

وہ پھر سے چل پڑا۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کی پسلیوں کے اندر کوئی بھاری ہتھوڑا اچل رہا ہو۔ وہ بار بار آسمان کی طرف تاک رہا تھا۔ اسے تمام ستارے تیزی سے آگے کی طرف نکلتے دکھائی دے رہے تھے جیسے انھوں نے بھی اسے شکست دینے کی ٹھان لی ہو۔ اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، اتنی تیز کہ اس کی چندیا پر پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے نکل آئے۔ اسے اپنے سینے میں ہلکے ہلکے درد کا احساس بھی ہونے لگا جو دیکھتے ہی دیکھتے اتنا زیادہ ہو گیا کہ وہ چھتری کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر بیٹھ گیا اور لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے اس نے فضا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں چاروں طرف پھیلے لوگوں اور روشنیوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتے محسوس کیا۔

دوسرا بوڑھا اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''اتنی تیز دوڑو گے تو یہی حال ہوگا۔ یہ تمھاری صحت کے لیے اچھا نہیں۔ استاد جی، وہ بھی عمر

کے اس آخری دور میں؟''

سینہ مسلتے ہوئے اس نے دوسرے بوڑھے کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا درد کچھ کم ہو رہا تھا۔ کانپتے پیروں سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دور چل کر دوبارہ ختم گیا۔ درد پھر سے جاگنے لگا تھا۔

''چلو چھوڑو بھی اسے۔'' دوسرے بوڑھے نے اس کی پیٹھ کو سہلایا۔ ''بھلا تارا بھی کبھی چلتا ہے۔ وہ سرک کر کسی پیڑ کی چوٹی پر کیوں جانے لگا! یہ تو زمین گردش کرتی ہے جس سے ایسا لگنے لگتا ہے۔''

پہلا بوڑھا تلملا کر رہ گیا۔ اس نے چھتری اٹھا کر اس کی نوک سے دوسرے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ بڑبڑایا۔

''غصہ تھوک دو۔'' دوسرے بوڑھے نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا تمھیں گھر تک چھوڑ آؤں؟''

''بھاڑ میں جاؤ تم!'' پہلے بوڑھے نے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''گھر پہنچنے کے لیے مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت نہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے ہمیں اپنی اس پہچان پر پھر سے غور کر لینا چاہیے۔ شاید ہم ایک دوسرے کے لیے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔''

میدان کے نیم اندھیرے میں چھتری کے سہارے دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ جنوبی پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ دوسرے بوڑھے نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''عجیب بات ہے۔ اگر تارے اپنی جگہ ساکت ہیں تو اس میں میرا کیا قصور!''

دوسرے دن بوڑھے کی خیریت لینے کے لیے وہ وقت سے قبل ہی پہنچ گیا تھا، مگر اس دن پہلا بوڑھا پارک کے اندر دکھائی نہ دیا۔ وہ متواتر دو ہفتوں تک دکھائی نہ دیا گرچہ دوسرے بوڑھے نے تمام بنچوں کو چھان مارا۔ اب تو اس کے اندر احساسِ جرم جاگنے لگا تھا۔ کون جانے، شاید اس عمر کے لیے یہ مذاق صحیح نہ تھا! آخر کار اس سے رہا نہ گیا اور ایک دوپہر وہ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے اسے ہمیشہ جنوبی پھاٹک سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اس لیے وہ پارک کے جنوبی پھاٹک سے باہر نکلا اور ایک کشادہ سڑک پر چلنے لگا۔ وہ اس کشادہ سڑک کے ذیلی راستوں اور گلیوں میں چکراتا پھرا، عمارتوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں میں بوڑھے کو ڈھونڈتا رہا یہاں تک کہ کلکتہ پر رات اتر آئی۔ وہ ایک سہ راہے پر فٹ پاتھ پر کھڑا اطراف و جوانب کی عمارتوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ

Scanned with CamScanner

جانے کہاں سے ایک کتا نکل آیا اور ٹانگ اٹھا کر اس کے جوتوں پر پیشاب کرنے لگا۔ جب تک اسے پتا چلتا بہت دیر ہو چکی تھی۔ کتا جا چکا تھا۔ وہ مفتوح و ناکام، گیلے پیروں کے ساتھ گھر واپس لوٹا۔ اس نے اپنی جرابیں دھوئیں اور انھیں سوکھنے کے لیے بالکنی کی ریلنگ پر لٹکا دیا۔

ہے بھگوان، کہیں وہ مر نہ گیا ہو! اس نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سوچا۔

مگر تین دن کے بعد اچانک پہلا بوڑھا ایک دوسرے بنچ پر ایک دوسرے گوشے میں دکھائی دیا۔ دوسرا بوڑھا اس کی طرف لپکا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچ پاتا پہلے بوڑھے نے اپنی چھتری کھول لی اور اس کی آڑ میں چھپ گیا۔ دوسرا بوڑھا چھتری کے سامنے ٹھہر کر مسکرایا۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"میں اس دن کے واقعے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔"

جواب میں چھتری خاموش رہی۔

"میں نے پرسوں تمھارے علاقے میں تمھیں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر وہ میری بے وقوفی تھی شاید۔ سچ تو یہ ہے مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمھارا علاقہ کون سا ہے، کس سڑک پر اور کتنے نمبر میں رہتے ہو تم۔"

چھتری چپ چاپ تھی۔ دوسرے بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں نے فیصلہ لیا ہے میں آشرم چلا جاؤں گا۔ میں اب اسی لائق رہ گیا ہوں۔ اگر چاہو تو میں آشرم کا پتا دے سکتا ہوں۔ اچھی جگہ ہے، پسند آئے گی تمھیں۔ ایک آدھ ہفتے تم میرا مہمان بن کر رہ سکتے ہو۔"

خاموشی برقرار رہی۔ آخرکار دوسرے بوڑھے نے ہار تسلیم کر لی اور مڑ کر پارک سے باہر چلا گیا۔

تین سال کے بعد وہ کلکتے واپس لوٹا تھا۔ دن کے دو بج رہے تھے اور پارک کے اندر سناٹا تھا۔ سامنے میدان میں ایک بچہ بادام کے پیڑ کے نیچے اکیلا ربر کی گیند سے کھیل رہا تھا۔ پارک کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے پیر خود بخود اس بنچ کی طرف اٹھ گئے تھے جو جوں کا توں اپنی جگہ زمین پر ٹکا کھڑا تھا جیسے یہ کل ہی کی بات ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر گیا ہو۔ وہ بنچ پر چپ چاپ بیٹھا رہا اور درختوں کے

Scanned with CamScanner

سائے میدان پر لمبے ہوتے گئے۔ میدان سے حال ہی میں شاید کسی سرکس نے کوچ کیا تھا۔ جگہ جگہ گڈھے چھوڑ دیے گئے تھے۔ ایک آدھ جگہ جانوروں کی آلودگیاں بھی تھیں۔ پہلے بوڑھے کو یاد کر کے وہ مسکرایا۔ کون جانے اس بنچ پر اس سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے۔ اس بار ملاقات ہوئی تو وہ اسے آشرم کی زندگی کے بارے میں بتائے گا، اس شانتی کے بارے میں جسے اس نے آشرم میں رہ کر پراپت کیا تھا۔ اسے بتائے گا کہ سمندر کے کنارے کنارے چلتے رہنا بھی کتنا خوبصورت تجربہ ہوتا ہے، جیسے تم زمین کو پیچھے چھوڑ آئے ہو اور تمھارے سامنے قدرت کا وہ نیلگوں اسرار ہے جس سے ایک انڈے کو توڑ کر برہمانڈ اور اس کی پوری سرشٹی باہر آئی تھی، ہر جیو جنتو رینگ کر باہر آیا تھا۔ دیکھو بوڑھے، اگر تم مجھے سن رہے ہو اور اگر تمھیں لمبی زندگی چاہیے، اگر تم صحیح معنوں میں زندہ رہنے میں یقین رکھتے ہو تو تمھیں اس شہر کے شور شرابے کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اس شہر کی ، تنگیں انسان کو اندر سے کھرچ کھرچ کر کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ مجھے تو اس پر کوئی حیرت نہ ہو اگر لوگ خود اپنے اندر چھپنے لگیں۔ جانے وہ کیسی تیلیاں ہوں گی جو انھیں چھپنے سے روکتی ہیں، جانے وہ کون سی ڈوریاں ہوں گی جو ان کے چلنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اسے بوڑھے کے ساتھ اپنی شرطیں یاد آئیں۔ اس وقت بظاہر لاپروا ہوتے ہوئے بھی اندر سے جیتنے کے لیے دونوں کتنے اتاؤلے ہو رہے تھے جیسے ان کی ساری زندگی کا دارومدار ایک حقیر سے سکے یا قطب تارے کی چال پر ہو۔ کیا برا تھا اگر اس کا ہم عمر اس پر سبقت لے جاتا؟ اگر پوری انسانی زندگی کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا میں انسان کے پاس کھونے اور پانے کے لیے کچھ نہیں؟

اس کی محویت بچے سے ٹوٹی تھی جو اس کے بنچ کے سامنے کھڑا تھا۔

"کچھ چاہیے تمھیں؟ ایسا کیا دیکھ رہے ہو؟"

"گیند!" بچے نے ڈرتے ڈرتے وہ لفظ ادا کیا اور اس کی انگلی بنچ کے نیچے کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر بنچ کے پیچھے نظر ڈالی جہاں ربر کی گلابی گیند ہری گھاس کے ننھے جنگل میں گویا نکالے جانے کی منتظر تھی۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ گیند چن رہا تھا کہ کوئی چیز گھاس کے اندر گیلی مٹی پر چمک اٹھی۔

"او بھگوان!" گیند لو بچے کی طرف اچھال کر اس نے اپنا لاغر جسم ٹانگوں پر اٹھایا اور بنچ کے

Scanned with CamScanner

پیچھے جا کر اس چمکدار چیز کے سامنے ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔ یہ ایک سکہ تھا، پانچ روپے کا جس کا اشوک استمبھ والا پہلو گویا کسی حالیہ بارش کے بعد اس پر اپنی ٹھنڈی دھندلی روشنی کا نیزہ پھینک رہا تھا۔

"ہیڈ!" اس کی چیخ نکل گئی اور اس کا ذہن دوڑتا ہوا تین سال پیچھے چلا گیا جب ایک شام اس نے پہلے بوڑھے سے لمبی زندگی کی شرط لگائی تھی۔ "اوہ، اوہ! تو اس دن جیت میری ہوئی تھی۔ یہ تو کمال ہو گیا۔ یہ اتنے دنوں تک یہاں کیسے رہ گیا!"

سکے کو گیلی مٹی سے الگ کر کے وہ واپس بنچ پر جا بیٹھا اور اسے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بیچ رکھ کر مسلنے لگا۔ بچہ بادام کے پیڑ کے نیچے ربڑ کی گیند پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ درختوں کے سایوں کے ناہموار حاشیوں نے بڑھتے بڑھتے میدان کی فینسنگ وال کو چھو لیا۔ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہوا اور اس نے اپنے ڈھیلے کندھے اٹھائے۔

"لعنت ہے مجھ پر! کسی نے ٹھیک کہا ہے انسان کا کردار ہی اس کا نصیب ہے۔ شاید میں اپنی آخری سانس تک ایک بد کردار بوڑھا ہی رہوں گا۔" جھریوں پر پھسلتے آنسوؤں کے قطروں کو مسلتے ہوئے وہ اٹھا اور اس نے بنچ کے پیچھے جا کر سکے کو واپس گھاس کے اندر گیلی مٹی سے اس طرح چپکا دیا کہ اب اس کا نمبر والا سرا آسمان کی طرف ہو گیا تھا۔

❀❀

صدیق عالم

نل کی پیاس

یہ چھ فیٹ کشادہ ایک گلی ہے، بالکل پختہ، جس میں داخل ہوتے ہی ایک ٹیوب ویل سے ٹکرانا پڑتا ہے جو اب کام نہیں کرتا۔ یہ گلی سرخ پرچم کا ایک ناقابلِ شکست گڑھ ہے۔ الیکشن کے دنوں میں یا پارٹی کی برسی کے موقعے پر یا کسی بڑے نیتا کی آمد پر اکثر اس پر ایک سرخ جھنڈا لہرا دیا جاتا ہے جو اپنی درانتی اور ہتھوڑے کا بوجھ شاید سنبھال نہ پانے کے سبب زیادہ تر اپنے پتلے بانس پر گرا رہتا ہے۔

ایک دن میں اسے کام کے لائق بنانے کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے اتنے بڑے کام کا تہیہ کیا ہے، تھوڑا بہت میرے بارے میں بھی۔

میں اس گلی میں رہتا ہوں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ یہ گلی میرے اندر رہتی ہے۔ ہمارے مکان کے صدر دروازے پر لوہے کے دو کڑے دیوار سے لٹک رہے ہیں جو اس بات کا غماز ہے کہ کبھی ان سے گھوڑے باندھے جاتے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی پرانا مکان ہے، بہت ہی خستہ حال جس کی دیواروں کے کارنس پر کبوتروں نے ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔ ان کی آوازیں عموماً صبح کے وقت گونجا کرتی ہیں۔ باقی وقتوں میں یہ اپنے سروں کو جسموں کے اندر چھپائے دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے ہیں یا بلا وجہ پاس پڑوس کی چھتوں کے اوپر چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ مجھے کبوتر اچھے نہیں لگتے۔ یہ پوری گلی کو گندا کرتے رہتے ہیں، خاص طور پر موسمِ سرما میں۔ ایک بار ایک کبوتر کے مردہ جسم کو میں نے گلی میں دیکھا تھا، اسے ایک بلی نوچ رہی تھی۔ میں نے بلی کو بھگا تو دیا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب اس نچے نچائے کبوتر کا کیا کروں۔ اس شام جب میں آفس سے گھر لوٹا تو میں نے دیکھا گلی میں

Scanned with CamScanner

بوڑھی چڑیا کی طرح اب چپ سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ صرف ان کی دونوں آنکھیں کالی پتلیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ رحمت اپنے دروازے پر کھڑا مجھے تاکتا رہا یہاں تک کہ دروازے سے اوپر کی تیرہ قدم چڑھ کر نکل گئی اور مجھے اپنی بیوی ہندنا کی آواز سنائی دی۔

"اب اندر آ بھی جاؤ، باہر کتنی شبنم ہے۔"

باہر کتنی شبنم ہے۔ میں اپنی ہتھیلی کو سر پر رکھ کر دیکھتا ہوں، میرے بال واقعی گیلے ہو رہے ہیں۔ پہلی بار مجھے ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے اور میں گھر کے اندر داخل ہوتا ہوں۔ نیچے کا صحن حمام کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو کرایہ داروں کے کپڑے دھونے اور نہانے کے سبب ہمیشہ گیلا رہتا ہے۔ اس کے حوض کے پانی میں پرندوں کی بیٹ اور پر تیرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی مرا ہوا چوہا بھی اس سے نکال کر پھینکنا پڑتا ہے۔ دیواروں پر ایک ہی سیلن ہے۔ ان نم تاریک کمروں میں جو لوگ رہتے ہیں وہ اسی مکان کی طرح ہی پرانے ہیں۔ ایک بار ایک بوڑھے کو میں نے دیکھا تھا وہ کھانستے ہوئے میری طرف تاک رہا تھا۔

"آپ کو کچھ چاہیے؟" میں نے ان سے پوچھا تھا۔

"جوانی شیو شنکر کے بعد یہاں ذرا بھی لوگوں کے دل میں دیا نہیں ہے۔" وہ میرے دادا کے بارے میں کہنے لگے۔ "اور تم سنے بھی نہ تھے اور ننگے گھومتے تھے جب میں یہاں آیا۔ جب ہم نے کیا اچھے دن گزارے۔ یہیں کہتے ہیں، ملک آزاد ہوا اور شنکر سے بڑی تعداد میں آسمان پر آ گئے۔"

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ کسی غیر ضروری بحث کو روکنے کا اس سے زیادہ موثر طریقہ اور بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ مگر پرنسل والے سے چھٹکارا پانا کیا اتنا آسان تھا؟

"شیو شنکر سے۔" انھوں نے گننا شروع کیا۔ "اور نوچنے والے گدھ، اور چیل اور کوے اور کیڑے، جن کے بعد نسخے اور ان کا تاریخ، تمام کے تمام لندورے اور طفلِ ناتحقیق۔" وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کس کے پاس اتنی فرصت تھی۔ چھ سال پہلے پرنسل دا کو ایک بار ہم لوگوں نے علی پور کے پاگل خانے میں بھرتی کروایا تھا۔ آج تک وہ اس کا غصہ ہم لوگوں پر اتارا کرتے ہیں۔ سیڑھی سے اوپر جاتے ہوئے میں نے دیکھا، پرنسل دا اچانک چپ ہو گئے تھے اور اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے اندر سے مجھے تاک رہے تھے۔

اوپر کے کمروں میں سے دو ہمارے حصے میں آئے تھے۔ یہاں ایک کمرے میں میں بندنا کے ساتھ ایک اونچے پلنگ پر سوتا تھا، دوسرے کمرے میں میرے دو بچے بڑے ہو رہے تھے۔ سلاخوں والی آدم قد کھڑکیوں کے باوجود گلی کی تنگی کے سبب ان کمروں میں روشنی کا گزر کم ہوتا تھا۔ اوپر سے ہم نے ایک کتا پال رکھا تھا، ہیرومن، جو زیادہ تر وقت اندر صحن کی طرف کھلنے والی گیلری میں جو لوگوں کی گزرگاہ بھی تھی، اپنا چہرہ کسی فلاسفر کی طرح لٹکائے بیٹھا رہتا یا چوہوں کا پیچھا کیا کرتا، چوہے جو پرانے ڈرین پائپوں کے رخنوں سے نمودار ہوتے مگر اس کتوں کا سایہ دیکھتے ہی جانے کہاں چھپ جاتے۔

ٹیوب ویل سے اتنی دور بھٹک جانے کا میرا مقصد اور کچھ نہیں، محض اس ٹیوب ویل کے آس پاس کی دنیا کی تصویر کھینچنا تھا تا کہ اس کی کہانی مکمل ہو سکے۔ ورنہ یہ نٹ بولٹ اور پائپ کا بے جان ٹکڑا اپنی کوئی کہانی بھی رکھتا ہے؟ اسے دباؤ تو یہ کراہتا ہے، لگاتار دباؤ تو یہ پانی اگل دیتا ہے۔ مگر اس ٹیوب ویل کی ٹونٹی تو اب کچھ بھی نہیں اگلتی، ایک بوڑھے آدمی کی طرح جس کی شہوانی طاقت دم توڑ چکی ہو، یا کسی سالخوردہ کنواری کی طرح جو اپنی شہوانی خواہشات کا گلا دباتے دباتے ایک نسخہ میں بدل گئی ہو۔ یہ ٹیوب ویل اندر سے پوری طرح ناکارہ ہو چکا ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ پانی کا وہ زمین دوز چشمہ جس سے یہ منسلک تھا اپنا راستہ بدل چکا ہو، یا ہمیشہ کے لیے سوکھ چکا ہو۔ گلی کے لوگ نکڑ پہ آنے والے ایک بڑے ٹینکر کا انتظار کرتے ہیں۔ کارپوریشن کا یہ ٹینکر بھی صحیح وقت پر نہیں آتا، لیکن جب آتا ہے اس کی ایک آنکھ والا ڈرائیور اپنی سیٹ سے اتر کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش میں لگ جاتا ہے جبکہ لوگ پلاسٹک کی بالٹیاں یا پیتل کے گھڑے اٹھائے قطار باندھے دشوار گذار چہرے لیے کھڑے رہتے ہیں۔

”ذرا سوچو، اتنا پانی ہمارے معدوں، ہماری پیشاب کی نالیوں سے گزر جاتا ہے اور ہم لوگوں کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔“ یہ اس کا محبوب طریقۂ کلام ہے جسے وہ ہر بار ایک ہی انداز سے دہراتا ہے جیسے یہ الفاظ کسی سے سن کر اس نے رٹ لیے ہوں۔ ”یہ دنیا ہم انسانوں کے سبب اب رہنے کے لائق نہیں رہ گئی ہے۔ اچھا کھاؤ گندا نکالو، اچھی چیز پیو بری چیز باہر کرو، صاف ہوا اندر لو بدبودار خارج کرو، ہم گندگی پیدا کرنے والی مشینیں ہیں۔“

وہ واقعی ایک فلاسفر تھا!

Scanned with CamScanner

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ڈرائیور ہر بار وہی آدمی نہیں نکلا اور ایک بار تو ہم نے ایک ایسے ڈرائیور کو دیکھا جسے کھجلی کی بیماری تھی اور جس کے چہرے کا رنگ گہرا ہوا تھا اور جب لوگ ٹینکر کی ٹونٹی سے پانی بھر رہے تھے وہ دیوار سے اپنے جسم کو رگڑ رہا تھا اور اس کا داہنا ہاتھ لگاتار اپنے فتق کو کھجائے جا رہا تھا۔ اور جب پانی لینے والوں کی بھیڑ مفقود ہو گئی وہ ہاتھ کے اشارے سے گویا گلی کے تمام موجود اور غیر موجود لوگوں سے مخاطب ہو گیا تھا۔

"لو دیکھو۔ پہلے تو لوگ پانی کے لیے اتنا شور مچا رہے تھے، اور اب کوئی نہیں آتا۔ اب میں اس باقی پانی کا کیا کروں گا؟ اب تو کتے بھی اس میں نہانے نہیں آتے۔"

واقعہ یہ تھا کہ اس وقت تک نکڑ پر جمع ہونے والے سارے کتے ٹینکر کے نیچے گرے ہوئے پانی میں لوٹ پوٹ کر جا چکے ہوتے۔

اور جب ٹینکر چلا جاتا تو ایک بھکاری نمودار ہوتا اور ٹینکر کی گیلی جگہ پر اپنا کیلوں مہاسوں سے ڈھکا چہرہ لٹکا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی ایک آنکھ پتھر کی تھی اور دوسری آنکھ پر موتیابند نے تین چوتھائی سے زیادہ حملہ کر رکھا تھا۔ اس موتیابند کے علاج کے لیے اس کے پاس یوں تو پیسہ نہیں تھا، شاید اسے بتایا گیا تھا کہ اس کے سبب لوگ اس پر زیادہ ترس کھانے پر مجبور تھے۔

"سارے رشتے من کے دھوکے،" وہ بیچ بیچ میں تکرار لگاتا۔ "دے کرشنا تو کون روکے۔"

دراصل اسے دیوار گیر مندر کا پجاری مہالٹ گوسوامی کہیں سے ڈھونڈ لایا تھا اور اپنے مندر کی آمدنی بڑھانے کے لیے اس نے اسے اس جگہ لا کھڑا کیا تھا۔ اکثر دیر رات گئے ان دونوں کے جھگڑنے کی آواز محلے والے سنتے جب وہ نشے میں دھت بھیک کے پیسے آپس میں بانٹا کرتے اور یہ معاملہ زیادہ تر ہاتھا پائی میں بدل جاتا۔

تین سو برس قبل یہ شہر سندر بن کا ہی ایک حصہ تھا۔ پھر ایک دن ایک آدمی ایک گھڑیال کے سر پر پیر رکھ کر اپنے مستول جہاز سے نیچے اترا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ افیم کے نشے میں دھت تھا اور چاروں طرف پھیلی ہریالی اور دلدلی زمین سے قدرے ہراساں نظر آ رہا تھا جو سانپ اور گھڑیالوں سے اٹے پڑے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور سوچا، سارے کا سارا معاملہ ہی

Scanned with CamScanner

یہاں سب بے نکا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن اچانک انگریزوں نے بگل بجا کر اپنا جھنڈا واپس لپیٹ لیا اور دلّی کی طرف کوچ کر گئے، جس کے بعد لوگوں نے دیکھا معاملہ کچھ اور بے نکا ہو چکا تھا۔ یا شاید جب سب کچھ ہو چکتا ہے تو بے نکا ہونے کا احساس کچھ اور زیادہ گہرا ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہوگلی ندی میں پانی بھلا کب رکنے والا تھا۔ وہ بہتا رہا، دن بدن اور گدلا ہوتا رہا، فیکٹری کی چمنیاں آسمان کو داغدار کرتی رہیں، ہمارے گھر کی دیواروں سے پلاسٹر جھڑتے رہے، کچھ لوگ کھڑکیوں پہ چہرہ رکھ کر بھول گئے اور کچھ لوگ بے چہرہ ایک لمبی زندگی جی کر شمشان گھاٹ کے راستے ہو لیے۔ اور میں جس نے ٹیوب ویل سے پانی نکالنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مجھے نئے سرے سے سارے معاملے کی چھان پھٹک کرنی پڑی۔ آخر مجھے دیکھنا بھی تھا، کیا میں واقعی اس کام کا اہل بھی تھا؟

کیا میں اس کام کا اہل بھی تھا؟ یہ سوال پہلی اور آخری بار میں نے خود سے کیا تھا۔ میں نے اپنے جوتوں کے تسمے باندھتے وقت لاپروائی سے سر ہلا کر ایک طرح سے اس سوال کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے بڑے لڑکے سے کہا وہ اپنی پڑھائی میں زیادہ دھیان دے کیونکہ وقت بہت برا آ گیا ہے اور اب انجینئر اور ڈاکٹر بھی بیکار گھومنے لگے ہیں۔ میرا ارادہ اس کی دل شکنی کرنے کا نہ تھا، مگر میری بیوی نے اسے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔

''تمھارے آسمان پر صرف کالے بادل ہی کیوں منڈلاتے ہیں؟'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''بچوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ ان سے ہمیشہ اچھی باتیں کیا کرو۔ بچے پھول کے مانند ہوتے ہیں۔ وہ کم دھوپ میں مرجھا جاتے ہیں اور تیز دھوپ میں مر جاتے ہیں۔''

''بندنا، تم تو شاعر ہو!'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''تم کویتا کیوں نہیں لکھتیں؟ ٹاؤن ہال کے ایک کلرک سے میری پرانی پہچان ہے۔ تم وہاں کی تقریبات میں شاعرہ کے طور پر شرکت کر سکتی ہو۔ انھیں اپنی ادبی محفلوں کی شوبھا بڑھانے کے لیے زنانی شاعروں کی ہمیشہ ضرورت پڑتی ہے۔ اور پھر میں تمھاری کویتاؤں کے لیے ایک ناشر ضرور ڈھونڈ لوں گا جو تمھاری کویتا کی کتاب شائع کرنے کے بعد پہلے سے کچھ اور زیادہ غریب ہو جائے گا۔ کالج اسٹریٹ میں ایک سے ایک پاگل پبلشر بھرے پڑے ہیں۔''

''کیا کویتا لکھنا اتنا آسان ہے؟'' بندنا نے جواب دیا۔ ''کیا آج کے آدمی کے پاس کویتا کے

Scanned with CamScanner

بے وقت سے بھی؟ میں پچھلے پندرہ برس سے تمھیں دیکھ رہی ہوں۔ میں نے تو تمھیں کسی کو بتا کی تاب پڑھتے نہیں دیکھا، جب کہ تم ہر وقت فٹ بال کی خبروں میں مست رہتے ہو۔ تمھارے لیے تو دنیا کا مرکز موہن بگان کلب ہے۔“

”تم پریذیڈنسی کی چھاترا رہ چکی ہو نا، اس لیے مجھے تم سے ڈر لگتا ہے،“ میں مسکرا کر کہتا ہوں۔

”اور دیکھو تم مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگوں کی بھاشا مت بولا کرو۔“

”میں نے کب ایسٹ بنگال کلب کا سپورٹ کیا ہے؟“

”میں سب سمجھتا ہوں۔ تم اس ایف آئی کی ممبر رہ چکی ہو اور اس میں کن لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

”تم تو بس [illegible] “ نندنا ہنستی ہے۔ ”یہ نہیں کہ مجھے فٹ بال پسند نہیں۔ صرف اس میں [illegible] اور [illegible] کی بات نہیں بھاتی جس طرح کرکٹ میں مجھے ہندوستان پاکستان والا معاملہ پسند نہیں لگتا۔ یہاں نفرت وحب الوطنی کا نام دے کر لوگ سینہ چلاتے گھومتے ہیں اور کھلاڑی اسی درمیان امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔“

”یہ وہی نفرت ہی ہے جس سے [illegible] ہمیں زندہ و متحرک رکھتے ہیں، بلکہ اب تو ساری دنیا کو [illegible] یہ نئی نفرت نے [illegible] ہے۔ ایک ہیرل کا [illegible] پکڑ کر تم اس کی محبت [illegible] میں کہتا ہوں۔ اور پھر [illegible] کا اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ [illegible] ساری دنیا میں [illegible] کوئی فرق نظر نہیں آتا [illegible] پہاڑوں پر [illegible] تانتے ہیں اور سانپ کھاتے ہیں اور [illegible] میں لوگ زیادہ [illegible] ہوتے ہیں [illegible] میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں [illegible] کا شوق ہوتا ہے۔“

نندنا [illegible] نے تو میرے سینے سے لپٹ کر میری کھردری داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہتی ہے، ”مجھے پتا ہے تم [illegible] میں ہمیشہ [illegible] آتے تھے۔ مگر گھر میں تو کبھی کھل کر مجھے چھیڑ دیا [illegible]۔“

[illegible] میں اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں ڈال کر کہتا ہوں جن پر فدا ہو کر میں نے [illegible] سات [illegible] لیے تھے [illegible] یہ خوبصورت زنجیریں ہیں جو مردوں کو تمام عمر

قید کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔'' ہم فٹ بال کے شائقین اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ہماری لغت میں شکست کی اصطلاح موجود نہیں۔ اسے تم ہماری کمزوری سمجھو یا طاقت، یہ ایک بڑی تحریک ہے ہمارے اندر جینے کی۔ جس دن ہم ہار تسلیم کرلیں، ہم انسان نہ رہیں، یک بغیر ہوا کی گیند میں بدل جائیں۔''

ٹیوب ویل! اوہ معاف کیجیے، ہم ٹیوب ویل کے پاس واپس چلتے ہیں۔ مجھے دوسری بار کہنے دیں، یہ ایک بہت ہی پرانا ٹیوب ویل ہے۔ اور اب تو اس گلی سے باہر جاتے یا واپس اندر آتے لوگوں کو ایک طرح سے اسے ناکارہ دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

''تمھیں خبر بھی ہے،'' ایک بار گلی کے ایک مکین کو میں نے اپنے ساتھی کو بتاتے سنا تھا جو باہر کا آدمی تھا۔'' اس ٹیوب ویل کے بارے میں بہت ساری افواہیں مشہور ہیں۔''

''اچھا؟ اور میں سمجھتا تھا یہ بس یوں ہی سا ایک ہینڈ پمپ ہے جیسے بہت ساری جگہوں پر نظر آتے ہیں جوا پنا دن دیکھ چکے؛ باہر کا آدمی کہتا ہے۔'' میں جب بھی تمھارے گھر آتا ہوں اس سے ٹکرا جاتا ہوں۔ تم لوگ اسے کیسے برداشت کرتے ہو؟ ویسے وہ افواہیں کیا ہیں؟ وہ افواہیں یقیناً کافی طاقتور ہوں گی جو یہ ہینڈ پمپ گلی کے بیچوں بیچ اس طرح کھڑا ہے۔''

''افواہ یہ ہے کہ اس ٹیوب ویل سے کبھی پانی نہیں نکلا۔''

''یہ کوئی نئی بات ہے؟'' اسے جواب ملا۔'' اس سے اس کی اہمیت بھلا کیسے بڑھ سکتی ہے؟ اس ملک میں سینکڑوں چیزیں ہیں جنھوں نے شروع سے ہی اپنا کام کرنا بند کر دیا ہے۔ شاید اور بھی کوئی وجہ ہو جسے تم نہیں جانتے۔''

''میں کیسے نہیں جان سکتا؟ مجھے یہاں رہتے بیس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ٹیوب ویل پندرہ برس پہلے مقامی لوگوں کی مانگ پر الیکشن کے اعلان سے قبل لگوایا گیا تھا۔ مگر ایک لمبی تقریر کے بعد جب لیڈر نے اس ٹیوب ویل کا افتتاح کیا تو اس سے ایک قطرہ بھی نہ نکلا جبکہ ٹیسٹ کے دوران یہ لگاتار پانی اگلتا رہا تھا۔ اسے فوراً انھوں نے سبوتاژ قرار دیا اور مخالف پارٹی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس کے دوسرے دن ایک کتا اس ٹیوب ویل کے سامنے مرا پایا

گیا۔ چونکہ اس کا ایک سیاسی پہلو نکل آیا تھا کسی نے بھی اس کتے کو وہاں سے ہٹانے کی جرأت نہیں کی اور وہ کئی دنوں تک پڑا مہکتا رہا۔ لیڈر کو تو اسمبلی الیکشن میں ہر حال میں جیتنا تھا مگر یہ ٹیوب ویل ان دنوں کی یادگار کے طور پر رہ گیا۔ اس سے کم از کم ہم پر یہ راز تو کھلا کہ ہمارے کچھ نیتا کچھ کرنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آخر میں ٹیوب ویل پیاسا کا پیاسا رہ جاتا ہے۔

ہمارے محلے کا کاؤنسلر گنو ے گنگا رام ہمیشہ ہمارے گھر آیا کرتا ہے کیونکہ ہر الیکشن کے موقعے پر بندنا اپنی مانگ میں سیندور سجائے، کندھے پر اوڑھنی یا شال رکھے پارٹی کے لیے پرچار کرنے نکل پڑتی تھی۔

''ہمیں اس ٹیوب ویل کو کام کے لائق بنانا چاہیے،'' ایک دن میں اس سے کہتا ہوں۔

''کیا فائدہ؟'' گنگا رام کہتا ہے۔ ''اس سے خوامخواہ گلی میں آنے جانے والوں کو تکلیف ہوگی۔ پانی کی نکاسی کا انتظام تو اب اس جگہ ہونے سے رہا، خوامخواہ یہ گلی گندی دکھائی دے گی۔ ویسے اب اس کی ضرورت بھی بھلا کسے ہے؟ زیادہ تر گھروں میں نل کا انتظام ہو چکا ہے۔ اوپر سے گرمی کے دنوں میں کارپوریشن کا ٹینکر یہاں روز پانی لے کر آیا کرتا ہے۔''

''تو اس ٹیوب ویل کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سنکھو دا نے خود اسے لگوایا تھا۔'' وہ ایم ایل اے کا ذکر کرتا ہے جو ان دنوں سرکار میں منسٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ ''لکھو دا، آپ بھی کانگریسیوں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ بندنا تم لکھو دا کو سمجھاتی کیوں نہیں؟''

''میرا اتنا دماغ نہیں کہ تمہارے لکھو دا کو سمجھاؤں،'' بندنا نے جواب دیا۔ ''وہ ہر آئے دن کوئی نہ کوئی نئی بات دماغ میں بھرتے رہتے ہیں۔''

''میں تو اس سے پانی نکال کر ہی دم لوں گا،'' میں نے الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا۔ ''اور گنگا رام، تم لوگ اسے سیاست کا معاملہ نہ بناؤ۔''

''ارے نہیں لکھو دا، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم کیا آپ کو نہیں جانتے؟ یہاں کون آپ کی عزت نہیں کرتا؟'' مجھے پتا ہے وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ یہ سالے سیاست دان، پتا نہیں اپنے منہ کے اندر جانے کتنی زبانیں رکھتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اس دن گلی میں دیر تک چہل قدمی کرتا رہتا ہوں۔ چھوٹے کھمبوں پر بلب جل اٹھے ہیں۔ ٹیوب ویل کا سایہ کسی تیر انداز کی طرح نکڑ سے اندر کی طرف پھیل گیا ہے۔ اسی گلی میں کھیل کر میں جوان ہوا تھا۔ ایک دن اس گلی سے میری ارتھی اٹھنے والی تھی اور لوگ مجھے ٹرک میں لاد کر سوڑی پھینکتے ہوئے نیم تلہ کا راستہ لینے والے تھے۔ کیا میں یوں ہی مر جاؤں گا؟ ایسا کچھ کر کے گزر جانا کیا برا ہوگا جس سے اس گلی کے لوگ کم از کم مجھے جوڑ کر دیکھتے رہیں، تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، بلاوجہ ہی سہی۔

میں جس آرکیٹیکچر فرم میں نقشہ نویس تھا وہاں ایک سائٹ انجینئر سے میں نے فون پر رابطہ قائم کیا۔

"یہ سرکاری نل ہے، اور پھر اندر پائپ کی خرابی نکلی تو اس میں سامان کے خرچ کے ساتھ ساتھ مزید کھدائی کا خرچ بھی آ سکتا ہے۔"

"اس کا میں انتظام کر لوں گا،" میں نے کہا۔ "اس میں سیاست کا اب کوئی معاملہ نہیں رہا اور گلی میں بہت سے لوگ اس معاملے میں میرے ساتھ ہوں گے۔"

"تو تم اس کے بارے میں کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یا تو اسے کام کے لائق بناؤ، یا اسے اکھاڑ پھینکو۔"

"تمھیں یقین ہے کہ یہ اتنا آسان ہے؟"

"لگتا ہے تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے۔ مجھے دوسرا آدمی ڈھونڈنا ہوگا۔"

"ارے نہیں، تم تو بلاوجہ بھڑک اٹھتے ہو،" سائٹ انجینئر کی آواز میں نرمی آ گئی۔ "کیا مجھے نہیں پتا کہ تم کس طرح کے انسان ہو؟ اس فرم میں تمھاری کون عزت نہیں کرتا؟"

"مجھے چکنی چپڑی باتوں میں نہ گھیرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا، کتنے پیسے کا انتظام کرنا ہوگا۔ آخر کنزیومر کورٹ کس دن کام آئے گی۔"

"خرچ کے بارے میں تو میرے آدمی کے دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ ویسے اگر زمین کے اندر کا پائپ صحیح سلامت رہا تو خرچہ بس برائے نام آئے گا۔"

"ویسا ہی ہو،" میں فون رکھ دیتا ہوں۔

میں جس میز کے سامنے بیٹھ کر خاکہ بنایا کرتا تھا اس کے سامنے ایک کافی بڑی آدم قد کھڑکی تھی جس کے پٹ باہر کی طرف کھلتے ہوئے تھے۔ اس سے پرانے کلکتہ کی خستہ حال عمارتیں کسی بدرنگ پینٹنگ کی طرح نظر آتی تھیں۔ ان قدیم عمارتوں کی بھیڑ میں ایک مسجد کے دو یکساں جسامت کے گنبد ابھرے ہوئے تھے جن پر کبوتروں نے اپنا ڈیرا بنا رکھا تھا۔ میں نے ان دونوں گنبدوں کے بیچ جاڑے کے موسم میں ہمیشہ سورج کی لال ٹکیا کو چھپتے دیکھا ہے۔ میں بھی جانتا ہوں، یہ دنیا اتنی خوبصورت نہیں ہے، میں خود سے کہتا ہوں۔ مگر یہ میری بنائی ہوئی دنیا نہیں ہے۔ اور پھر ہمیں یہ ثابت تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہم کسی قابل ہیں، کہ ہم اس سیارے پر تھوڑا بہت تو دکھائی دیتے ہیں۔

نمانی خوشحال سے پانچ برس چھوٹی ہے۔ اس کے سامنے تپائی پر چائے رکھتے وقت میری بیوی اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ گو اس پوری گلی میں وہ سب سے پسندیدہ آدمی ہے۔ ضخیم ورثے کا خیال اسی نے میرے دماغ میں ڈالا ہے۔ نمانی خوشحال کے ساتھ میں بچپن سے جوانی تک مدن بگان اسٹیڈیم میں فٹ بال کھیل چکا ہوں اور جب اسے اپنے باپ کی لانڈری سنبھالنی پڑی تو اس نے چند مہینوں میں اندر ہی اندر اس کا دیوالیہ نکال دیا۔

"مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔" اس نے میرے سامنے اعلان کیا تھا۔ "یہ آدمی اس بے وجہ تماشے کو ساری زندگی، دوسروں کی ماتحتی جھیلتا رہے؟"

"ہم اپنی مرضی سے جیتے رہتے ہیں۔" میں نے ایک کمزور سا احتجاج پیش کیا تھا کیونکہ یہ وقت کی ضرورت تھی۔ مگر مجھے پتا تھا خوشحال اپنی منطق کے سیلاب میں اسے بہا لے جائے گا۔

"یہ ہم اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے کہتے ہیں،" خوشحال نے جواب دیا، "اصل بات یہ ہے کہ ہم سب بوجھ ڈھونے والے جانور ہیں۔ جس کی پیٹھ پر جتنا بوجھ ہو وہ اپنے آپ کو اتنا ہی خوش قسمت سمجھتا ہے۔"

لانڈری کے بند ہونے کے بعد نمانی نے چند دنوں تک ایک پرچہ نکالنے کی کوشش کی تھی اور مجھے اس نے مدیر بنایا تھا۔ اپنے قلم اور شخصیت کو مکمل روپ دینے کے لیے اس نے پتلی ٹھوڑی پر چھوٹی سی داڑھی بھی اگالی تھی۔ وہ پرچہ تو نہیں چلا، ہاں صحافی کے طور پر نمانی

گھوشال چل نکلا اور اس کے تعلقات تجارت اور سیاست کے گلیاروں میں دور دور تک پھیل گئے۔

''یہ گھوسے گنگا رام تو اول نمبر کا گدھا ہے،'' اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر اپنے قلم کی طرح نوکیلے دانتوں سے چور کرتے ہوئے کہا۔'' پہلے میں سیدھے سنکھوا سے بات کروں گا۔ پھر آگے۔ ہر معاملے کی ایک صحیح شروعات ہونی چاہیے، ایک صحیح دشا ہونی چاہیے۔ ارے ہمیں تو اس کے بارے میں بہت پہلے سوچ لینا چاہیے تھا۔ ہم بنگالی اسی لیے تو مار کھا جاتے ہیں۔ کبھی بنگال جو آج سوچتا تھا کل سارا بھارت اسے سوچا کرتا تھا۔ آج یہ حالت ہے کہ سارا بھارت جو آج سوچتا ہے ہماری کھوپڑی میں وہ بات تین سال بعد آتی ہے۔''

''سب کہتے ہیں یہ اتنا آسان کام نہیں۔ یہ پرانا نل ایک پرانے کرایہ دار کی طرح ہے۔ اسے اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں۔ اور کام کے لائق بنانا تو اور بھی مشکل ہے۔ بہت سارے معاملات اس سے جڑے ہوئے ہیں جن کا ہمیں پتا نہیں مگر جو دھیرے دھیرے سامنے آجائیں گے۔''

''وہ سب سامنے آئیں تو!'' گھوشال نے اپنے بغیر گردن والے سر کو ایک فاختہ کی طرح پہلے گھڑی کے رخ اور پھر اس کے مخالف موڑتے ہوئے کہا۔'' تم نے کچھ سوچنے کی کوشش تو کی، ورنہ آج کل کس کے پاس سوچنے کے لیے وقت ہے۔ سچ پوچھو تو ہم سب مشین بن چکے ہیں، مشین جسے دوسرے چلا رہے ہیں۔''

''یہ نمائی دا خود اپنے کسی کام کا آدمی نہیں، تم اس سے کیا امید رکھتے ہو،'' اس کے جانے کے بعد میری بیوی نے کہا۔'' یہ عجیب سنک پال لی ہے تم نے۔''

''ذرا انتظار کرو بندنا،'' میں نے نمائی گھوشال کے چھوڑے ہوئے بسکٹ کو طشتری سے اٹھا کر چباتے ہوئے کہا۔'' اور میرے لیے ایک کپ گرم چائے بنا لاؤ۔ میں ذرا چھت کی دھوپ میں بیٹھتا ہوں۔ یہ معاملہ سنگین ہے۔ مجھے اس میں تمھاری مدد چاہیے۔''

''کیسی مدد؟'' بندنا نے چونکتے ہوئے کہا۔'' مجھے اپنے معاملات میں نہ لپیٹو۔ میں کیا تمھیں نہیں جانتی۔ یہ سارا پاگل پن تم اپنے تک ہی محدود رکھو۔''

''اب شاید اس دنیا کو پاگلوں کی ہی ضرورت ہے،'' میں مسکرا کر کہتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

دو ہفتے گزر گئے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دو ہفتوں میں ایک طرح سے میں اس معاملے سے ذرا سا اکتا گیا ہوں۔ اس کی جو بھی وجہ رہی ہو، میری اپنی مصروفیات کا اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ یہ اپنے معمول پر ہیں۔ ان میں نہ کوئی خاص اضافہ ہوا ہے نہ ہی کوئی کمی آئی ہے۔ دوسرے دنوں کی طرح آج بھی میں میز کے سامنے کھڑا پنسل سے لکیریں کھینچتے کھینچتے اکتا گیا ہوں اور کھڑکی سے باہر تاک رہا ہوں جہاں عمارتوں کے ہجوم میں مسجد کے گنبدوں پر کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ ابھی سورج کی ٹکیا کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی ہماری طرف کی کھڑکی عمارت کے سائے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ نیچے سڑک سے گزرتی گاڑیوں کے ہارن لگاتار بج رہے ہیں۔ میں شہر کی اس سمفنی کا 'لطف' اٹھا رہا ہوں جب کریم چائے کی پیالی لیے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ پیالی تھام کر میں اپنی گدّے دار کرسی کے اندر دھنس جاتا ہوں اور دونوں ٹانگیں میز پر پھیلا کر ہانک لگاتا ہوں۔

"کریم!"

"ہاں حضور۔" کریم اس عمارت کا لفٹ مین ہے جو لفٹ کے دائمی طور پر ناکارہ ہو جانے کے بعد ہمارے آفس میں کام کرنے لگا ہے۔ اس کے کان کے لوؤں کے بال کبوتروں کی طرح اجلے اور سفید ہیں۔ وہ ہمارے آفس کے اندر ہی سوتا ہے، آفس کے اندر ہی نماز پڑھتا ہے اور آفس کے پرانے فرنیچر جو برسوں کے استعمال کے سبب چکنے اور سیاہ ہو رہے ہیں ان ہی کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔

"کریم، مرنے کے بعد کہاں دفن ہونے کا ارادہ ہے؟"

"جہاں بھائی لوگ دفن کر دیں حضور۔ گوبرا، باگماری یا سولہ آنا قبرستان۔ سسرے، اور کہاں لے جائیں گے۔"

"تمھارا کوئی رشتہ دار نہیں؟"

"اب تو آپ ہی لوگ سب کچھ ہیں حضور۔"

"تم اپنا گاؤں کیوں نہیں لوٹ جاتے؟ گاؤں کی مٹی، وہاں کی ہوا، وہاں کے لوگ، وہ تمھیں یاد نہیں آتے؟"

"پچاس برس بعد اب وہاں کون ہمیں پہچانے گا حضور!" کریم نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "خود اپنا گاؤں اب گاؤں کہاں رہا۔ اب گاؤں کے لوگ شہریوں سے زیادہ سیانے ہو گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

سالے زمین جائداد کے لیے زیادہ مارکاٹ کرنے لگے ہیں۔ اب تو ان لوگوں سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنی انگلیوں کو گن لینا پڑتا ہے۔"

دیہات کے لوگ سیانے ہو گئے ہیں، گاؤں قصبوں میں بدل گئے ہیں، قصبے شہروں میں، شہر میگا سٹی میں، میٹروپولس کوسموپولس میں ڈھل گئے ہیں۔ اب ہمارے یہ مہانگر کسی ملک سے کم نہیں، سب لوگ ایک ملک کے اندر ایک دوسرے ملک میں آباد ہیں، ان کی نہ نظر آنے والی اپنی سرحدیں ہیں، اپنی خاردار باڑھیں ہیں، no man's land ہیں، ان پر مخصوص پارٹیوں کی سیاسی پکڑ ہے، غنڈوں کی دہشت کا خاص انتظام ہے — ایک ملک کو اور کیا چاہیے؟ میں اپنی عمارت کے نیچے سڑک سے گزرتے وقت ٹرام کی پٹری پر رک گیا ہوں۔ سڑک پر دھواں پھیل رہا ہے۔ بہاری ٹھیلے والے ٹھیلوں پر سامان لادے گزر رہے ہیں۔ بنگالی کلرک اپنی ٹائپ مشینوں پر اونگھ رہے ہیں۔ یہ انگریزوں کے زمانے سے وہاں بیٹھے اونگھتے آ رہے ہیں۔ یہ بہت زیادہ بھات خوری کا نتیجہ ہے۔ ہائی کورٹ کے وکیل اور پیادے اپنی وردیوں میں گھوم رہے ہیں۔ ایک کتا اپنی پچھلی ٹانگ اٹھائے ایک ہائیڈرنٹ پر پیشاب کر رہا ہے۔ اس کے پیشاب کا رنگ بھی کچھ ہوگلی ندی کے پانی کی طرح گدلا ہے جو اس ہائیڈرنٹ سے باہر آتا ہے۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ سب لوگوں کو جلدی ہے۔ مجھے بھی جلدی ہے۔ ایک کافی رنگین اسٹیٹ آف دی آرٹ ٹرام گھنٹی بجاتے ہوئے ہلال کی شکل میں لال دیگھی کے کنارے سے گزر رہا ہے، پٹریاں بدلتے وقت اس کے پہیے بری طرح کھڑ کھڑا رہے ہیں، اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے سر ہل رہے ہیں۔

نمائی گھوشال میرے گھر پر میرا انتظار کر رہا ہے۔

"میں نے سنگھو دا سے بات کی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اور پھر یہ مسئلہ میرے اکیلے کا نہیں ہے۔"

"تو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔ تمھارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔"

"اب بھی نہیں ہوں،" میں کہتا ہوں۔ "مگر میں اس کے پاس کیوں جاؤں؟ یوں بھی یہ نیتا لوگ مجھے نہیں بھاتے۔"

"تم ایک ناممکن آدمی ہو،" نمائی گھوشال مسکرا رہا ہے۔ "ویسے سنگھو دا سے تمھیں ملاقات کرنی

کی پڑے گی۔ گھبراؤ مت، وہ اتنا برا آدمی نہیں۔ فنسٹر ہے، مگر اب بھی اپنے پرانے مکان میں اپنی معمولی زندگی گزار رہا ہے۔"

"ہم سب اپنی معمولی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ اس سے ہم کوئی تیر نہیں مار لیتے،" میں کہتا ہوں۔ اس کے چلے جانے کے بعد بندنا مجھ پر برس پڑتی ہے۔

"عجیب طریقہ ہے یہ تمہارا۔ وہ بیچارا تمہارے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور تم ہو کہ... آخر تم میں تبدیلی کب آئے گی؟"

"اب اس عمر میں میرے اندر کیا تبدیلی آئے گی۔ ایک بوڑھے مرغے سے تم کسی نئے پینترے کی امید مت کرو،" میں اپنے کمرے کی اونچی پلنگ پر چڑھتے ہوئے کہتا ہوں جس کے نیچے ہمارے گھر کا الم غلم سامان بھرا پڑا ہے۔ ہم نچلے متوسط طبقے کے لوگ، چاہے ہمارے سامانوں کا کوئی بھی مصرف نہ رہ گیا ہو، انہیں پھینکنے میں یقین نہیں رکھتے۔ "اور نائی گھوشال کے بارے میں فکر نہ کرو۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہماری دوستی اس وقت کی ہے جب ہم ننگے گھوما کرتے تھے۔ تم تو بہت بعد کی چیز ہو۔"

اور گرچہ بندنا کو میری بات سے چوٹ پہنچتی ہے، میں اس کا نوٹس نہیں لیتا۔ اس رات مجھے بہت دیر سے نیند آتی ہے۔ خواب میں بار بار میں اسٹیٹ آف دی آرٹ ٹرام کو اپنی پٹری سے گزرتے دیکھتا ہوں۔ ہر بار مجھے اس کے اندر کریم بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے ٹرام کے اندر آنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ آخر کار میں ٹرام کے پائیدان پر لٹک جاتا ہوں۔ مگر ٹرام کا کنڈکٹر مجھے ٹرام سے نیچے اترنے کی ہدایت دے رہا ہے جو دیر سے میری لنگ دوو پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"آپ کو کچھ نہیں چاہیے۔ ٹرام ڈپو کے اندر جا رہا ہے۔"

صبح میں جاگ کر تکیے پر ٹکائے اسی واقعے کو سوچ رہا ہوں۔ شہر دھیرے دھیرے دھوئیں اور دھند کی چادر سے ابھر رہا ہے۔ ایک عجیب باسی مہک ہے جو در و دیوار سے آ رہی ہے۔ کیا میری ناک اچانک زیادہ کام کرنے لگی ہے؟ ہاتھ منہ دھو کر میں کھڑکی کے سامنے رہ رجاموں سے لدی بید کی کرسی پر بیٹھا سورج کی کرنوں کو عمارتوں کے درمیان کے خلاؤں میں نیزوں کی طرح داخل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی ہے۔ ہمارا کتا ہیرامن جاگ چکا ہے اور ایک عجیب

Scanned with CamScanner

دبی دبی سی آواز نکال رہا ہے جیسے اپنے وجود کا احساس دلانا چاہتا ہو۔ اخبار والا اخبار پھینک کر جا چکا ہے۔ گوالا اپنی سائکل پر کنستر کھڑکاتے ہوئے گزر رہا ہے۔ خاکروب گلی میں جھاڑو لگا رہا ہے۔ مشنری اسکول میں جانے والے بچے اسکول کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے ایک ہی فلم ہے جسے میں روز دیکھنے پر مجبور ہوں۔ بندنا نمودار ہوتی ہے اور چائے کی گرم پیالی اخبار کے ساتھ میری ہتھیلی میں تھما دیتی ہے۔

''گڈ مارننگ،'' وہ مجھ سے کہتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندنا مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت عورت نظر آتی ہے اور میں سوچا کرتا ہوں وہ میری زندگی میں نہ آتی تو شاید میں پتھر بن کر کسی دیوار سے لگا رہ جاتا۔ مگر آج وہ کچھ زیادہ مسکرا رہی ہے۔ یہ مسکراہٹ بلاوجہ بھی ہو سکتی ہے — ہماری بہت سی عادتوں کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔

اس دن آفس سے میں جلدی نکلتا ہوں۔ آج میرا ارادہ نمائی گھوشال کے ساتھ سنگھوڑا سے ملنے کا ہے۔ گلی سے مڑتے وقت میں ہمیشہ کی طرح ٹیوب ویل سے بچنے کے لیے کنارے کی طرف دبنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں گرتے گرتے بچتا ہوں۔ ٹیوب ویل اپنی جگہ پر نہیں ہے۔

کیا میں کسی دوسری گلی میں آنکلا ہوں؟ نہیں، یہ گلی تو ہماری ہی ہے صرف ٹیوب ویل اپنی جگہ سے غائب ہے جس کے سبب گلی کچھ زیادہ ہی کشادہ اور قدرے اجنبی نظر آ رہی ہے۔ ٹیوب ویل کی جگہ پر کھڑے ہو کر میں دیکھتا ہوں، زمین پر ایک بیضوی سوراخ بن گیا ہے جسے مٹی سے لبالب بھر دیا گیا ہے۔

میں اس جگہ دیر تک کھڑا رہتا ہوں کہ مجھے دیوار گیر مندر کا پجاری مہالٹ گوسوامی آتا دکھائی دیتا ہے۔

''یہ ٹیوب ویل کہاں گیا؟'' میں اس سے پوچھتا ہوں جیسے وہ اس کے لیے جواب دہ ہو۔

''تیں مستری آئے تھے لکھوا۔ دن بھر کام کرتے رہے۔ سارا سامان یہاں تک کہ اندر سے زنگ کھائے ہوئے پائپ تک نکال کر لے گئے۔ آخر آپ نے یہ کر ہی دکھایا۔''

''میں نے کیا کیا ہے۔ خوامخواہ میرا نام مت لو!'' میں تنک کر کہتا ہوں اور اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں آج میرے ہر قدم پر دروازے اور کھڑکیاں کھل رہی ہیں، لوگوں کے

Scanned with CamScanner

مسکراتے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ سب لوگ اپنائیت کے ساتھ میری طرف تاک رہے ہیں۔ ایک مکان کے سامنے ایک ہاتھ رکشا بھی زمین پر ٹکا ہوا ہے جسے چلانے والا اس کے پائیدان پر بیٹھا اطمینان سے بیڑی پی رہا ہے۔ کل تک کوئی رکشا اندر نہیں آ پاتا تھا۔ اب تو یہ گلی ایسی ہو گئی ہے کہ ڈرائیور اگر راضی ہو تو ٹیکسی بھی اندر تک آ سکتی ہے۔

"سارا محلہ تم سے بہت خوش ہے۔" ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ روم سے باہر آنے پر بندنا میرے ہاتھ میں تولیہ دے کر مسکراتی ہے۔ "واقعی یہ نل یہاں سے ہٹ نہ گیا ہوتا تو ہمیں کبھی اندازہ نہ ہوتا کہ ہماری گلی کتنی کشادہ ہے۔"

"آخر گدھا گنگارام نے یہ کر ہی ڈالا۔" میں کہتا ہوں۔

"گنگارام؟" بندنا کی آنکھوں میں حیرت ہے۔ "وہ تو خود آپ کو بدھائی دینے کے لیے آیا تھا۔"

"مجھے کیوں؟ میں نے کیا کیا؟" میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ گنگارام نہیں تو یقیناً نمائی گھوشال کا کارنامہ ہے۔ مگر جلد مجھ پر یہ راز کھل گیا کہ نہ یہ نمائی گھوشال کا کام تھا نہ سائٹ انجینئر بپا رائے کا جس سے میں نے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ میں اس گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا اور اگرچہ اس دن کے بعد ہمیشہ میں ایمانداری کے ساتھ اس بات سے انکار کرتا رہا مگر سارے محلے کا خیال میرے اس انکار کے سبب اور بھی یقین میں بدل گیا۔ نہ صرف لوگ میری طرف احترام سے تاکنے لگے تھے بلکہ نگی پرمل دا بھی میری پیٹھ ٹھونکنے سے باز نہ آئے۔

"میں بھوانی شیو ٹھاکر کی بہت ساری باتیں تم میں دیکھ رہا ہوں۔"

شاید شیب ویل نے لوگوں کو کچھ زیادہ ہی ستایا تھا!

دو ہفتے گزر گئے ہیں۔ میں نے احتجاج کرنا بند کر دیا ہے۔ اب تو اس جگہ سے گزرتے ہوئے خود مجھے یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ یہ میرا ہی کارنامہ ہے۔

"یہ پی ڈبلیو ڈی والے ہوں گے۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے،" سائٹ انجینئر نے مجھ سے کہا تھا۔ "یہ اتفاق ہے کہ تمھیں اس کا خیال آیا اور انھوں نے ٹھیک وقت پر ایسا سوچا۔ یا پھر کون

جانے لوہے کا کوئی کباڑی اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر سارا سامان لے کر چلتا بنا ہو۔ کلکتہ جیسے پرانے شہر میں تو یہ روز کا قصہ ہے۔ اب اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ اچھا ہوا نا، سر درد بھی جاتا رہا اور سر بھی بچ گیا۔"

یہ اس انجینئر کے مذاق کرنے کا بھونڈا طریقہ تھا۔ بتا رائے! مجھے یہ آدمی پسند نہیں۔ میں اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح جان گیا ہوں۔ وہ صرف کام ٹالنے میں ماہر ہے۔ اگر اس نے ایمانداری سے کام لیا ہوتا تو مجھے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ہمیں زندگی میں زیادہ تر لوگ اچھے اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ انھیں آزمانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس تھوڑا سا تیزاب ان پر ڈالو اور اوپر کی دھات زائل ہونے لگتی ہے، اندر کا بھوت باہر نکل آتا ہے۔

اب اس بات کو چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ میرے آفس میں مصروفیات پہلے سے کچھ زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ شہر کے مضافات میں بڑے بڑے رہائشی علاقے بننے لگے ہیں۔ اچانک اس میگا سٹی میں لوگوں کو گھر بنانے کا جنون سا ہو گیا ہے۔ کاغذ پر پنسل کی مدد سے لکیریں کھینچتے ہوئے اب مجھے مسجد کے گنبدوں کے اوپر پھڑ پھڑاتے کبوتروں کے لیے کم موقع ملتا ہے۔ کبھی کبھی تو ان کے بیچ سورج کی ٹکیا پوری طرح پگھل چکی ہوتی ہے اور مجھے اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ پھر ایک دن میرے پاس کام نہیں رہتا اور میں چائے پیتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھ کر ہانک لگاتا ہوں۔

"کریم!"

"ہاں حضور۔" کریم کے دبلے پتلے جسم کا سیلویٹ پرانے فرنیچروں کی دھند سے ابھرتا ہے۔

"کریم، تم تو لفٹ مین کے طور پر اس عمارت میں کام کرتے تھے نا؟"

"ہاں حضور۔"

"تب تو تمھیں تنخواہ بھی ملتی ہوگی؟"

"کیسی تنخواہ حضور۔ لفٹ ہی کون سا کام کرتا ہے۔"

"کیا کہا، لفٹ کام نہیں کرتا؟ تو اس میں تمھارا کیا قصور؟ انھیں اس کی مرمت کروانی چاہیے۔"

"یہ انگریزوں کے زمانے کا لفٹ ہے۔ اب اس کے کل پرزے نہیں ملتے۔ وہ بیچارے بھی کیا

Scanned with CamScanner

کریں گے۔"

''سب ملتے ہیں۔تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ہم ہندوستانی ایک بہت ہی چالاک قوم ہیں۔ میں نے اس سے بھی پرانے لفٹ کو کلکتہ کی عمارتوں میں کام کرتے دیکھا ہے۔تم کل دس بجے مجھ سے ملنا۔ہم ٹرسٹ کے سکریٹری سے ملنے جائیں گے۔اگر انھوں نے کچھ نہ کیا تو میرا ایک دوست ہے نمائی گھوشال۔اسے کنزیومر کورٹ کے بارے میں پورا تجربہ ہے۔ہمیں اس معاملے کو ویسے بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔یہ تمھاری تنخواہ کا ہی نہیں بلکہ ہم لوگوں کے دل کا سوال ہے۔کتنی پرانی عمارت ہے یہ، کتنی اونچی اونچی سیڑھیاں ہیں اس کی،اور ہمیں کتنی ساری سیڑھیاں ہر روز طے کرنی پڑتی ہیں۔کوئی حادثہ ہو گیا تو؟ کیا لوگ کرایہ نہیں دیتے؟''

(جبکہ مجھے پتا تھا لوگ جو کرایہ دیتے ہیں اس سے اس عمارت کا میونسپلٹی کا ٹیکس بھرنا بھی ممکن نہ تھا۔)

''حضور آپ کو لگتا ہے یہ لفٹ پھر سے چلنے لگے گا؟'' کریم کی آنکھوں میں ایک روشنی جاگ اٹھی ہے۔وہ ایک نیا انسان نظر آ رہا ہے جیسے پھر سے اسے زندگی میں ایک مقصد ہاتھ آ گیا ہو۔

''بالکل۔'' میں اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا ہوں۔''اس ملک میں کیا نہیں ہو سکتا؟ صرف ہمارے مضبوط ارادے کی کمی ہے۔میں تمھیں ایک ٹیوب ویل کی کہانی سناتا ہوں جو بلا وجہ لوگوں کا راستہ روکا کرتا تھا۔"

❁ ❁

صدیق عالم

خدا کے بندے

دس کا گجر بجتے ہی آتمائیں برجوں، گنبدوں، کنگوروں سے اتر آتیں۔ وہ غیر مستعمل گرجا گھر کے ہر تاریک اور نیم تاریک گوشے پر قبضے جمالیتیں۔

"انسانوں کا کیا حال ہے؟" وہ آپس میں دریافت کرتیں۔ بھوت اگر بدصورت ہوتے تو چڑیلوں کے بال ان کے کولھوں پر گرے ہوتے۔ انھیں آتماؤں کا یہ تجسس بڑا ہی مضحکہ خیز نظر آتا۔

"مرنے کے بعد بھی لوگ ایک دوسرے کی غیبت سے باز نہیں آتے۔" وہ آپس میں سرگوشی کرتیں۔ ان کے قہقہوں سے پرانی دیواریں اور ستون ہلنے لگتے۔ "انسانوں سے کسی دوسری چیز کی امید بھی کیسے کی جاسکتی ہے؟"

چڑیلیں پورے معاملے سے بیزار لگتیں۔ انھوں نے دنیا کو ہر زاویے سے دیکھا تھا، پرکھا تھا۔ انھیں زندہ انسانوں کے کتنے ہی ٹونوں ٹوٹکوں سے گزرنا پڑتا، ان کا ستم سہنا پڑتا۔ اوپر سے انسان کا تعصب، بے جا خوف اور بے رحمی الگ۔ چڑیلیں اکثر اپنے لٹکتے پستانوں کو سہلاتی مروڑتی رہتیں۔ وہ رونے کی کوشش میں دانت کچکچاتیں، مگر آنسو پر تو بہرحال انسانوں کا قبضہ تھا — انسان جس نے اپنی آہوں سے آسمان سیاہ کررکھا تھا، انسان جس نے اپنے آنسوؤں سے سمندر کو نمکین بنا ڈالا تھا۔

مگر یہ کہانی اس کے بعد سے بھی شروع کی جاسکتی ہے۔

جس دن مرلی نسکر پوری طرح پاگل ہوا اس کے گھر کے پچھواڑے ایک کتیا نے بچے دیے۔ اس کتیا کو ایک بار مرلی نے اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کی تھی مرلی کے بال لانبے تھے اور گھر والے اس کی موت کی دعا مانگا کرتے۔ دراصل مرلی نسکر کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ آپ اس سے بڑے سے بڑے کام کی امید کر سکتے تھے۔ صرف تھوڑی سی رقم کے عوض اس نے اپنے جسم کو عام گزرگاہ بنا ڈالا تھا۔ جیب کترے اس کے پاس پیسے رکھتے اور طوائفیں اسے ساتھ لے کر ڈاکٹروں کے پاس جاتیں۔

مگر کوئی اس کے دل سے پوچھے! وہ ان جراثیم برداروں کے شوہر کی اداکاری کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کوئی صحیح معنوں میں اس کا بچہ پیٹ میں لے کر اسے گرانے ڈاکٹر کے پاس جائے —— ڈاکٹر جو بیماری کا آلہ گردن سے لٹکائے اپنی پہلی فرصت میں عورتوں کو میز پر لیٹ جانے کی ہدایت دے ڈالتے، عورتیں جو پیشے سے طوائف تو تھیں مگر جنھیں مردوں کی انگلیوں سے ٹٹولا جانا اچھا نہ لگتا۔ مگر خدا کے بعد اگر آپ کی آتما پر کسی کا پورا حق بنتا ہے تو وہ ڈاکٹروں کا ہے، جس کے بعد آپ کا جسم پوری طرح آپ کا نہیں ہوتا۔ مرلی نسکر کو پڑھنے کا شوق کولکاتا کھینچ لایا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں سوتیلے تھے اور کسی نہ کسی طرح مرلی نسکر جیسے مرض سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر کولکاتا آ کر اس نے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگائی کہ زندگی میں پڑھائی لکھائی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اس کے پاس نہ ہاسٹل کے اخراجات کے لیے پیسے تھے نہ کتابوں اور کاپیوں کے لیے۔ شاید وہ بھی دوسرے ہزاروں لڑکوں کی طرح آوارہ گردی کرتے کرتے ایک پتلی کا پی تھامے تھامے بی اے پاس کر لیتا اور کہیں کلرک یا ٹیچر کا عہدہ سنبھال کر ایک بکواس اور بزدلانہ زندگی گزارتا۔ مگر سوناگاچھی کے دلال گرجا شنکر نے اسے سنبھال لیا اور اس گھسی پٹی زندگی سے نجات دلائی۔ گرجا شنکر سے اس کی ملاقات لوکل ٹرین کے اندر ہوئی تھی جہاں سے وہ اسے اپنے ساتھ سوناگاچھی لے آیا اور مہندی لکشمی کے کمرے میں اس کا ٹھکانہ طے کر دیا۔ ٹھیک اس کے ایک ہفتے بعد گرجا شنکر کو پولیس اٹھا کر لے گئی۔ گرجا شنکر تھانے کے انچارج گیا پرساد کے لیے کوٹھوں سے ہفتہ وصولتا تھا۔

یہ بات مہندی لکشمی نے مرلی نسکر کو بتائی۔ مہندی لکشمی کی عمر ڈھلنے لگی تھی اس لیے وہ اب گاہک شاذ و نادر ہی رجھا پاتی۔ پھر بھی سوناگاچھی کے پورے امام بخش لین میں وہی سب سے مقبول

حرافہ تھی جو بیک وقت گاہکوں کے ساتھ بیٹھ بھی جاتی اور ماسی کا فرض بھی نبھاتی۔ اپنا پاپ کم کرنے کے لیے اس نے اپنی چاروں دیواروں کو دیوی دیوتاؤں کے طغروں سے ڈھک رکھا تھا۔ مرلی نسکر جیسے پڑھے لکھے لڑکوں کی مدد کرنا، یہ اس کی دوسری ہابی تھی۔ اپنے کمرے میں چادر لٹکا کر مہندی لکشی نے اسے دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اپنے حصے میں مرلی نسکر نطشے اور آچاریہ رجنیش کی کتابیں پڑھا کرتا جنھیں وہ گول پارک کی ایک لائبریری سے چرا کر لاتا اور پڑھنے کے بعد ایک سندھی کو بیچ دیا کرتا جس کی فری اسکول اسٹریٹ میں پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ دوسرے حصے میں مہندی لکشی اپنا دھندا چلاتی، کھانا پکاتی، رامائن کا پاٹھ کرتی یا اپنے فرضی شوہر نول پروہت کے لیے مانگ میں سیندور بھرا کرتی۔

''نول پروہت؟'' مرلی نسکر پوچھتا۔ ''وہ زندہ ہے تو اسے تمھارے ساتھ ہونا چاہیے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو؟ تم نے دو چار اُٹیچر کیا پڑھ لیے، پورے گیانی ہو گئے ہو کیا؟'' مہندی لکشی کہتی۔ ''اپنی بات واپس لے مرلی۔ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ پورے مندر ہاٹ میں اس کے جیسا بڑھئی کوئی دوسرا نہیں۔''

''عجیب بات ہے!'' مرلی نسکر کہتا۔ نطشے کو پڑھنے کے بعد اس کے اندر جو جوش بیدار ہوتا وہ فوراً مر جاتا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگتا اور یہ سب اس وقت تک چلتا رہتا جب تک مہندی لکشی کے دھندے کا وقت نہ آ جاتا۔ اپنے گاہک کے ساتھ مہندی جب کمرے کے دوسرے حصے میں داخل ہوتی تو ڈوری سے لٹکی چادر کا کونا کھسکا کر اپنے پان خوردہ دانت چمکا کر ہنستی۔

''بہت آنکھ خراب کر لی تو نے مرلی۔ اب کچھ ٹی وی بھی دیکھ لے۔'' اور مرلی نسکر اپنی کتابیں سمیٹ کر نکل جاتا۔ مگر کبھی کبھار وہ بھی سفید و سیاہ ٹی وی سے جا چپکتا جو گلی کے کونے میں پنواڑی کی دکان میں چلتی رہتی۔ یہاں بوڑھی اور کم عمر طوائفوں جنھوں نے اپنا پیشہ ابھی شروع نہیں کیا تھا، ناکام دلالوں، اور منتظر گاہکوں کی عجیب بھیڑ لگتی۔ یہاں گلیوں کی سرنگوں سے گزرتی ہوئی ٹھنڈی ہوا آتی۔ لوگ دیواروں پر تھوکتے یا پان کی پچکاریاں مارتے۔ اکثر ایک آدھ سیاسی لیڈر کا بھاشن بھی ہو جاتا۔ یعنی یہاں پر بھی زندگی کچھ اسی ڈھنگ سے چل رہی تھی جس ڈھنگ سے عام مصروف گزرگاہ پر چلا کرتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شریف محلوں میں لوگ گناہوں کے خوف سے سہمے دبے زندگی گزارا

کرتے ہیں جبکہ یہاں انسان کا ضمیر پاک و صاف تھا۔ سب کچھ عیاں تھا اور طوائفیں اپنا دھندا کسی دن مزدور کے انداز سے ہی چلاتیں۔ اور دلالوں کے اپنے گھر سنسار تھے اور گاہکوں کو ایک مہذب دنیا میں واپس لوٹنا ہوتا۔

صرف مرلی نسکر اس پورے منظر میں کہیں فٹ نہ ہوتا۔

تو اس نے سریندر ناتھ کالج کی یونین کے دنگوں میں پناہ لی۔ اس نے مہاتما گاندھی روڈ پر سیاسی جھنڈا اپنایا اور ٹرام کی پٹریوں کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر چھرے چمکائے۔ بم بنانے کے گر سیکھے اور کانگریس پارٹی کے ایک حمایتی غنڈے گوپل کے کان کاٹ کر اسے "کن کٹا گوپال" کی شہرت عطا کی۔ اور جب فائنل کا امتحان شروع ہوا، اس نے مہندی لکشمی کے کمرے میں لمبی نیند کی عادت ڈال لی۔ اکثر مہندی جگہ نہ پا کر اس سے لپٹ کر سو جاتی۔ وہ خواب کی حالت میں مہندی لکشمی کو ڈھکیلتا رہتا۔ مگر گاہکوں سے بے رحمی کے ساتھ پیسے جانے کے بعد مہندی کے اندر بیداری کی سکت کہاں تھی۔ وہ اس وقت تک نہ جاگتی جب تک کھڑکی سے دھوپ اتر کر اس کے چہرے کو توے کی طرح گرم نہ کر ڈالتی۔ جاگنے پر اسے مرلی نسکر پر ترس آتا۔ وہ اس کے لیے چائے بناتی، اسے ٹوتھ برش تھماتی اور اسے آڑے ہاتھوں لیتی۔

"تو پڑھنے آیا ہے کہ کیا! میں کبھی تھی میں پنچ کر رہی ہوں۔ پچیہ میری جوتی۔ تو آخر کار بھڑوا ہی نکلے گا مرلی چل بھاگ۔ جلدی سے پڑھ لکھ کر دور ہو۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"جیسے؟"

"تجھے اس سے مطلب؟ جا پڑھ لکھ کر سبھیہ سماج میں لوٹ جا۔ ڈھیر ساری لڑکیاں سیندور سج کر تیرے بچے جننے کے لیے اتاولی بیٹھی ہیں۔"

مرلی نسکر کھلکھلا کر ہنستا۔ چلو یہ بھی سہی، وہ سوچتا۔ جب یہ طوائفیں بچے جننے سے نہیں چوکتیں تو شریف گھرانے کی لڑکیاں کیوں پیچھے رہیں۔ شریف گھرانے— وہ دوبارہ کھلکھلا کر ہنستا۔ طوائفیں بھی سیندور پہنتی ہیں، بلکہ سے ناتی ہیں، شوہر کا ڈھونگ رچاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سبھیہ سماج میں جہاں بیویاں کماؤ ہوتی ہیں وہاں لوگ شوہر اور بیوی میں نہ جانے کیسے امتیاز کرتے ہوں گے؟ مرلی نسکر ہر کسی سے بتاتے ہوئے عورت مرد کے تعلقات میں استحصال کے پہلو سے بے چین تھا۔ وہ

طوائفوں کو تو سمجھ سکتا تھا، مگر بیویاں؟ اسے ان پر ترس آتا۔ صبح سے آدھی رات تک کے کاموں کے لیے انھیں تو ان کا ایک چوتھائی معاوضہ بھی نہیں ملتا، بلکہ اکثر دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑے بھی صحیح ڈھنگ کے نہیں ہوتے۔ سوناگاچھی کی حرافائیں اکثر مردوں کو، جو جنسی عمل کو ختم کرنے کا نام نہ لیتے، یوں طعنے دیتیں:

''اپنی جورو سمجھا ہے کیا، سالا۔ چل ہٹ۔ دھندے کا ٹیم ہے۔''

مگر اپنی فرصت کے لمحوں میں، یا اس وقت جب وہ ذہنی طور پر ان غلیظ لوگوں کے بیچ نہ ہوتا، وہ سوچتا، ان سب سے باہر نکلنے کا کوئی تو راستہ ہوگا۔ راستے تو کئی تھے اور اسے روکنے والا بھی کوئی نہ تھا، مگر وہاں سے نکل جانے کے بعد کون سی دنیا تھی بھلا، سوائے اس سمیہ دنیا کے، جو اسے اور بھی اوٹ پٹانگ دکھائی دیتی۔ اس نے ایک دن اپنے اندر کلبس کو جاگتا محسوس کیا۔ مگر اس نے دیکھا اس سمیہ دنیا کی شروعات دراصل ٹرام راستے پر کھڑے نگراں پولیس کے لوگوں سے ہوتی تھی جو کوٹھوں سے اپنے حصے کا ہفتہ وصولتے تھے، دلالوں کی دی ہوئی کھینی پھانکتے تھے اور طوائفوں سے گپیں لڑاتے تھے۔ اور ان سے پرے دکاندار دکانوں میں بور سے بیٹھے رہتے تھے، یا وہ بزنس مین تھے جو اپنے کالے پیسوں کو سفید کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتے، یا سرکاری آفس کے بابو تھے جو رشوت کے پیسوں سے پینتے، گاڑیوں میں گھومتے، گھروں میں ایرکنڈیشنر لگاتے اور اپنی بیویوں کی آنکھوں میں اچتا بھر چکے تھے۔ یا پھر اسکول اور کالج تھے جو ان کے لیے اپنے معنی کھو چکے تھے۔

وہ اصلی شہر کہیں تو ہوگا جس پر ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے، وہ دن ہی دن میں سوچتا۔ نہ جانے اس کے باشندے کیسے ہوں گے؟ ایک بات طے ہے، بڑا ہی دلچسپ ہوگا وہ، اور وہ اس خواب میں زندہ تھا۔ لیکن آخر میں... سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں، وہ خود کو سمجھاتا۔ اچھا فرض کرلو ہم نے اسے پالیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں کیا ہم لوگ اس کے اندر سوناگاچھی نہ اگا ڈالیں گے، کیا ٹھوس کاروباری لین دین وہاں نہ ہوگی جو ابھی ہے، کیا اس کے سیاست داں آج سے کچھ مختلف ہوں گے؟ کیا اس شہر کی تاریخ اس سے جدا ہوگی جو ہم موٹی موٹی کتابوں میں بچا کر رکھتے ہیں؟

''مرلی نسکر، تو ہندو ہے؟''

''ہاں۔''

Scanned with CamScanner

''جھوٹ، تیرے پاس قرآن ہے۔''

''بائبل بھی ہے، گیتا بھی ہے۔''

''چل پتلون اتار کر دکھا، آج فیصلہ ہو جانا چاہیے، مجھے لگتا ہے تو مسلمان ہے۔''

''اگر میں مسلمان نکلا تو اس سے نہ تیری دنیا بدل جائے گی نہ میری۔ مگر تیرا دھیان اس بات کی طرف کیوں گیا؟ ٹی وی میں خبریں بہت دیکھنے لگی ہے لکشمی۔ آج کل دھرم کے نام پر لوگ اپنی سیاست چمکانے میں خوب مصروف ہیں۔''

''تو ڈرتا ہے؟''

''ہاں۔''

''کس سے؟''

''یہ پتا ہوتا، تو اس ڈر کو نہ سمجھ لیتا، اسے مار نہ ڈالتا؟''

''کیسے مار ڈالتا...؟'' مہندی لکشمی کا ذہن گڈمڈ ہو جاتا۔ مرلی نسکر مسکراتا۔

''مہندی، کتنے سارے دیوی دیوتاؤں کو تم نے دیواروں سے ٹانگ رکھا ہے۔ کوئی تمھارے بارے میں نہیں سوچتا؟''

''کیسے نہیں سوچتا؟ اس عمر میں اتنے سارے گاہک کیا آسمان سے ٹپک کر آتے ہیں؟ یہ تو انھیں دیوی دیوتاؤں کی کرپا ہے۔''

''میرا مطلب ہے...'' پھر مرلی ہار مان کر مسکراتا۔ ''ہاں، وہ تو ہے۔''

''پھر؟'' مہندی لکشمی اپنی جیت سے سرشار چھت کی دھوپ میں بال سکھانے بیٹھ جاتی۔

''یہ میرے بچپن کی بات ہے...'' وہ جاری ہو جاتی۔ ''ان دنوں سکہ ماں کا دور دورہ تھا۔ میں لال فیتہ لگا کر اسکول جاتی۔ میرے جوبن کے ابھار سے پہلے ہی میرے دو عاشق پیدا ہو گئے، بلّا اور تارا۔''

''تجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تو بھی ایک ویشیا کی بیٹی تھی۔''

'وہ تو ہے۔ تو بلّا اور تارا میرے دو عاشق تھے۔ بلّا کو کتوں سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ کیلف اسٹریٹ سے کتے چرا کر لاتا اور مجھے تحفے میں دیتا۔ بڑے پیارے پیارے کتے ہوتے، گھنے بالوں

والے، جنّوں جیسی آنکھوں والے، کبھی کبھی بغیر دُم کے، کبھی بالکل ہی چھوٹے چھوٹے پاؤں والے جیسے ان کے گھٹنوں سے نیچے کا حصہ زمین کے اندر ہو۔ تارا کم بولتا تھا۔ سکے ماسی کا چھوڑا ہوا جاسوس تھا پولیس کے لیے بھی مکھبری کرتا تھا۔ تو ایک دن بلّا اور تارا میں استرا چل گیا۔ پھر دونوں جانے کہاں غائب ہو گئے۔"

"عجیب کہانی ہے تیری بھی، مہندی۔ نہ سنو تو دل تجسس سے بے چین، سنو تو اس میں کوئی دم نہیں۔"

"کیا؟"

"میرا مطلب ہے کہانی اچھی تھی۔ بس تو اس میں ذرا پہلے سے آ گئی لگتی ہے۔"

"چل جا مرلی۔ میری جندگی کہانیوں سے بھری ہے۔ تیری طرح نہیں کہ بس پنسک ہی پنسک۔ میں بتاؤں، ایک بار ایک گجراتی سیٹھ مجھے بمبئی لے جانے کے لیے بے چین ہوا تھا۔ میں اس وخت بہت کم سن تھی۔ میں نے اس سے پوچھا بمبئی میں کیا ہے سیٹھ؟ اس نے کہا سمندر ہے۔ میں نے پوچھا سمندر کے علاوہ کیا ہے؟ بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ بڑی بڑی عمارتوں کے علاوہ کیا ہے؟ فلم نگری ہے۔ تو میں نے پوچھا وہاں سونا گاچھی ہے؟ اس نے کہا، اس سے بھی بڑی بڑی۔ مثلاً؟ میں پوچھ بیٹھی۔ محمد علی روڈ! تو وہاں سے کوئی مہندی لکشمی کیوں نہیں اٹھا لیتا بھڑوے؟ اس پر اس نے سکے ماسی کو میرے خلاف اتنا بھڑکایا، اتنا بھڑکایا کہ مجھے کوٹھی چھوڑنی پڑی۔ بعد میں سکے ماسی خود مجھے واپس لینے آئی۔ مگر تب تک میرے دن پھر چکے تھے۔"

زیادہ تر وقت مرلی نسکر چھت کی کمزور منڈیر پر جھکا ماؤتھ آرگن پر کسی ہندی فلمی گیت کی مشق کیا کرتا۔ اسے کوئی گاہک مہندی لکشمی کے بستر پر چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ اس مشق سے اکتا جاتا تو دور تک ان کھنڈر نما پرانی عمارتوں کے سلسلوں کو تاکتا رہتا جن کی چھتوں میں طوائفیں نہاتیں دھوتیں، کھانا بناتیں، بچے کھلاتیں اور چھت کی دھوپ میں بال سکھاتی نظر آتیں۔ نیچے خدا کی مخلوق اپنی زندگی جی رہی تھی، اوپر خدا کا بنایا ہوا آسمان تھا جس میں انسانوں نے جگہ جگہ پتنگ ٹانگ رکھے تھے جیسے ان کی ڈوریوں سے یہ زمین اور اس کی کھنڈر نما عمارتیں لٹک رہی ہوں۔ وہ سوچتا، میرے یہاں ہونے کا مقصد؟ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ سوچتا، یہاں نہ ہو کر بھی میں کون سا تیر مار لیتا؟ تو وہ مڑ کر

مہندی لکشمی سے مخاطب ہوتا۔

''اچھا مہندی، میں اگر چل گیا بلا اور تارا کی طرح، تمھیں یاد رہوں گا؟''

''نہ تُو میرا بلا نہ تُو میرا تارا، تجھے یاد کرنا کیا نہ کرنا کیا۔''

''تبھی تو میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ کسی کو تو میری فکر ہو!''

اور اس دن مرلی نسکر نے سوچا اسے ایک نئی شخصیت چاہیے، اور اس نے مونچھیں اگانا شروع کر دیا۔ مگر اس معاملے میں اسے کسی کی مدد چاہیے تھی۔ گرجا شنکر؟ اب گرجا شنکر سے اس کے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ گرجا شنکر چونا گلی کی ایک طوائف سے بیاہ رچا کر کونٹ روڈ پر تین نمبر پل کے نیچے یک منزلہ جھونپڑی کھڑی کر چکا تھا اور بچے اگانے میں مصروف تھا۔ اس نے چور گاردس میں چائے کی ایک دکان بھی کھول لی تھی جہاں کچھ لوگ اڈا دینے جاتے۔ ایک دن مرلی نسکر کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اسے لکڑی کی بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے آنکھ ماری۔

''کس نے کہا تجھ سے مونچھ اگانے کے لیے؟ ویسے اس میں تو اتنا برا نہیں لگتا۔ مگر کس نے کہا؟''

''دل نے۔''

''دل کی بات مانا کر۔ میں نے دل کی بات مانی، اب دیکھ میرے تین بچے ہیں اور میری یہ چائے کی دکان کچھ بری نہیں چلتی۔ اور تیری بھابھی ہر دوسرے مہینے بیمار پڑتی رہتی ہے۔''

''کون سی بیماری؟''

''عورت کی بیماری۔ اس سے زیادہ نہیں پوچھا کرتے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں اب ہمارے حالات اتنے تو برے نہیں مگر اتنے اچھے بھی نہیں رہے۔''

''تم پچھتا رہے ہو، گرجا؟''

''میں نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں، آدمی ہر بار بدل کر خود کو ہی پاتا ہے۔''

واپسی میں ایک سنسان گلی میں ایک غیر مستعمل گرجا گھر کے پھاٹک کے سامنے مرلی نے پیشاب کرنے کے بعد زپ اوپر کھینچی تو اس کا عضو تناسل اٹک گیا۔ درد سے اس کی چیخ نکل گئی، آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ احتیاط سے زپ کو گرا دینے کے بعد وہ ڈھلواں پھاٹک کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس کا

سینہ کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور ٹیس کے مدھم پڑنے کا انتظار کرتا رہا۔ درد کی متواتر ٹیس ابھر رہی تھی جیسے اس کی ملائم جلد کو کوئی چیونٹی رہ رہ کر کاٹ رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس درست ہوئے تو اسے زخم کی جگہ دیکھنے کی ہمت ہوئی۔ کہیں خون بہہ نہ گیا ہو۔ اس نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک بھاری بھرکم زنجیر لٹک رہی تھی۔ مگر جنگلوں کے نچلے حصے کو آگے پیچھے ہلا کر اتنی جگہ نکال لی گئی تھی کہ انسان کسی قدر محنت کے بعد اور کتے آسانی سے اندر جا سکیں۔ وہ بھی اندر پہنچ کر دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اس نے رپ کو نیچے سرکایا۔ ایک جگہ جلد اس طرح کٹ گئی تھی کہ خون کی ننھی ننھی بوندیں نکل کر رہ گئی تھیں۔ رپ لگا کر وہ گرجا گھر کے ٹوٹے پھوٹے صحن پر چلتا ہوا چبوترے کے پاس پہنچا اور ایک کہنہ پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس نے سر کو جھکا لیا۔

گرجا گھر کی کھڑکیوں کے زیادہ تر شیشے دھندلے مگر محفوظ تھے۔ داخلے کے چوبی دروازے کا ایک سرا ٹوٹ کر پیچھے لٹک گیا تھا۔ یقیناً کچھ لوگوں نے اس کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور نکال لیا ہوگا۔ اس رخنے سے گرجا گھر کے اندر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہاں بائیں طرف ایک مرغولے دار سیڑھی مینار کی طرف چلی گئی تھی۔ اندر سے چمگادڑوں کی بیٹ کی مہک اتنی دور تک آ رہی تھی۔

اگلی بار اس کی گرجا شنکر سے ملاقات اس کے ٹھکانے پر ہوئی تو اس کے چہرے کا رنگ گرا ہوا تھا۔ گرجا نے سر منڈا لیا تھا۔ اسے شدید بخار بھی تھا۔

"تمھیں کمبل اسپتال جانا چاہیے،" مرلی نے مشورہ دیا۔ یہ اسپتال سیالدہ اسٹیشن کے قریب واقع تھا۔

"میں جا چکا ہوں۔ انھوں نے میرے خون کی جانچ کی ہے۔ کل رپورٹ مل جائے گی۔" اس نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا جسے سیا دلاری بنا کر لائی تھی۔ سیا دلاری کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ کبھی وہ چونا گلی میں جسم بیچا کرتی ہوگی۔ تین لگاتار بچوں کے بعد اس کا جسم پھیل گیا تھا۔ سیندور وہ جم کر لگاتی تھی اور بلاناغہ پوجا پاٹ میں لگی رہتی۔ ان کی غیر قانونی جھونپڑی ریلوے کی پٹری سے بس ہاتھ بھر کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ جھونپڑی کے کھلے آنگن میں ایک پتلے بانس پر بھگوا جھنڈا لہرا رہا تھا جس میں ہنومان جی ایک ہاتھ میں گدا اور دوسرے ہاتھ میں پہاڑ اٹھائے اڑ رہے تھے۔ پٹری پر لوکل ٹرین ہر دس منٹ پر دوڑا کرتی اور جھونپڑی کو ہلاتی رہتی۔ تینوں بچے پٹریوں کے آس پاس رینگتے ہوئے

بڑے ہو رہے تھے۔

''مجھے تو تیرا پہلے کا دھندا زیادہ معنی رکھتا دکھائی دیتا ہے،'' مرلی نسکر نے کہا۔ ''اور بھابھی کا تو تو نے ستیاناس ہی کر دیا۔''

''تو جا بھڑوا گیری کر!'' گرجا شنکر نے غصے سے کہا۔ ''تو ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ کسی رنڈی کا رکھیل بن جا، مرلی۔ اس سے زیادہ تیرا دوسرا کوئی مصرف بھگوان کے پاس بھی نہ ہوگا۔''

''چائے اچھی تھی بھابھی،'' مرلی نے کہا۔ ''بس ایسا ہے کہ میں ذرا دل کی بات کرتا ہوں۔ مجھے وہ، انگریزی میں کیا کہتے ہیں Verbal Diarrhoea ہے۔''

''کیا... کیا؟'' دونوں پتی پتنی نے ایک ساتھ کہا۔

''جانے دو،'' مرلی نسکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگلی بار آؤں گا تو بچوں کے لیے چاکلیٹ لاؤں گا۔''

''اور اس کے بعد بغیر چاکلیٹ کے آؤ گے تو بچے تمہارے بارے میں کچھ اچھا نہیں سوچیں گے،'' گرجا شنکر کھانستے ہوئے ہنسا۔ ''اس چکر میں مت پڑنا مرلی۔ بچے پالنا کوئی آسان کام نہیں اور بچے کسی کام کے نہیں ہوتے۔ یہ بڑے ہو کر اپنی دنیا کے ہو رہتے ہیں، ہماری طرح۔''

دوسرے ہفتے مرلی نسکر جب گرجا شنکر کے چائے کے اڈے پر پہنچا تو وہ اڈا اٹھ چکا تھا۔ ریلوے کی پٹری کے کنارے جھونپڑی بھی توڑ دی گئی تھی۔ اس نے آس پاس کے لوگوں سے پتا چلانے کی کوشش کی مگر کوئی گرجا شنکر کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ ویسے بھی پٹری کے کنارے کوئی آبادی تو تھی نہیں صرف جھاڑیاں تھیں یا ایک متروک ریلوے یارڈ کے ٹوٹے پھوٹے سائبان اور کھمبے۔ مرلی چاکلیٹ کھاتا ہوا کولکاتا کی سڑکوں پر لایعنی نظریں ڈالتا واپس لوٹا۔ اس نے مہندی لکشمی کو یہ عجیب و غریب واقعہ بتایا۔

''گرجا نے ٹھکانا بدل لیا ہوگا،'' مہندی نے پان کی پیک کونے میں مارتے ہوئے کہا۔ ''بڑا چالاک ہے گرجا۔ چونا گلی کی سب سے خوبصورت رنڈی سیا دلاری پر ہاتھ مار دیا۔''

''ویسے گرجا بہت بیمار تھا، مہندی۔''

''یہ پہلے کیوں نہ بتایا؟ اسپتال دیکھا؟''

''بس یہی چوک ہوگئی،'' مرلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''کمبل اسپتال سے ضرور کچھ پتا چل جائے گا۔'' مگر اتنے بڑے اسپتال میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں آتے، سیکڑوں کی تعداد میں ڈسچارج ہوتے۔ گرجا شنکر کے بارے میں پتا لگانا مشکل کام تھا۔ کئی دن تک مرلی دواؤں سے مہکتے اسپتال کے گلیاروں میں گھومتا پھرا۔ پھر ایک عقل مند دربان نے اسے مردہ گھر کے بارے میں بتایا۔ مگر وہاں بھی رجسٹر میں گرجا شنکر کا نام نہ تھا۔

''میں اب بھی کہتی ہوں، گرجا شنکر نے ٹھکانا بدل لیا ہوگا،'' مہندی لکشمی بولی۔ ''جس کی اتنی خوبصورت جورو ہو، اسے ٹھکانا بدلتے رہنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ گریب کی جورو سارے محلے کی بھابی ہوتی ہے۔''

''تو تو بس مہندی، سٹھیا گئی ہے،'' مرلی نے کہا۔ ''جانے گاہک تیرے میں کیا مزہ لیتے ہوں گے۔''

''گاہک اپنا مجا خود لے کر آتے ہیں۔'' مہندی اپنے پان خوردہ دانتوں سے مسکرائی۔ ''ہم لوگ تو بہانے بھر ہیں۔''

''واقعی... !'' مرلی مسکرایا۔ ''میں نے اس نظر سے اس بات کو کبھی نہیں دیکھا۔''

اور اس دن سے اس نے گلی میں آنے والوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ واقعی یہ ایک حقیقت تھی، یہ لوگ اپنا مزہ خود لے کر آتے تھے: بھوکی آنکھیں، رال ٹپکاتے ہونٹ۔ گلی میں دو رویہ کھڑی ویشیاؤں کے سراپے پر گدھ کی نظریں ڈالتے ہوئے یہ لوگ۔ کمسن، دراز عمر، بوڑھے، جوان، شادی شدہ، غیر شادی شدہ، رنڈوے۔ اگر وہ اس مہانگر کی گلیوں میں آوارہ گھومنا شروع کر دے تو ان میں ہزاروں کو پہچان لے۔ مگر اس سے حاصل؟ کیا اس سے اس کی اپنی یا ان کی دنیا بدل جائے گی؟

اس نے دھیرے دھیرے دلالوں کے ساتھ بیٹھنا شروع کر دیا — لالہ، رحیم، ہنچے، گلاب چند۔

''کنگن کوتا کی چھوریاں بس دیکھنے لائق ہوتی ہیں،'' لالہ چھتیس گڑھ کے ایک گاؤں کا ذکر کر رہا تھا۔ ''ان شہری لڑکیوں کی طرح چلبلی نہیں۔ بدن انار کی طرح گدرا، انگلی سے ٹھونگو کر تن۔ مگر سالیاں کو لگاتا آتا نہیں چاہتیں۔''

''بنگلہ دیش کی لڑکیوں نے سالا یہاں بجار کھراب کر دیا ہے،'' ہنچے نے کھینی ٹھونکتے ہوئے

کہا۔ ''اور دیکھئے، آج کل کتنی کمسن لڑکیاں چلی آرہی ہیں۔ ابے گلاب۔۔۔'' اسے یاد آیا۔ ''ابے لاریٹو کی جو لڑکی آئی تھی، اب نظر نہیں آتی، کیا نام تھا اس کا؟''

''اس کا بیاہ ہو گیا ہے گا۔'' رحیم کھلکھلا کر ہنسا۔ اس کے دانت پیلے ہو رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے اور گلی میں داخل ہونے والوں پر نظریں بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن مہندی لکشمی نے اسے وہاں سے بلوا بھیجا۔ ایک ادھیڑ عمر کا ناٹا آدمی مرلی کا انتظار کر رہا تھا۔

''سیا دلاری،'' مہندی نے پان خوردہ دانتوں کو چمکاتے ہوئے کہا۔ ''وہ چوتا گلی میں تیری باٹ جو رہی ہے۔''

''معاملہ کیا ہے؟'' مرلی نے ناٹے آدمی سے پوچھا جو مہندی لکشمی کی بنائی ہوئی چائے سڑپ رہا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' وہ بھی کوئی دلال ہی تھا۔ ''بس سیا دلاری نے پرارتھنا کی، سو تم تک سندیس پہنچادیا۔ اچھا بھابی، کبھی کو تو جرورت آن پڑے تو یاد رکھیے گا۔ میرا نام ہری ناتھ ہے۔''

'تو چوتا گلی نہیں جائے گا؟'' ہری ناتھ کے جانے کے بعد مہندی لکشمی نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کارن؟''

''اب کسے کسے کارن دیتا پھروں بھلا۔ بس نہیں جاتا۔''

مگر اس نے جھوٹ کہا تھا۔ فرصت ملتے ہی وہ سیدھا چوتا گلی کی طرف نکل گیا۔

اس نے سیا دلاری کو اپنے تین بچوں کے ساتھ چوتھے مالے پر لکڑی کے ایک کھوکے کے اندر بیٹھا پایا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس نے مرلی کو دیکھ کر اپنا بھاری پستان ساڑی کے آنچل سے چھپا لیا۔

''گرجا کدھر کو ہے سیا؟'' مرلی نے پیش کردہ موڑھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اسے چوتا گلی نہیں بھا رہی تھی۔ یہاں آس پاس کی گلیوں سے چمڑے کے گوداموں کی کتنی سڑاند بہہ کر آتی تھی، جیسے جراثیم ہوا میں تیر رہے ہوں۔

''میرے کو کیا معلوم،'' سیا دلاری بولی۔ ''بس ایک دن وہ دکھائی نہیں دیا۔ سارا سب مرد ایک

جیسے ہوتے ہیں۔"

مرلی کو پتا تھا وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ اس نے پہلی بار سیا دلاری کے سراپے کا جائزہ لیا۔ اگرچہ اس کا جسم پہلے کی طرح نہیں رہ گیا تھا مگر چوتا گلی لوٹنے کے بعد شاید اس کا کھویا ہوا کچھ واپس لوٹنے لگا تھا۔ مرلی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"گاہک لینے لگی ہو؟"

"ابھی تو نہیں۔" سیا دلاری بولی، پھر دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ "مجھے ایک آدمی چاہیے۔"

"وہ بری ناتھ کیا بھاہے؟"

"نہیں۔" سیا دلاری بولی۔ "تو آدمی چاہیے۔"

"آج کل گاہک اپنی پسند کی رنڈیاں خود ڈھونڈ نکالتے ہیں، بڑی طاقتور ٹیکنیکس لے کر آتے ہیں۔" مرلی نے ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنے کے لیے کہا۔

"میں بیچے کمزری نہیں ہو سکتی۔" سیا دلاری بولی۔ "میرے تین بچے ہیں۔"

"انھیں اناتھ آشرم میں ڈال دو۔"

"تم ہی ڈال آؤ۔" مرلی نے دیکھا سیا کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں۔ مرلی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "ایسی نرم پڑے گی تو جی سکے گی سیا؟ میں وعدہ نہیں کرتا، مگر گرجا کا لحاظ ہے مجھے۔ گرجا نے ایک بار مجھے بھڑواگیری کے طعنے دیے تھے، آج اس کی جورو مجھے اس راستے پر لگا رہی ہے۔"

"جیون کے سارے راستے ایک ہی جیسے ہیں۔" سیا دلاری اپنی ساڑی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "کہیں پر کچھ اچھا ہے تو کہیں پر کچھ برا۔ مگر کل ملا کر سب ایک ہی جیسا ہے۔"

"یہ تو میں نے کسی کتاب میں بھی نہیں پڑھا۔"

"سیا دلاری سے پڑھ لے۔" اس نے بچے کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا اور اپنے بالوں پر کنگھی کرنے لگی۔ مرلی کے سامنے ہی اس نے اپنی ساڑی بدلی، بال باندھے، میک اپ کیا، بندیا چپکائی اور اس سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کسی ماڈل کی طرح اپنے داہنے کولھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ مرلی کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ واقعی سیا دلاری بڑی خوبصورت تھی۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔

"آنکھیں پھیر لیا!" سیا کی آواز آئی۔ "میں اچھی نہیں لگتی نیکو؟"

"اپنے گاہکوں سے پوچھنا۔"

"تم سے پوچھتی ہوں۔"

"نہیں۔"

"پھر تو گاہکوں سے پوچھنا پڑے گا۔" سیا دلاری مسکرائی۔ "مرلی، گرچہ تیرے بارے میں جتنا سنا تھا اس سے کم نہیں تو۔ ارے تُو تو بھڑووں سے بھی گیا گزرا ہے۔"

اسے سیا کے لیے گاہک جٹانے میں کٹھنائیاں آرہی تھیں۔ زیادہ تر گاہک کمسن لڑکیاں مانگتے تھے۔ مگر اس نے دیکھا ایک بار جو گاہک سیا کے پاس آتا وہ بار بار آتا۔ مہندی لکشمی کو اس کے اس کام کا پتا جب چلا جب مرلی نے خود اسے بتایا۔ مہندی لکشمی کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی.

"مرلی، تو بھی بھڑوا!" اس نے کہا۔ "ہے بھگوان، میں نے کیا کیا سپنے دیکھ رکھے تھے تیرے لیے۔"

"تو سپنے بہت دیکھتی رے۔" مرلی ہنسا۔ "اور یہ بری عادت ہے مہندی۔"

چھ ماہ کے اندر اندر سیا دلاری بزنس میں پوری طرح واپس آگئی۔ اس کے بہت سارے پرانے گاہک بھی اس کے پاس لوٹ آئے۔ ان میں سے بہت سے تو سماج میں بڑے کامیاب بیوپاری بن کر ابھرے تھے۔ آدھی رات کو تھکا ماندا جب وہ مہندی لکشمی کے پاس لوٹتا تو وہ اسے آڑے ہاتھوں لیتی۔

"سالا پی کر آنے لگا ہے مرلی! سیا نے تجھے کھراب کر دیا، سالی چھنال۔"

"گالی دے لے، پن یاد رکھ... " مرلی نشے کی دھن میں بکتا جاتا۔ "وہ چوتا گلی کی چندرمکھی ہے۔"

"اور میں، میں کچھ نہیں؟" مہندی لکشمی غرائی۔

"تم ایک پرانی ہانڈی ہو۔ تیرے اندر سب راکھ رہ گیا ہے مہندی۔"

اور مہندی لکشمی جوتی لے کر اس پر پل پڑتی۔ وہ مار کھاتا جاتا اور سیڑھیوں اور دالانوں میں بھاگتا رہتا۔ باقی رنڈیاں کھلکھلاتے ہوئے اس دوڑ دھوپ کا مزہ لیتیں اور جب دونوں تھک جاتے

مرلی مہندی آشی کے سینے پر سر رکھ کر کہتا:

''مجھے زور کی بھوک لگی ہے مہندی۔ سب کچھ کتنا خالی خالی سا لگتا ہے۔ شاید روٹی سے بھر سکے۔''

اور مہندی اس کے لیے روٹی سینکنے بیٹھ جاتی۔

پچھلے تین دن سے سیا وادری نے کوئی گاہک نہیں لیا تھا۔ اب وہ اپنا کمرہ بدل چکی تھی۔ نئے کمرے میں ٹی وی اور ریفریجریٹر آ چکے تھے۔ اس نے بچوں کو سنبھالنے کے لیے ایک آیا بھی رکھ لی تھی۔ ان دنوں وہ سلائی مشین پر سلائی سیکھ رہی تھی۔ اسے سلائی سکھانے ایک ٹوپی پہنے داڑھی والے مولانا آتے۔

''سیا؟''

''ہاں۔''

''ایک بات پوچھوں؟''

''نہیں۔''

مرلی نے سر کھجا کر کتاب کے اندر ناک ڈبونے کی کوشش کی۔

''کیا پوچھنا چاہ رہے تو؟'' تھوڑی دیر بعد سیا نے سلائی مشین پر اپنا کام روکے بغیر کہا۔

''گرجا کا آخر کیا ہوا؟''

''میں نے بتایا نا، میں نہیں جانتی۔''

''تم بتانا نہیں چاہتی۔''

''کیا گرجا کے بغیر جندگی نہیں چل رہی؟'' مشین کی کھٹ کھٹ۔

''عجیب بات ہے۔'' یکایک مرلی کتاب رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسٹول پر بیٹھی سیا کے پیچھے رک کر اس کی گوری ملائم گردن کو سہلانے لگا۔

''کیا چاہیے تجھے؟'' سیا نے گردن اس کے ہاتھوں سے دور لے جاتے ہوئے اس کی طرف غصیلی آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔

Scanned with CamScanner

"آج تو تو نہا بھی چکی۔ مجھے بھی تو عورت کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"دور ہٹ!" سیا اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی "کھمر دار جو مجھے ہاتھ لگایا۔"

"مگر کیوں؟" مرلی نے اچنبھے سے کہا۔ "اگر تو سمجھتی ہے کہ میں مفت میں چاہ رہا ہوں تو میں پیسہ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"مرلی، میں کہتی ہوں، کھبردار جو کریب آیا۔" اس نے جھک کر اسٹوو کے اوپر سے ٹھنڈا توا اٹھا لیا۔

"کمال ہے!" مرلی نے دستبردار ہوتے ہوئے کہا۔ "تو ختم ہو گیا؟ ایک ویشیا۔"

"ہاں، مگر سب کے لیے نہیں۔"

"میں کام چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اپنے لیے کوئی دوسرا بھڑوا ڈھونڈ لے۔"

"مرلی!" مرلی کو اپنے پیچھے سیا کی سسکی سنائی دی۔ "تجھے پتا بھی ہے گرجا کو کیا ہوا تھا۔ کتنی بھیانک بیماری ہو گئی تھی اسے۔"

مرلی مڑا۔ سیا کی آنکھوں میں کاجل کے قطرے تیر رہے تھے۔

"کھون کا رپٹ ملتے ہی اسے پولیس نے حراست میں لے لیا تھا،" وہ بولی۔ "پولیس والے ہمیں بھی پکڑنے آئے۔ مگر میں اپنے بچوں کے ساتھ بھاگ نکلی۔"

"گرجا اب بھی پولیس کی حراست میں ہے؟"

"وہ اسپتال سے بھاگ نکلا اور اس نے لوہا پل کے نیچے ریل سے کٹ کر جان دے دی۔"

مرلی کا سر چکرانے لگا۔ اس کے پاؤں جواب دے گئے اور وہ سیا کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "اور تو، سیا؟ تجھے بھی یہ بیماری ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ میں نے کبھی جانچ نہیں کروائی۔"

"مجھے پاس پھٹکنے تو نہیں دیتی۔ کچھ تو گڑبڑ ہے۔"

"میرے پاس تیرے ساتھ جاسی بات کرنے کے لیے ٹیم نہیں ہے۔" سیا سلائی مشین پر بیٹھ گئی اور کھٹ کھٹ۔ "اور اب شاید تو میرے کسی کام کا بھی نہیں۔ جا میں کوئی نوا آدمی ڈھونڈ لے گی۔" مشین کے شور کے بیچ اس کی آواز ابھری۔

Scanned with CamScanner

مرلی کو واپس پا کر مہندی لکشمی خوش تھی۔ وہ مرلی کی نئی کتابوں پر پیار سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مگر مرلی کم گو اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔

''سیا نے تجھے نکال دیا؟'' مہندی چہکتے ہوئے بولی۔

''مہندی، اب بس بھی کر!'' مرلی نے کہا۔ پھر مہندی نے کبھی سیا کا ذکر نہیں چھیڑا۔

ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے سلسلوں میں ایک قریبی مسجد کی اذان بلا تفریق ہر کمرے میں پھیلا کرتی۔ مرلی کمزور منڈیر پر جھکا چیل کوّوں سے لیس آسمان کو تاک رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ماؤتھ آرگن کو بھی ہونٹ سے لگا لیتا مگر اسے بجانا بھول جاتا۔ نیچے گاہکوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے خلا میں تھوک کر اپنے گھنے بالوں کے اندر اپنی انگلیاں پیوست کیں۔ مرشد آباد سے آئی ہوئی طوائف موری بی اپنے بچے کو کالکھ کا ٹیکا لگا رہی تھی۔

''مرلی، تو شادی کیوں نہیں کر لیتا؟'' اس نے پوچھا۔

''کس سے؟ کون مجھ سے شادی کرے گا موری بی؟''

''کون نہیں کرے گا؟''

''یہ بھی کوئی جواب ہوا بھلا!'' مرلی نے گہرے آسمان میں تاکتے ہوئے کہا جہاں بادلوں کے بیچ سرخ دھاریاں تیر رہی تھیں۔ ''جانے اس میں کوئی پرابلم ہے بھی کہ نہیں۔'' اس نے خود سے کہا اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے گلی میں اُتر آیا جہاں ایک نتھی زمین پر لیٹی درد سے کراہ رہی تھی۔ کچھ خاموش بچے تماشائی بنے اسے گھیرے کھڑے تھے۔

'جاؤ، بھاگو گھر۔' مرلی نے انھیں بھگا دیا۔ وہ تیزی سے چونا گلی کی طرف جا رہا تھا۔ سیا نے اسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

''سیا، تمہیں یہ دھندا بند کرنا ہوگا۔'' مرلی نے کہا۔ ''میرے کو تجھ سے شادی بنانے کا ہے۔''

''میں تجھ سے شادی کرنے کے لیے مری جا رہی ہوں!''

''تجھے ہر حال میں دھندا بند کرنا ہوگا۔ تو یہ خطرناک مرض نہیں پھیلا سکتی۔''

Scanned with CamScanner

"کس نے تجھ سے کہہ دیا مجھے کوئی بیماری ہے؟ اور کون بھرے گا ہمارا پیٹ...؟" سیا مسکرائی۔ "سیا دلاری کا بھڑوا؟"

"ہاں،" مرلی نے کہا۔ "میں تیرے بچوں کی پرورش کرے گا، تیری جانچ کرائے گا۔"

پل بھر کے لیے سیا خاموش رہی۔ پھر جیسے اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا۔

"دور ہٹ میری نظروں کے سامنے سے، دور ہٹ، دور ہٹ، دور ہٹ، دور ہٹ..."

اپنے جنون میں اس نے چاقو کو نہیں دیکھا تھا جو مرلی کے بائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا۔

مرلی نسر کے پاگل پن کی خبر پورے سوناگاچھی میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مہندی کاشی کتیا کے نوزائیدہ بچوں کو اٹھا لائی تھی اور ان کی دیکھ بھال میں مصروف تھی جب اسے یہ اطلاع ملی۔ وہ دوڑی ہوئی مرلی تک گئی مگر اس نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ کچھ باوردی پولیس والے مرلی کے پیچھے لگے تھے کیونکہ اس پر چونگلی میں سیا دلاری کے خون کا الزام تھا۔ پولیس والے دوسرے دلالوں کی مدد سے اسے باندھ کر لے تو گئے مگر کچھ دنوں بعد وہ واپس آ گیا۔ اس نے مہندی کاشی کی بالکنی کے نیچے اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ بڑے بڑے بالوں اور داڑھی کے اندر اس کا چہرہ یوں نظر آنے لگا تھا جیسے وہ اپنی صلیب سے کچھ ہی فاصلے پر ہو۔ زیادہ تر وہ دیوار سے پیٹھ لگائے گلی سے گزرتے لوگوں پر ہانک لگایا کرتا۔

"اس سے دور رہو، اس سے دور رہو، اس کے اندر بچھو کلبلا رہے ہیں، اس سے دور رہو!"

مہندی نے اس کی یادداشت واپس لانے کے لیے اس کی ساری کتابیں اس کے پاس بھجوا دیں مگر وہ کتابیں اس کے پاس پڑی کی پڑی رہیں۔ اس نے انھیں کھولا تک نہیں۔ پھر ایک دن وہ انھیں اٹھا کر ایک نالے میں پھینک آیا۔

"ان سے دور رہو" اس نے نالے کے کنارے بیٹھے دست کرتے بھکاری سے کہا جو اپنی اکلوتی آنکھ سے اسے تاک رہا تھا۔ "اچھی چیزیں نہیں ہیں یہ، ان کے اندر بچھو کلبلا رہے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

گرجا گھر کے نیم اندھیرے میں آتمائیں گرتی پڑتی داخلے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔
گرجا شنکر کی آتما نے ہاتھ پھیلا کر انھیں روکا۔
''وہ سیا ہے،'' اس نے کہا۔''سب دور رہو۔''
مگر آتمائیں اس کے اندر سے نکلتی چلی گئیں۔ سیا دلاری کی آتما اپنے لمبے لمبے بال بکھیرے نوکیلی دیوار پر چل رہی تھی۔
''دیکھو دیکھو!'' وہ کہہ رہی تھی۔'' ب مجھے کیا کچھ آ گیا ہے۔''
وہ ننگی تھی اور خوبصورت تھی اور اس کی آنکھیں سبز تھیں اور اس کے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا اور اس نے گرجا کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ گرجا نے اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے اس کی آنکھیں نکالنے کی کوشش کی۔
''کیوں؟'' سیا کی آتما نے احتجاج کیا۔ مگر اس کی ایک آنکھ گرجا نکال چکا تھا، جس سے لاپروا اس کی دوسری آنکھ مٹک رہی تھی۔
''تم میرے بچوں کو کیوں چھوڑ آئیں؟''
''وہ ہمارے بغیر زیادہ خوش ہیں،'' سیا کی آتما نے کہا۔'' اور مرلی نے آتم ہتیا کر لی ہے۔ وہ چھت پر ہوگا۔''
ساری آتمائیں گرتی پڑتی چھت کی طرف بھاگیں۔ آسمان تاروں سے ڈھکا ہوا تھا جن کی روشنی میں مرلی منڈیر پر جھکا ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے انھیں دیکھ کر اپنی ناک حقارت سے سکوڑ کر شہر کی طرف اشارہ کیا جو روشنی میں نہا رہا تھا۔''تمھیں اس شہر سے متلی نہیں آتی؟''
''اور تمھیں؟'' آتماؤں نے پوچھا۔
''چپ رہو،'' مرلی نے جواب دیا اور جیب سے ماؤتھ آرگن نکال کر بجانے لگا۔ یہ آواز کسی ان دیکھی آتما کی طرح روشن شاہراہوں پر پھیلا کی۔ مگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں مصروف لوگوں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ انھیں اس سے زیادہ ضروری کام تھے۔

❀ ❀

Scanned with CamScanner

صدیق عالم

فورسیپس

بالی گنج روڈ پر ایک شخص سیاہ کارڈیگن پہنے تہہ کمزا بس کا انتظار کر رہا ہے۔ تین ماہ قبل اس نے اپنی پرانی تین منزلہ عمارت سے کود کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور نیچے سڑک پر معلق بجلی کے تار کے سبب ناکام رہا تھا جس نے اسے نیچے فٹ پاتھ سے بارہ فیٹ اوپر روک لیا تھا۔ تار سے نیچے گر کر اس کا ایک ہاتھ اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ سرکاری اسپتال میں دو ماہ زیر علاج رہا۔ مگر اس حادثے کے بعد ایک عجیب واقعہ یہ ہوا ہے کہ وہ جس ذہنی تناؤ سے گزر رہا تھا اچانک وہ ختم ہو گیا ہے۔

سندیپ۔۔۔ ہاں، آپ مجھے سندیپن کولے کے نام سے بلا سکتے ہیں، سندیپن کولے، اور یہاں سے میں اپنی کہانی خود سنانا چاہتا ہوں۔ یہ صدیق عالم، یہ ایک انتہائی بکواس قسم کا کہانی کار ہے، وہ سچ کو بھی کہانی بنا دیتا ہے اور کہانی کو سچ، جو اور بھی زیادہ برا ہے۔ وہ ہمارے ہی محلے میں ایک دوسری پرانی عمارت میں رہتا ہے جس کی سیڑھیاں ہمیشہ اندھیرے میں ڈوبی رہتی ہیں۔ وہ رات کے آخری پہر تک جاگتا ہے اور دن سے اسے نفرت ہے۔ وہ مذہب کو قدیم قبائلی جنگ کی صورت میں دیکھتا ہے جس کے خدوخال اکیسویں صدی میں زیادہ واضح ہوتے جا رہے ہیں، قومیت کے تصور کو ایک غیر فطری جوڑ سے عبارت کرتا ہے، ہندوستان کی آزادی کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، وہ مغربی کلاسیکی موسیقی کا دیوانہ ہے، ہمیشہ تنہا رہنا چاہتا ہے مگر ایک شہر خبرا کی طرح شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہتا ہے، وہ لفظوں میں یقین نہیں رکھتا، انہیں انسان کی ملمع کاری سمجھتا ہے، ادبی محفلوں سے گھبراتا ہے

Scanned with CamScanner

اور اس کی نظر میں انسان خدا کا لکھا ہوا سب سے بے تکا ڈراما ہے جس کے سارے کردار یا تو بری طرح کنفیوزڈ ہیں یا ایک احمقانہ یقین سے سرشار ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے لیے کچھ بھی مقدس نہیں ہے۔ ایسے انسان کا بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جانے وہ مدیر کیسے ہوں گے جو اس کی کہانیاں شائع کرتے ہیں اور وہ قاری، میں انھیں سمجھنے سے قاصر ہوں، جو اس کی کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ شاید اس کرۂ ارض پر، اس خدا کی بنائی ہوئی زمین پر، اس خاک آباد پر انسان کی آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ آپ کو ہر طرح کے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی۔ ہر طرح کے لوگ، ہر طرح کے خیالات، ہر طرح کا عقیدہ، ہر طرح کا نظریہ، اب اس سیارے پر سب کچھ ممکن ہے۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد آپ کو مل جائے گی جنھوں نے اپنی ماں کی کوکھ سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا تھا اور انھیں چمٹے سے پکڑ کر باہر لانا پڑا۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میرے کان کے دونوں پردوں اور ہڈیوں پر اب بھی ان چمٹوں کا درد، بے بگا بے جاگتا ہے۔ یہی نہیں، میں اپنا دایاں ہاتھ تیس ڈگری سے اوپر لے جانے سے بھی معذور ہوں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ میرے سر کا درد بالکل نفسیاتی ہے اور میں چاہوں تو اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا ہوں گرچہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ اس جبری پیدائش کے سبب ہی میں اپنا دایاں ہاتھ اٹھا نہیں پاتا۔ اس تیس ڈگری کے بعد کا سارا کام میرا بایاں ہاتھ کرتا ہے — میرا پیارا، اکلوتا بایاں ہاتھ۔ میں نے اپنے سر کے درد کو سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے، اپنے کالج کے ان ساتھیوں سے بھی مشورہ لیا ہے جو اب سرکاری اسپتال کے گندے گلیاروں میں بھٹکتے رہتے ہیں یا پرائیوٹ نرسنگ ہوم کی صاف ستھری راہداریوں میں اسٹیتھسکوپ اٹھائے گھومتے ہیں۔ میں نے نیشنل لائبریری میں بیٹھ کر کافی میڈیکل جرنل چھانے ہیں، سائبر کیفے میں بیٹھ کر دنیا بھر کی میڈیکل ویب سائٹس کو لاگ آن بھی کیا ہے۔

"ڈاکٹر، کہیں یہ میرے بھیجے میں Serotonin کی کمی کے سبب تو نہیں؟" میں نے اپنے آخری ڈاکٹر سے کہا تھا۔ "ہو سکتا ہے میں اس کے سبب ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہوں جو درد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔"

"جہاں دھوپ میں کمی ہوتی ہے وہاں یہ کیمیائی اجزا بن نہیں پاتے، مثلاً لندن، امسٹرڈم یا سان فرانسسکو،" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تھا۔ "مگر کلکتہ کا آسمان تو بالکل روشن ہے، بلکہ مجھے کہنے دیں

Scanned with CamScanner

ضرورت سے کچھ زیادہ ہی روشن ہے۔"

میں نے ایک بار اس ڈاکٹر کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جس نے یہ گھناؤنا کام کیا۔ کسی نے مجھے اس کا پتا نہیں بتایا تھا مگر مجھے اس کنڈے سے نرسنگ ہوم کا علم تھا جہاں میں پیدا ہوا۔

اس نرسنگ ہوم میں صرف ایک ڈاکٹر بیٹھتی تھی اور اس میں صرف زچگی کے لیے ہی لوگ جاتے۔ مگر یہ سارا کام یہاں کی آیائیں انجام دیتیں جن کے چہرے ہر طرح کے جذبات سے عاری تھے۔ کلکتے کے نچلے اور متوسط درجے کے تمام نرسنگ ہوم کی طرح اس نرسنگ ہوم میں بھی کوئی سند یافتہ نرس نہیں تھی، یہی آیائیں تھیں جو یونیفارم اور کیپ پہنے گھوما کرتیں۔ اس ڈاکٹر کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور سیندوری لکیر کی دونوں جانب اس کے سر کے گنجے پن کو پتلے پتلے گھنگریالے بالوں کے اندر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ جب میں نے اسے وہ تاریخ بتائی جب میں پیدا ہوا تو اس نے غیر یقینی کی حالت میں سر ہلایا۔

"اتنے پرانے رجسٹر تو اب کارپوریشن کے آفس میں ہی ملیں گے۔"

"آپ کو پورا یقین ہے وہ آپ نہیں تھیں؟"

"میں دو سال پہلے سرکاری اسپتال سے ریٹائر ہو کر اس میٹرنٹی ہوم میں آر ایم او کے طور پر آئی ہوں۔" اس نے کہا۔

"ویسے آپ اگر جھوٹ کہہ رہی ہیں تو اس کا آپ کو حق ہے،" میں کہتا ہوں۔ "کیا میں وہ چمٹا دیکھ سکتا ہوں جس کے ذریعے آپ لوگوں کو دنیا میں لاتی ہیں؟"

وہ تذبذب میں مبتلا ہے۔

"شاید آپ کا مطلب ڈیلیوری فورسپس سے ہے جو عمل جراحی میں استعمال ہوتا ہے، خاص طور پر زچگی کے وقت۔"

"ہاں ظاہر ہے میں کسی گھڑی ساز کی دکان پر تو ہوں نہیں۔ لیکن وہ ہے تو چمٹا ہی نا؟"

"شاید!" وہ ایک آیا کو بلاتی ہے جو بالکل پتلی دبلی بلکہ ہڈی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر کی بات سن کر اس نے غصے اور بیزاری سے میری طرف دیکھا ہے۔ وہ چمٹا لے آتی ہے جسے میں میز سے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کے ٹھنڈے لوہے کو چھوتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مجھے اس چمٹے کے مقابلے میں اپنا سر کافی بڑا نظر آتا ہے۔

''بچوں کے سر پیدا ہوتے وقت اتنے بڑے نہیں ہوتے۔'' مجھے چمٹے کو اپنے سر پر آزماتے دیکھ کر آیا نوتی ہے۔ میں اس کی طرف توجہ نہیں دیتا۔

''میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟'' میں ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں۔

''نہیں، یہ میٹرنٹی ہوم کی پراپرٹی ہے۔'' شاید اس کے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ وہ چمٹا واپس لے کر آیا کے حوالے کرتی ہے۔ ''ویسے اگر آپ کو یہ فورسپس چاہیے تو کالج اسٹریٹ میں کلکتہ میڈیکل کالج کے باہر کسی بھی میڈیکل ایکوپمنٹ کی دکان پر مل جائے گا۔''

''دیکھا جائے گا۔'' میں کہتا ہوں۔ ''میں ایک بار کسی بچے کو اس کے سہارے پیدا ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا فون نمبر نوٹ کریں گی؟''

''میرا خیال ہے یہ غیر ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نفی میں اپنا سر ہلاتی ہے۔ ''مگر میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟''

''کیونکہ میں اس بچے کا ردعمل دیکھنا چاہتا ہوں جو اپنی مرضی کے خلاف اس دنیا میں لایا جا رہا ہو۔''

''کیا اس بچے کو جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا اس کی مرضی کا پتا ہوتا ہے؟'' وہ ایک آہ بھر کر شاید خود سے کہتی ہے۔ پھر میری طرف تاکتی ہے۔ ''صرف ایک صورت ہے اگر کوئی عورت اور اس کا شوہر اس کی تحریری منظوری دے۔ مگر یہ بھی میرے خیال میں ممکن نہیں۔ ہمیں بالکل ہی آخری وقت میں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ کیس نارمل ڈلیوری کا ہے، قیصری ہے یا جیسا کہ آپ کہتے ہیں، چمٹے کا۔''

''اور یہ فیصلہ ہمیشہ کافی جلدی میں کیا جاتا ہوگا۔'' میں مسکراتا ہوں۔ ''کبھی جلد بازی میں، کبھی موٹی فیس کے لیے اور کبھی کنفیوژن کا شکار ہو کر، اور اس پورے عرصے میں وہ بچہ آخری شے ہوتا ہوگا جس کی رائے کے بارے میں سوچا جائے۔''

''میرا خیال ہے ہم نے آپ کو کافی وقت دے دیا ہے۔ ایکسکیوز می، مجھے لیبر روم کی طرف جانا ہے۔''

وہ گھنٹی بجاتی ہے اور میں نرسنگ ہوم کے پھاٹک سے باہر کا راستہ لیتا ہوں جہاں آسمان سفید

Scanned with CamScanner

ہے، سورج سوا نیزے پر ہے (آپ دیکھ رہے ہیں، صدیق عالم، وہ احمق کہانی کار، وقت کو کبھی اتنے اچھے ڈھنگ سے بیان نہ کر پاتا) اور ایک بس کی کھڑکی سے ایک عورت سر نکال کر صبح کا کھایا ہوا سارا کھانا ثابت و سالم قے کر رہی ہے۔ مجھے سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے اور میں سوچتا ہوں ایک دن میں اس گتھی کو سلجھا کر ہی رہوں گا کہ کیوں لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف پیدا ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے، اور جو کچھ ہوتا ہے اسے کہیں زیادہ انسانیت کے ساتھ، زیادہ جمہوری طریقے پر کیوں نہیں انجام دیا جاتا؟ کیا میڈیکل سائنس میں انسان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں؟

آہ، دیکھیے، میرا سر اس جگہ پھر سے دکھنے لگا ہے جہاں مجھے اس دنیا میں لاتے وقت چمٹے کا استعمال کیا گیا ہوگا۔ میرا جی چاہتا ہے میں سے کسی دیوار پر دے ماروں۔

کارڈیگن کے اندر اسے پسینہ آ رہا ہے، مگر اسے پتا ہے کلکتہ میں جو چاروں طرف سے آبی گزرگاہوں، ماہی گاہوں اور نمکین دلدلوں سے گھرا ہوا ہے، لوگ ہوا میں مرطوبیت کے سبب ٹھنڈ کو سمجھ نہیں پاتے اور اندر ہی اندر سردی کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ دراصل اسے کہیں نہیں جانا ہے اور اسے کسی خاص بس یا ٹرام کا انتظار بھی نہیں ہے، مگر عین ممکن ہے کہ وہ کسی بھی بس کے اندر بیٹھ کر کہیں بھی چلا جائے، یا لو دریا کی طرف بابو گھاٹ، یا بڑا بازار کی بھیڑ بھاڑ میں ستیہ نارائن پارک یا سیالدہ اسٹیشن جو ہر دس منٹ پر چھوٹنے والی لوکل ٹرین کے ذریعے اس عروس البلاد کو بنگال کی کھاڑی میں بکھرے ہوئے دور دراز کے گاؤں دیہات سے جوڑتا ہے۔ یا پھر ممکن ہے وہ اگلے ہی بس اسٹاپ پر بس سے اتر کر اپنے گھر لوٹ آئے جہاں اس کی بیوی اس کے لیے سوئٹر بن رہی ہے جسے تیار ہوتے ہوتے جاڑا ختم ہو چکا ہوگا، اور اس کا بوڑھا پنشن یافتہ باپ جو پرانا شرابی ہے، بنگلہ کا اخبار دیکھ رہا ہے اور بالکنی سے باہر نظریں دوڑا رہا ہے جہاں دوسرے مکان کی چھتوں کے اوپر چیل اور کوے اڑ رہے ہیں۔ ایک بلا بوڑھے کے سائے میں بیٹھا اس کے تھوکے ہوئے مچھلی کے سر کی ہڈیوں اور کانٹوں کو کھا کر اپنی مونچھیں پنجوں سے صاف کر رہا ہے۔

"میں کھانا لگا دوں۔" اس کی بیوی اسے دیکھ کر آدھا بنا ہوا سوئٹر اور کروشیے رکھ دیتی ہے۔

"کھانے میں کیا ہے؟"

"بھات، مچھلی، دال، چٹنی، کریلے۔"

"کریلے مجھے پسند ہیں۔" وہ سرہلاتا ہے۔

بوڑھا اخبار سے سر اٹھا کر اس کی طرف وزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ ان دونوں کے لیے اسے ایک لمبے عرصے تک جینا ہوگا۔ عمارت سے کرایہ برائے نام آتا ہے اور اب اس کی پنشن ہی ان دونوں کی زندگی کا آخری سہارا ہے۔ وہ آہ بھرتا ہے۔ شراب کی قیمت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ سرکار محصول پر محصول لگاتی جا رہی ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ دقیانوسی خیالات کے لوگوں کی حکمرانی رہے گی جو محصول کے ذریعے لوگوں کو سدھارنے کے مہم میں لگے رہیں گے۔ ان سے زیادہ روشن خیال تو اس کی بہو ہے جو ہر رات شراب نوشی کے لیے آلو یا مچھلی کے قتلے یا بیسن کے پکوڑے تل کر اس کے سامنے طشتری پر رکھ دیا کرتی ہے۔ یہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے گھرانوں کی لڑکیاں کھانا پکانے میں ماہر ہوتی ہیں۔ وہ مچھلی کے فلس اور ہڈیوں نیز معمولی سے معمولی ساگ سبزیوں کے ڈنٹھلوں اور چھلکوں سے جنھیں اس ملک کی عورتیں عام طور پر پھینک دیا کرتی ہیں، لذیذ سے لذیذ کھانا بنا لیتی ہیں۔ بہو کے لیے اسے سندربن جانا پڑا تھا جہاں مرد لکڑی اور شہد کی تلاش میں شیر، سانپ یا گھڑیال کا شکار ہو جایا کرتے ہیں اور عورتوں کے بیوہ بننے کی ایک پرانی روایت چلی آ رہی ہے۔ کہیں اس کے اندر یہ خوف قائم تھا کہ اس کا لڑکا زیادہ دن زندہ رہنے والا نہیں۔ گوسابہ کے جزیرے سے بیتا جب بھٹ بھٹی پر، جو ایک گہرے نیلے آسمان کے نیچے گاڑھا سرخی مائل دھواں اڑاتی چلی جا رہی تھی، تین گھنٹے کے آبی سفر اور پھر ایک ڈھڈرسرکاری بس میں تین گھنٹے کے خشکی سفر کے بعد لائی گئی تو اسے کلکتہ پسند نہیں آیا۔ وہ اتنی بھیڑ بھاڑ کی عادی نہیں تھی۔ اس نے گوسابہ میں لوگوں کو ہر طرف اتنی شتابی سے بھاگتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا جیسے گھڑی کے کانٹے شہر کی سڑکوں پر گھومتے پہیوں کو دیکھ کر اچانک تیز ہو گئے ہوں۔ اس پر اس کے شوہر نے پھول سجا رات میں ہی اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا جسمانی تعلق قائم کرنے سے معذور ہے، کہ وہ بچے کے سلسلے میں اس کی مرضی جانے بغیر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ گاؤں کے اسکول میں آٹھ کلاس تک پڑھی بیتا الگ سونے کی عادی ہو چکی تھی۔ مگر اس کا دل کہتا ایک دن سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یا پھر وہ گوسابہ

Scanned with CamScanner

لوٹ جائے گی، جو اتنا برا نہیں۔

''شٹ اپ!''

آخری آواز میری تھی۔ آپ نے دیکھا، یہ صدیق عالم کس درجے کا قلم کار ہے! وہ آپ کی خواب گاہ کے اندر تک داخل ہونے سے نہیں چوکتا۔ اس کا قلم کب نقش نگاری پر اتر آئے خود اسے نہیں معلوم۔ اس کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے وہ شہر کے ہر حصے میں، ہر عمارت میں، ہر جھوپڑپٹی میں، یہاں تک کہ طوائف کے کمروں، مسافر خانوں، کھیل خانوں، اسپتال کے مردہ گھروں، بلکہ قبرستان اور شمشان گھاٹ تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے پاس لوگوں کی ذاتیات کے اندر جھانکنے کے ہر طرح کے ذرائع، ہر طرح کے آلے موجود ہیں، اور جہاں یہ اپنے خان جھانک نہیں پاتا وہ اپنے تصورات کے ذریعے یا لوگوں کی نفسیات کا غلط یا صحیح مطالعہ کرکے ان کا خاکہ کھینچ ڈالتا ہے۔ ایک بار میں نے اسے ایک ٹرام کے اندر ایک تنہا سیٹ پر بیٹھے ایک کتاب پڑھتے پایا۔ اور میرا یقین کریں، اس نے کتاب الٹی تھام رکھی تھی۔ شاید اس طرح وہ بھیڑ سے خود کو مستثنیٰ قرار دینا چاہتا تھا۔ مجھے ایسے لوگ نہیں بھاتے جو بھیڑ سے الگ جیتے ہیں۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں، انھیں جلد سے جلد تختۂ دار تک پہنچانا لازمی ہوتا ہے، یا پھر ان پر نظر رکھنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے لوگوں نے ہمیشہ ہی طرح طرح کی مصیبتیں کھڑی کی ہیں، نئے نئے فرقے قائم کیے ہیں، انھیں ہر طرح کی چیزوں کو توڑنے کا جنون ہوتا ہے، ایک بچے کی طرح، یا ایک پاگل کی طرح یا ایک پیغمبر کی طرح جو پرانے عقائد کو توڑ کر ان کے ملبوں سے نئی عمارتیں تعمیر کرتا ہے۔

''ٹکٹ!'' کنڈکٹر کی آواز پر میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں۔

''میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں،'' میں کہتا ہوں۔

''تو ٹرام سے اتر جائیے،'' کنڈکٹر میرے ہی لہجے کی نقل کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں پر ایک دھندلی عینک پڑی ہے جو غلیظ ہو رہی ہے اور اس کی انگلیاں لانبی ہیں جن سے وہ ٹرام کے دروازے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جہاں مسافر بھاری تعداد میں لٹکے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر وقت اسے مسافروں سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس ٹرام سے مسافروں کی ایک بڑی تعداد کرایہ ادا کیے بغیر اتر جاتی

ہے یا انھیں اترنا پڑتا ہے کیونکہ بھیڑ میں انھیں کنڈکٹر تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

''میں ٹکٹ کے پیسے دیتا ہوں،'' مجھے صدیق عالم کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ دس روپے کا ایک نیا نوٹ نکال کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیتا ہے۔

''کہاں جانا ہے؟'' کنڈکٹر نوٹ لے کر مجھ سے پوچھتا ہے۔ مگر میرے بتانے سے پہلے ہی صدیق عالم کہہ اٹھتا ہے، ''کالج اسٹریٹ!''

وہ باقی کے پیسے لے کر ٹکٹ میری طرف بڑھا دیتا ہے اور کنڈکٹر کے آگے بڑھ جانے کے بعد اپنی کتاب کے درمیان انگلی دبا کر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''تمھیں نہیں لگتا میں بھی اس کرۂ ارض پر آباد ہوں اور تمھارے آس پاس ہی جی رہا ہوں؟''

آہ، تو اسے میرے خیالات کی آہٹ مل چکی ہے۔ شاید ان سے اسے سخت چوٹ پہنچی ہے۔ مجھے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ اس شخص کا ردعمل تو ایک عام انسان سے بھی گیا گزرا ہے۔

''بھلے آدمی . . .'' میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں۔ ''میں تمھاری کہانیاں پڑھ چکا ہوں۔ انھیں پڑھ کر کسی کا بھی بھلا نہیں ہو سکتا۔ شاید اب اس دنیا کو تم جیسے قلم کاروں کی ضرورت نہیں۔ تم سے زیدہ بہتر تو وہ لوگ ہیں جو چوراہوں پر بھیڑ لگا کر نقلی دوائیاں بیچتے ہیں، اس سے کم از کم کچھ لوگ تو زندگی کے بوجھ سے نجات پاتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں میں ایک اوسط درجے کی صلاحیت کا مالک ہوں۔ شاید میرے اندر وہ مہارت نہیں کہ لوگوں کی بھیڑ جما سکوں،'' وہ کہتا ہے۔ ''یہ لوگ جن کا تم ذکر کر رہے ہو، ایک ایک بار میں سو سے زیادہ لوگوں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے ہیں اور اپنی فصاحت کے بل پر ان میں سے پچیس فیصد لوگوں کو اپنی دوائیں بیچ ڈالتے ہیں۔ جبکہ میرے جیسا قلم کار تو اپنی تین سو کا پیاں چھپو کر ساری عمر اس کی دو سو کا پیاں تک بیچ نہیں پاتا۔''

''اس دنیا میں صرف وہی چیزیں بکتی ہیں جو لوگوں کا اچھا یا برا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں،'' میں کہتا ہوں۔ ''میرے عظیم فنکار، تم تو کسی بھی لائق نہیں۔ اب اس سماج میں تمھاری حیثیت ایک appendix کی طرح ہے۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے۔''

مجھے پتا ہے میں نے اسے شدید چوٹ پہنچائی ہے۔ میں اس کا ازالہ کرنے کے بارے میں

Scanned with CamScanner

سوچ رہا ہوں کہ وہ اپنی کتاب کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور چلتی ٹرام سے نیچے اتر جاتا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کی پھرتی حیرت انگیز ہے۔ ہوسکتا ہے اور بھی لاکھوں احمقوں کی طرح اسے بھی لمبی عمر جینے کا جنون ہو۔ میرا خیال ہے یہ سماج کے لیے ایک بری خبر ہے۔

کالج اسٹریٹ میں کلکتہ یونیورسٹی کے پھاٹک کے باہر کافی بھیڑ ہے۔ پرانی کتاب کی دکانوں پر معمول کی طرح دکاندار گاہکوں کو روک رہے ہیں، ان کی تھیلیاں کھینچ رہے ہیں۔

"وکٹر ہیوگو!" ایک دکاندار میرا کندھا تھام کر کہتا ہے۔ "وکٹر ہیوگو، صرف پانچ روپے میں۔"

"وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں؟" میں حیرانی سے کہتا ہوں۔ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے جو اپنے پرانی کتابوں کے کھوکھے کے باہر اپنے سر کے استخوانوں پر مفلر لپیٹے کھڑا ہے۔ میں اس کی بڑھائی ہوئی کتاب کو کھول کر دیکھتا ہوں۔ کیڑوں نے اس کے اندر آر پار سرنگ بنا ڈالے ہیں۔ "Notre-Dame de Paris" کتاب کہتی ہے۔ اس کتاب کی جلد بھی کافی خوبصورت رہی ہوگی مگر اب بے رنگ اور داغدار ہو چکی ہے۔ اس کے صفحے پاپڑ کی طرح پیلے ہو رہے ہیں اور موڑنے پر ٹوٹ سکتے ہیں۔ شاید غلامی کے دنوں میں یا انگلینڈ سے سمندر کا سفر طے کر کے ہندوستان آئی ہوگی۔ وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں! مجھے حیرت ہوتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب پانچ ستارہ ہوٹلوں میں بیس بیس ہزار کے ڈنر کے اشتہار دیے جا رہے ہوں، جب آئنکس میں لوگ دو دو سو روپے کے ٹکٹ کے لیے فلموں کے لیے لائن لگاتے ہوں، جب فلم اسٹار اور کرکٹ کے کھلاڑی ایک ایک اشتہار کے لیے کروڑوں روپے لیتے ہوں، وکٹر ہیوگو صرف پانچ روپے میں، وہ اس کے لیے بھی لوگوں کو کندھے سے پکڑ کر روکنا پڑے۔ آہ، میں وکٹر ہیوگو کے ساتھ یہ بے انصافی نہیں کر سکتا۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ مجھے اس دکان کی تلاش ہے جہاں وہ فورسیپس مل سکے جس کی مدد سے لوگوں کو کھینچ کر اس دنیا میں لایا جاتا ہے۔ کلکتہ میڈیکل کالج کے باہر مجھے اس طرح کی کچھ دکانیں نظر آتی ہیں۔ میں ٹرام کی پٹری کے بیچوں بیچ کھڑا آسمان پر نظر ڈالتا ہوں، آسمان جو ہمیشہ کی طرح بے رنگ مگر پراسرار ہے۔ آخرکار انسان کو اس کی منزل مل ہی جاتی ہے۔

وینس سرجیکل ہوم!

Scanned with CamScanner

میں اندر داخل ہوتا ہوں۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا آدمی سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لے رہا ہے۔

''آپ ڈاکٹر ہیں؟'' وہ پوچھتا ہے۔

''نہیں،'' میں کہتا ہوں۔ ''مگر مجھے ایک فورسپس کی ضرورت ہے۔ کیا اس کے لیے ڈاکٹر ہونا ضروری ہے؟''

''ارے نہیں۔ یہ تو ہم نے آپ سے ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔''

اس دکان کی الماریوں میں نقلی ٹانگیں اور ہاتھ رکھے ہیں۔ پیشاب اور دست کے مرتبان اور ہاتھ پاؤں سے معذور لوگوں کے لیے اسٹول اور کرسیاں فرش پر ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ ہر طرح کے آلات، ربر، پلاسٹک اور گلاس فائبر کے ساز و سامان شوکیسوں کے اندر ترتیب اور بے ترتیبی سے سجے ہوئے ہیں، دیواروں سے لٹک رہے ہیں۔ مجھے ایک آلہ خاص طور پر متاثر کرتا ہے جو کافی دھار والا اور قدرے مڑا ہوا ہے۔ شاید اس سے ہڈیاں کاٹی جاتی ہوں۔ اسے تو کسی بوچڑ کی دکان پر ہونا چاہیے تھا۔

قیمت بتا کر فورسپس میرے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا گیا ہے مگر سیلز مین کی آنکھوں میں تذبذب ہے۔ خاموشی کے ساتھ وہ میرے چہرے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ دکان کا بوڑھا مالک صاف شفاف دھوتی کرتا پہنے کیش کاؤنٹر پر بیٹھا ہے۔ اس نے چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا ہے۔

''واقعی... '' میں آلہ اٹھا کر دیکھتا ہوں۔ ''واقعی اس کی شکل جتنی پیچیدہ، جتنی بھیانک ہے، اس کا اسٹیل اتنی ہی بے رحمی سے چمک رہا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے یہ سچ مچ ایک گھناؤنا کام کرنے کے قابل ہے۔''

''گھناؤنا کام؟'' سیلز مین کا ردعمل فطری ہے۔ دکان کا مالک میری طرف تاکتا ہے۔

''کیا میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟'' میں چمٹے کے پیچ کو ڈھیلا کرتے ہوئے، پھر کستے ہوئے کہتا ہوں، جیسے اس کے لوہے کے حلقوں کو کسی بچے کے فرضی سر کے موافق بنانا چاہتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

"کیوں نہیں،" سیلز مین کہتا ہے۔ "چھ سو روپے۔"

میں پلٹ کر دکان کے اندر ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوں۔ وہاں میں تنہا گاہک ہوں۔ میں دکان کے باہر تاکتا ہوں جہاں ٹرام کی روشن پٹریوں کے اوپر ایک لاغر رکشا والا اپنے رکشا پر ایک بھاری بھرکم عورت کو لادے تیزی سے گزر رہا ہے۔ مجھے صدیق عالم کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے کیا کہا تھا، وہ ایک تباہی چالاک قسم کا انسان ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔ ٹرام کے اندر ٹکٹ کے پیسے تو کوئی بھی ادا کر سکتا ہے۔ مگر جب آپ کی ضرورت واقعی اہم ہو، جب سچ مچ اس کی آپ کو ضرورت ہو، یہ صدیق عالم دور دور تک دکھائی نہیں دے گا۔ یہی اس کا کردار ہے۔

"شاید اگلی بار میں اسے خرید لوں۔" میں فوراً پرس کاؤنٹر پر واپس رکھ دیتا ہوں۔

بوڑھا اپنی پرانی عمارت کے نیچے کھڑا سڑک پر لڑکوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ رہا ہے۔ پندرہ برس پہلے جب وہ رائٹرز بلڈنگ سے ریٹائر ہوا تھا تب اس سڑک پر کلکتہ امپروومنٹ ٹرسٹ کی جانب سے پودے لگائے جا رہے تھے جو اب تناور درختوں میں بدل گئے ہیں اور اپنے پتے پھول اور پھل نیچے پھینکنے لگے ہیں۔ وہ جب ان لڑکوں کی عمر کا تھا تو یہ سڑک ایک پگڈنڈی کی شکل میں ایک تالاب کے کنارے واقع تھی جو سنگھاڑوں کی بیلوں سے نصف ڈھکا ہوا تھا اور جس کی جھاڑیوں میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگلی مرغ اور گلہریاں پکڑا کرتا تھا، مارآبی مارا کرتا تھا۔ تالاب اب اپنے سنگھاڑوں اور جھاڑیوں کے ساتھ غائب ہو چکا ہے اور اس کی جگہ خوبصورت دیدہ زیب کثیر المنازل عمارتوں نے لے لی ہے اور وہ پگڈنڈی اب ایک کشادہ صاف ستھری سڑک میں بدل چکی ہے۔ کل ملا کر اب یہ شہر کا ایک بہت ہی متمول رہائشی علاقہ ہو گیا ہے جس میں سب سے پرانی عمارت اسی بوڑھے کی ہے جس میں آزادی کی افراتفری کے دوران مغربی پاکستان سے آکر بسے ہوئے پنجابی اور سندھی اب بھی پچاس یا سو روپے ماہانہ کرایہ دیتے ہیں، کلب جاتے ہیں اور تین تین لاکھ کی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ اس عمارت کا مالک ہوتے ہوئے بھی اب اس علاقے میں وہی سب سے غریب آدمی ہے۔ شہر میں ٹھنڈک کافی کم ہو گئی ہے۔ سامنے بادام کے پیڑ کے پتے سرخ ہو کر مرجھانے اور زمین پر گرنے لگے ہیں۔ دور دور کی گلیوں سے بچے پتھر اکٹھا کر کے اس پیڑ کے نیچے بادام توڑنے آیا کرتے ہیں۔ لوگ

اپنی کھڑکیوں سے حقارت کے ساتھ ان غلیظ بچوں کو گھورتے ہیں اور ان کے پتھروں سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ بوڑھا سر اٹھا کر بجلی کے تار کو دیکھتا ہے جو خودکشی کے واقعے کے بعد دو ہفتے قبل تک، مین سے پانچ فیٹ کی بلندی پر جھول رہا تھا مگر اب پھر سے سے برابر کر دیا گیا ہے۔ بہت اوپر بالکنی پر اس کی بہو تہا کر کپڑے پسار رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنا لڑکا آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے کشمشی رنگ کی ایک منکی کیپ پہن رکھی ہے اور پان چبا رہا ہے۔ بوڑھے کو حیرت ہوتی ہے۔ وہ پان تو کھایا نہیں کرتا۔ اور پھر آج تو تتی سردی بھی نہیں، پھر یہ منکی کیپ کیوں؟

"ایک ہی سڑک پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام! واقعی میں نے تو کبھی اس پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔" اس کا لڑکا برقی تار والے کھمبے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کی عمارت کے عین نیچے ایک بلب کے ساتھ کھڑا ہے اور پھر سڑک پار اس اونچے کھمبے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا اوپری سرا عمودی ہو کر ایک بڑے سے سوڈیم ویپر لیمپ کو تھامے ہوئے ہے۔ اس بڑے کھمبے کا تعلق زمین دوز تاروں سے ہے اور یہ کھمبے پچھلے ہی سال اس سڑک کی دوسری جانب کھڑے کیے گئے ہیں۔ شاید انھیں لگانے کے بعد یہ تار والے کھمبے بھلا دیے گئے ہیں۔" "ہمیں سرکار کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہیے۔"

بوڑھا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اسے معلوم ہے، س کا لڑکا اپنے کالج کے دنوں سے (جہاں علم ریاضی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا) کچھ زیادہ ذہنی عدم توازن کا شکار ہے۔ (اس نے بی ایس سی کے آخری سال میں اچانک کالج جانا بند کر دیا تھا۔) سائنس کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی نئی نئی زبانوں کو سیکھنے کے سلسلے میں اس کی صلاحیت حیرت انگیز تھی۔ اپنے کتاب بینی کے جنون کی حد تک شوق کے سبب وہ نہ صرف ان ساری زبانوں کو لکھ اور پڑھ سکتا تھا جو کلکتہ کی سڑکوں پر بولی جاتی تھیں بلکہ اس نے کسی کی رہنمائی کے بغیر فرانسیسی اور جرمن میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ کبھی اس کا زیادہ وقت کلکتہ کی مختلف لائبریریوں میں گزرتا تھا مگر گذشتہ ایک سال سے اس نے کتابوں سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی۔ بوڑھے کو پتا ہے خاموشی ہر وقت اس کے ساتھ پیش آنے کا صحیح طریقہ نہیں، مگر اسے اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ لڑکا پان چباتا ہوا قدیم زمانے کی نشیبی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے تیسری منزل پر (جو اس عمارت کی آخری منزل بھی ہے) اپنے فلیٹ پر پہنچتا ہے جہاں بالکنی میں اس کی بیوی پچی کاری کے فرش پر کھڑی اپنے گیلے بالوں کو دھوپ میں سکھا

Scanned with CamScanner

رہی ہے اور پلاسٹک کی کنگھی سے ان کی لٹوں کو درست کر رہی ہے۔ یہ بالکنی موجودہ زمانے کی بالکنیوں کے تناسب سے کافی بڑی ہے اور اسے بالکنی سے زیادہ ہینڈ ٹیرس کہا جا سکتا ہے۔

''کیا بات ہے، تم ہمیشہ اپنے بالوں پر کنگھی کرتی رہتی ہو؟'' وہ کہتا ہے، پھر اس کے بالوں کو اٹھا کر دیکھتا ہے جو اس کے کنوارے سڈول کولھوں تک لٹک رہے ہیں۔ ان سے ایک عجیب سی تیز خوشبو آ رہی ہے جیسے اس کا تعلق بدلتے موسم سے ہو۔ ''ویسے تمھارے بال کافی خوبصورت ہیں، ڈیلا کے بالوں کی طرح۔''

''میری اور بھی چیزیں خوبصورت ہیں،'' وہ مسکرا کر کہتی ہے۔ ''اور یہ ڈیلا کون ہے؟''

''جانے دو اسے۔'' وہ سکی کیپ سر سے اتار کر کونے کی میز پر پھینکتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے اس کے سر پہ پسینہ جم رہا ہے۔ ''وہ ایک کہانی کی فرضی کردار ہے جو ہماری ہی طرح غریب ہے اور اپنے شوہر کو تحفہ دینے کے لیے اپنے بال بیچ ڈالتی ہے۔''

''تحفہ...'' اس کی بیوی کو کچھ یاد آ جاتا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے اندر سے ایک سربہ مہر خاکی میلا لفافہ نکال کر لاتی ہے جو کافی بڑا ہے اور ایک حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا ہے۔ لفافہ کافی وزنی بھی ہے۔

''اسے کوئی تمھارے لیے چھوڑ گیا ہے۔''

لفافے کا منھ سیلوٹیپ سے بند ہے جسے قینچی سے کاٹنے پر اندر سے وہی فورسیپس نکل آتا ہے جسے اس نے دو روز قبل کالج اسٹریٹ پروفیسر سرجیکل ایمپوریم میں دیکھا تھا۔ اس کے ہینڈل سے ایک کارڈ نائلن کے تاگے کے ذریعے منسلک ہے جس پر مارکر پین سے لکھا ہے ''To whom it may concern''

آگے کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، نہ کارڈ پر کسی کا نام ہے۔

''تم نے نام نہیں پوچھا؟''

''وہ بہت جلدی میں تھا۔''

وہ فورسیپس کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔

''کیسا تھا وہ؟''

Scanned with CamScanner

''اوسط قد کا۔''

''بال؟''

''کالے، چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے، تمھاری طرح۔''

''عینک؟''

''تھی۔''

''مونچھیں؟''

''نہیں تھیں... شاید تھیں... میں نے غور نہیں کیا۔''

''عمر؟''

''تم کیا سمجھتے ہو، ایک جھلک میں اتنا سب کچھ دیکھنا ممکن تھا؟'' اس کی بیوی بولتی ہے۔ ''اس نے دروازے کی گھنٹی بجائی، مجھے یہ لفافہ تھمایا اور مجھ سے کہا۔ 'اچانک اس طرح دروازہ کھولنا ٹھیک نہیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہنگر فورڈ اسٹریٹ پر ایک فلیٹ کے اندر کچھ غلط لوگ گھس آئے تھے، بلکہ انھوں نے ایک بوڑھی عورت کا خون بھی کر دیا۔' ''

آہ، وہ صدیق عالم کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر فورسپس سے کھیلنے لگتا ہے۔ یہ وہ آرام کرسی ہے جس پر بیٹھ کر اس کے باپ دادا بوڑھے ہوئے۔ یہ آرام کرسی اس نے ستیہ جیت رائے کی ہر دوسری فلم میں دیکھی تھی، بلکہ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا جیسے یہ کرسی ستیہ جیت رائے کی کسی فلم کے سیٹ سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔

''یہ چیز میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' اس کی بیوی کنگھی سے بالوں کو نوچ نوچ کر ایک گچھے کی شکل میں جمع کر رہی ہے تاکہ اس پر تھوک سکے۔ بالوں کا تھوکا ہوا گچھا نیچے سڑک پر کھڑے اس کے سسر کے سامنے گرتا ہے مگر اس کی کمزور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ان کتے کے پلّوں کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے جو اس ادھپٹی ایڑیوں کو سونگھتے کہیں سے آنکلے ہیں۔ تین ماہ قبل ان کی ماں، جو اس عمارت کی بالکنیوں سے پھینکا ہوا پس خوردہ کھانا اپنے نوزائیدہ بچوں کے ساتھ کھایا کرتی تھی، اسی سڑک پر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ڈمپر کے نیچے آگئی تھی۔

''تمھیں اس چیز کو دیکھ کر حیرانی ہو رہی ہوگی۔'' اپنی بائیں ہتھیلی کو اپنے سر کی پشت پر پھیلا کر

آرام کرسی پر جھولتے ہوئے وہ مسکرا رہا ہے، لگتا ہے بگا ہے فورسیپس کو فرش سے اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ ''انسان جب کسی چیز کو سمجھ نہیں پاتا تو وہ خود اپنے سوالوں میں گھر جاتا ہے۔ اپنے لیے یہ پنجرا وہ خود تیار کرتا ہے اور اکثر ساری عمر اس پنجرے کے اندر ہی جیتا ہے کیونکہ کچھ سوالوں کے جواب کبھی نہیں ملتے۔''

سیتا اس کی بات سن نہیں رہی ہے۔ وہ بالکنی سے بہت دور کوسا پے میں خلیج بنگال کی کڑی دھوپ میں کھڑی ہے جہاں کھاڑی کا نمکین پانی کنارے کی کیچڑوں پر ہلکورے لے رہا ہے، انھیں فلس کی شکل میں کاٹ رہا ہے، ان کے پشتوں کی کنکریٹ کی دیوار اور پیڑ جیبوں کے زیریں حصوں پر سیپ چپکا رہا ہے۔ وہ سرخ کیکڑوں کو دیکھ سکتی ہے جن کے آس پاس رال بنگال ٹائیگر دہاڑتے رہتے ہیں۔ گرچہ وہ بالکل سانولی ہے مگر ایک تیکھے ناک نقشوں والی ایک بھرے پرے بدن کی عورت ہے اور اس کے چہرے میں، جیسا کہ مقامی لوگ کہا کرتے ہیں، کافی نمک ہے۔ اس کا غریب باپ سندربن کے پانی پر جال پھیلایا کرتا ہے، اور پھیلاتا رہے گا جب تک کوئی گھڑیال اسے کھینچ کر پانی کے اندر نہ لے جائے یا کوئی کوبرا نہ ڈس لے۔ اس کی ماں اسے یاد نہیں۔ وہ ریلنگ سے مڑ کر دیکھتی ہے۔ وہ آرام کرسی پر پہلے کی طرح چسکیں لیتے ہوئے اسے جنسی نظروں سے تاک رہا ہے۔

''تم کچھ سوچ رہی تھیں، سیتا؟''

''کھانا لگا دوں؟''

''تمھیں صرف کھانے کی ہی فکر کیوں رہتی ہے؟''

''اور میرا کام کیا ہے۔'' وہ کمرے کے اندر سے ہوتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلی جاتی ہے۔ وہ چشمے کو میز پر رکھ کر بنگلہ اخبار اٹھا لیتا ہے جو اس کا باپ صبح سے شام تک پڑھتا رہتا ہے۔ اخبار دھوپ میں پڑے پڑے گرم ہو گیا ہے۔ اسے اخبار کے دفتر کا پتا چاہیے جو اسے آخری صفحے کے بالکل نیچے منحنی حرفوں میں لکھا نظر آتا ہے۔ اسے اس اخبار کے مدیر کو ایک خط لکھنا ہے۔ ایک احتجاجی خط، ایک سڑک کے بارے میں جہاں دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے جب کہ کلکتہ میں ایسی سینکڑوں گلیاں ہیں جن کے کھمبوں پر بلب مہینوں تک نہیں جلتے۔

''جناب عالی!'' وہ ایک پوسٹ کارڈ پر لکھتا ہے۔ ''میں بالی گنج سیکنڈ لین کا رہنے والا ہوں۔

Scanned with CamScanner

یہ ایک صاف ستھری ذیلی سڑک ہے جس پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے۔۔۔"

"رک جاؤ، تم یہ خط نہیں لکھ سکتے۔"

آہ! یہ صدیق عالم، وہ سمجھتا ہے چونکہ وہ قلم کار ہے وہ خط بھی اچھا لکھ سکتا ہے۔ کہانی لکھنا اور بات ہے مگر اخبار کے مدیر کو خط لکھنا، وہ بھی ایک احتجاجی خط جس کا مقصد شہر بلدیہ کے انتظام میں عملاً ایک تبدیلی، ایک بہتری لانا ہے، یہ ایک کہانی کار کے بس کی بات نہیں جس کی دنیا بس تصورات کے فریم میں بند ہوتی ہے۔ میں نے اس کا لکھا ہوا خط چھین لیا ہے، اس کے پرزے پرزے کر دیے ہیں۔ میں نے ایک نیا پوسٹ کارڈ لے کر ایک دوسرا خط لکھا ہے جس کے لیے مجھے سیتا سے اس کا قلم ادھار مانگنا پڑا ہے۔ یہ اس کی شادی کا تحفہ ہے۔ اس سے وہ گوسابا اپنا گھر خط لکھا کرتی ہے جس کا جواب اسی ترتیب سے آیا کرتا ہے۔

میں نے خط کو اپنے نکڑ کے لیٹر بکس کے اندر ڈال دیا ہے جو ایک پرانے پیڑ کے تنے سے لٹک رہا ہے۔ یہ لیٹر بکس سرخ رنگ کا ہے اور اس پر چڑیوں کی بیٹ کی زیبرا لکیریں ہیں۔ اب میں ہر روز بے چینی سے اخبار کے خطوط کے کالم کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پندرہ دن گزر گئے ہیں، مگر مجھے وہ خط اخبار میں دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے دو پوسٹ کارڈ اور بھی چھوڑے ہیں اور آخری پوسٹ کارڈ بذاتِ خود بالی گنج پوسٹ آفس میں ڈال آیا ہوں۔ گرچہ بعد کے دونوں خطوط میں زبان تھوڑی سی بدل گئی ہے مگر میرا خیال ہے مضمون کا متن اپنی جگہ قائم ہے۔ میں نے اپنے آخری خط کی کاپی اپنے علاقے کی کاؤنسلر کو بھی دی ہے۔ وہ ایک غیر شادی شدہ عورت ہے، کمیونسٹ پارٹی کی ممبر ہے، اپنی ذاتی ماروتی وین میں گھوم گھوم کر غریبوں کے مسئلے حل کرتی ہے۔ غریب جنھیں ڈھونڈنے کے لیے آپ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، وہ ایک بڑی تعداد میں آپ کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں، کوّوں کی طرح، جنھیں جس روشنی میں بھی دیکھو وہ کوّے ہی نظر آتے ہیں۔

"یہ تو اس سڑک کے لیے اچھا ہی ہے نا۔ آپ کو تو ممنون ہونا چاہیے۔" وہ مسکراتی ہے۔

"یقیناً یہ خوشی کی بات ہوتی اگر تمام سڑکوں پر اس طرح کا انتظام ہوتا۔ اور پھر ان جگہوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جہاں سالوں سال روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا؟"

''کیا کلکتہ میں ایسی کوئی سڑک بھی ہے؟ اپنے علاقے میں میں نے تو خود سے ہر جگہ روشنی کا انتظام کیا ہے۔ جانے آپ کس جگہ کی بات کر رہے ہو۔''

وہ واقعی ایک قابل سیاست دان ہے جس کے پاس ہر موقعے کے لیے مناسب جواب موجود ہے۔ وہ وین کا شیشہ دھکیل کر بند کرنا چاہتی ہے کہ اس کے بغل میں بیٹھا ہوا آدمی اس کے کان میں کچھ سرگوشی کرتا ہے۔ میں اس آدمی کو پہچانتا ہوں۔ وہ ہمارے علاقے میں بلاوجہ آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور اسی طرح آوارہ گردی کرتے کرتے ایک دن بڑا لیڈر بن جائے گا۔ کاؤنسلر مسکرا کر میری طرف دیکھتی ہے۔

''پھر بھی میں اس پر غور کروں گی۔'' وہ کہتی ہے اور گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اب کچھ ہونے والا نہیں۔ ان غریبوں کی طرح مگر میں کوشش جاری رکھتا ہوں۔ میں نے اخبار کو ایک اور خط دیا ہے۔ اور تب وہ خط شائع ہو جاتا ہے گرچہ یہ میرا آخری خط نہیں ہے۔ شاید یہ میرا دوسرا خط تھا جسے میں نے پہلے خط کے ایک ہفتے بعد لکھا تھا۔ مجھے خط کے کالم میں اپنا نام دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں اسے سیتا کو دکھاتا ہوں۔ وہ خط کو سانس تھام کر شروع سے آخر تک پڑھ جاتی ہے۔ وہ میرے نام پر اپنی انگلی رکھ کر مسکراتی ہے جیسے اسے محسوس کر رہی ہو۔ اس میں اس کی شادی کی انگوٹھی چمک رہی ہے۔

''مجھے یقین نہیں ہوتا یہ تم نے لکھا ہے۔'' وہ کہتی ہے۔ ''پھر بھی میں خوش ہوں کہ تم نے واقعی یہ خط لکھا ہے۔''

جانے کب سے بولنے کے انداز میں ایسی کیا بات ہے کہ میں اخبار اٹھا کر خط کو پڑھنے لگتا ہوں۔ ۔۔۔۔۔ واقعی یہ تو میرا لکھا ہوا خط ہے ہی نہیں۔ یہ تو کسی ملعون قلم کار کا کارنامہ ہے۔ یہ تو وہی ہے ۔۔۔ وہی خط ہے جسے میں نے پرزے پرزے کر دیا تھا۔

''[illegible] بائیں ہاتھ سینٹ [illegible] والا ہوں۔ یہ ایک صاف ستھری ذیلی سڑک ہے جس پر دو طرح کی روشنیوں کا انتظام ہے۔۔۔''

آپ دیکھ رہے ہیں وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ یہ صدیق عالم۔ مجھے اس کے ساتھ ایک آخری فیصلہ [illegible] کا۔ میں اس کی تلاش میں اس کی عمارت تک جاتا ہوں مگر اس کے گھپ تاریک

Scanned with CamScanner

زینے کی پہلی لینڈنگ پر ہر بار مجھے ایک بیمار خارش زدہ کتا بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس کے بدن کی رستی ہوئی
خارشوں سے ایک عجیب دم گھونٹ دینے والی بدبو خارج ہوتی رہتی ہے۔ سیڑھی کے اندھیرے میں اس
کی چمکتی آنکھوں سے جانے کیوں مجھے لگتا ہے اسے میرا وہاں آنا پسند نہیں اور اگر میں نے اسے
پھلانگنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر حملہ بھی کرسکتا ہے۔ گرچہ ہر بار میں وہاں سے لوٹ آتا ہوں مگر اس کتے
کے بدن کی بو گھنٹوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پھر ایک دن میں دیکھتا ہوں، وہ تار اور کھمبے وہاں سے
ہٹائے جارہے ہیں۔ مجھے وہ کاؤنسلر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ صرف صدیق عالم اوورسیر سے تھوڑی دور
کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بار میرے اندر اس کے پاس جانے کی خواہش جاگتی ہے لیکن
دوسرے ہی لمحے مرجاتی ہے۔ جہنم میں جائے وہ، میں سوچتا ہوں۔ وہ ایسی چیز نہیں جس کے بارے
میں اتنی سنجیدگی سے سوچا جائے۔ دنیا میں ہزاروں ایسی چیزیں ہیں جو بالکل ہی غیر اہم ہوتی ہیں مگر
ہماری توجہ کے سبب ایک خاص اہمیت کی حامل ہوجاتی ہیں۔

صدیق عالم سڑک سے گزر کر اوورسیر کے سامنے آکھڑا ہوا ہے اور اس سے بات کررہا ہے۔
اوورسیر اسے کچھ سمجھا رہا ہے، پھر خود اثبات میں سر ہلاتا ہے۔ وہ واپس چلا جاتا ہے اور پیڑوں کے
نیچے ٹھنڈکی ماری چڑیوں کی بیٹ سے داغدار فٹ پاتھ پر قدم رکھتا ہوا غائب ہوجاتا ہے۔

وہ لوگ تار اور کھمبے ہٹا کر جاچکے ہیں۔ میں بالکنی کے جنگلے سے جھک کر نیچے دیکھتا ہوں۔
ہماری عمارت کے سامنے سے کھمبا اکھاڑ دیا گیا ہے اور اب اس جگہ زمین اس طرح ادھڑی پڑی ہے
جیسے قرونِ وسطیٰ کے کسی جاپانی سامورائی نے ہاراکیری کرکے اپنی انتڑیاں باہر نکال لی ہوں۔ تار اور
کھمبے کی عدم موجودگی میں ہماری بالکنی کافی اونچی اور خطرناک نظر آرہی ہے۔ میں سہم کر پیچھے ہٹ جاتا
ہوں اور اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ وہاں کنویں کے اندر کا سا گہرا اندھیرا ہے۔ مجھے تھوڑی دیر تک
اس کنویں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، پھر دھیرے دھیرے ایک چہرہ ابھر کر سامنے آتا ہے یہ صدیق
عالم کا چہرہ ہے۔ پھر اس چہرے کے پیچھے کے مناظر ابھرتے ہیں۔ وہ پیڑوں کے نیچے چڑیوں کی بیٹ
کے نشانات پر چلتے ہوئے مڑ مڑ کر میری طرف تاک رہا ہے، مسکرا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ایک
خاص منصوبے کے تحت یہ سب کچھ کررہا ہے۔ میں اسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دوں گا۔
اس کی کہانی کو اس کے انجام تک اس کی مرضی کے مطابق چلنے نہیں دوں گا۔ میں اپنے کمرے میں

Scanned with CamScanner

داخل ہوتا ہوں اور میز کی دراز سے چھتا باہر نکال کر واپس بالکنی پر نکل آتا ہوں۔ نیچے سڑک اپنے دونوں کنارے دور تک سنسان پڑی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب سڑک زیادہ تر سنسان رہتی ہے۔ میں جنگلے کے اوپر جھک کر چھتا نیچے پھینک دیتا ہوں۔ چھتے کے سڑک سے ٹکرانے کی آواز میرے کانوں تک آتی ہے۔ اتنی بلندی سے تارکول کی سڑک پر پڑا ہوا اسٹیل کا چھتا عجیب نظر آرہا ہے جیسے وہ کوئی مشینی پرندہ ہو اور ابھی اپنے پر پھیلا کر اڑ جائے گا۔ ایک دو کار ہارن بجائے بغیر گزر جاتی ہے۔ ایک تنہا راہگیر کہیں سے آنکلتا ہے۔ اس کی نظر چھتے پر پڑتی ہے۔ اس نے ایک کافی دبیز سفید رنگ کا ریشے دار سویٹر پہن رکھا ہے جس کے سبب وہ انسان کم اور انٹارٹیکا کا ایک جانور زیادہ نظر آرہا ہے۔ وہ فورسپس کو اٹھا کر اپنے چاروں طرف سوالیہ نظروں سے تاکتا ہے، پھر چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے۔ میں چہرہ دوسری طرف موڑ لیتا ہوں۔ وہ چھتا لیے ہوئے، الٹ پلٹ کر حیرت سے اس کا معائنہ کرتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ آہ، مجھے اس شاطر کہانی کار کو حیرت میں ڈالنا ہوگا، اسے اسی کی چال میں مات دینا ہوگی۔ میں اپنے کمرے کے اندر جاتا ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر سیتا ہلکی نیند سو رہی ہے۔ اس کا بھاری سینہ سانس کے زیر و بم کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ میں اس کے داہنے پستان پر ہاتھ رکھ کر سہلانے لگتا ہوں۔ سیتا آنکھیں کھولتی ہے، مسکراتی ہے۔ میں اس کے داہنے ہاتھ کو اوپر اٹھا کر چومتا ہوں جس میں اس نے شنکھ کے سکھ اور لوہے کے کڑے پہن رکھے ہیں۔ وہ اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیتی ہے۔

"تم دروازہ کیوں نہیں بند کر لیتے؟" سیتا شرما کر کہتی ہے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" میرے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اکٹوپس کی طرح اس کی ناف سے گزر کر نیچے جا رہی ہیں۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ اپنی ٹانگوں کے بیچ گیلی ہو چکی ہے۔

"گھبراؤ مت۔ گھر پر کوئی نہیں۔" میں اس کے صحت مند ننگے پستانوں کو چومتے ہوئے کہتا ہوں جو بلاؤز کے کٹے ہوئے گلے سے ابھرے ہوئے ہیں۔

سیتا بیڈروم کی میز پر لیٹی درد زہ سے کراہ رہی ہے۔ میں اسے دلاسا دے رہا ہوں جب ڈاکٹر

Scanned with CamScanner

اندر آتا ہے۔ سفید ماسک سے نکلی ہوئی عینک کے شیشوں کے اندر سے اس کی آنکھیں میری طرف نہیں تاکتیں۔ وہ کافی مصروف بھی دکھائی دے رہا ہے۔

"ہمیں مریض کو اوٹی میں لے جانا ہوگا۔" وہ میری طرف توجہ دیے بغیر نرس سے مخاطب ہوتا ہے اور اسٹیتھو سکوپ کو لاپروائی سے ہلاتے ہوئے اوٹی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اوٹی کے دروازے پر میں اسے جالیتا ہوں۔

"یہ کیس تو نارمل ڈلیوری کا ہے نا ڈاکٹر، جیسا کہ مجھے شروع سے بتایا گیا تھا؟" میں اس سے کہتا ہوں۔

"بچہ اس دنیا میں آنا نہیں چاہتا۔" ڈاکٹر کہتا ہے "اور پھر پیڑو کے مقابلے میں بچے کا سر بہت بڑا ہے۔ ہمیں فورسپس کا استعمال کرنا ہوگا۔"

"ارے نہیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔" میں سہم کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میری دونوں کنپٹیوں پر کوئی ٹھنڈی چیز رکھ دی گئی ہو۔ "میرا خیال ہے کہیں پر کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ صبح تک تو سب ٹھیک تھا۔ اچانک یہ سب کچھ کیسے بدل گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اور کیوں نہیں ہو سکتا؟" وہ تھوڑا پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے سے ماسک ہٹاتا ہے۔

"تم!"

"ہاں، میں۔" اس نے ماسک واپس لگا لیا ہے اور اب اس کے اندر سے اس کی آواز آرہی ہے۔ "اور تم سمجھ بیٹھے تھے کہ تم اپنی زندگی کی کہانی خود لکھ سکتے ہو۔ کیا یہ اتنا آسان تھا؟ دیکھو تم نے اپنا ستیاناس کر لیا نا؟ تم نے مجھ پر اعتبار نہ کیا۔ تم نے میرا بھیجا ہوا تحفہ سڑک پر پھینک دیا۔ یہی وہ فورسپس ہے نا جسے تم چمٹا کہتے تھے؟" وہ اپنے ایپرن کی جیب سے چمٹا نکال لیتا ہے۔ "تم نے جلد بازی کی۔ تم نے مجھ سے بازی لے جانا چاہا، اپنے خالق سے۔ تم نے سوچا تم صفحات سے باہر بھی سانس لے سکتے ہو، اپنی مرضی کی زندگی جی سکتے ہو۔ تم نے میرے انتظام میں جو انتشار پیدا کیا اب اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ فورسپس..." وہ فورسپس میرے چہرے کے سامنے لٹکا دیتا ہے۔ اس کا اسٹیل راہداری کی ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں بے رحمی سے چمک رہا ہے۔ "تمہارا بچہ، تم نے یہ بالکل ٹھ

سوچا اسے کیا چاہیے، کہ اس کی اپنی کوئی مرضی بھی ہو سکتی ہے جس کے لیے تم ساری عمر لڑتے آئے تھے، تم نے صرف مجھ سے جیتنے کی ضد میں اتنا بڑا فیصلہ لے لیا۔۔۔"

اوٹی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس کی سرخ بتی جل اٹھی ہے۔ میں ٹھنڈی دیوار سے چپکا کھڑا ہوں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ میرے سامنے اسٹریچر کے پہیے گھومنے لگتے ہیں۔ اس اسٹریچر پر سیتا درد کی شدت سے نیم بے ہوش لیٹی کراہ رہی ہے۔ گرچہ اس کی آنکھیں بند ہیں مگر جانے کیوں مجھے لگتا ہے اسے میری موجودگی کا علم ہے۔ اوٹی کا دروازہ کھلتا ہے۔ اسٹریچر کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر اندر چلا جاتا ہے۔ اب میں باہر اکیلا کھڑا ہوں۔ نہیں، شاید کوئی میرے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ یہ میرا باپ ہے جو آ گیا ہے اور لکڑی کے ایک بنچ پر خاموش بیٹھا ہے۔ مجھے اس کی موجودگی عجیب سی لگتی ہے جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو، صرف میرا اضافہ ہو گیا ہو۔ میرے سر کا درد بڑھتا جا رہا ہے۔ اس درد کے سبب میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں، مجھے دیوار کافی بھاری لگ رہی ہے جیسے وہ میرے سہارے کھڑی ہو۔ اندر سیتا کا درد زہ اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میرے باپ کی آواز مجھے اس دیوار سے کھینچ کر باہر نکالتی ہے۔ اوٹی کے بلب کی سرخی میری آنکھوں سے رس رہی ہے۔ میں سر موڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھتا ہوں، اور گرچہ وہ بنچ پر دیوار سے لگا بیٹھا ہے میں اسے دیکھ نہیں پاتا اور لڑکھڑاتے ہوئے باہر جانے لگتا ہوں۔ نرسنگ ہوم کے باہر ایک ایمبولنس کار کھڑی ہے جس کی روشنی تیزی سے گردش کر رہی ہے۔ ایک مریضہ اس نرسنگ ہوم سے کسی دوسری جگہ منتقل کی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر آکسیجن کا ماسک لگا ہے جس کے اوپر سے اس کی آنکھیں اس طرح نظر آ رہی ہیں جیسے وہ اپنے ہی اندر مرکوز ہوں۔ میں نے سڑک تیزی سے پار کی ہے۔ آسمان پر آدھی رات کا چاند دمک رہا ہے جو ہمارے محلے کی گلی تک، وہ سڑک تک میرا پیچھا کرتا ہے اور میرے رکتے ہی پیڑوں کے اوپر تھم جاتا ہے۔ ہماری عمارت کا صدر دروازہ ہمارے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے اپنے فلیٹ کی لینڈنگ پر آتا ہوں۔ درد سے پھٹتے سر کو ایک طرف گرا کر میں نے جیب سے کنجی نکالی ہے اور داخلے کا دروازہ کھول کر کنجی کو اس کے سوراخ سے لٹکتا چھوڑ دیا ہے۔

اب میں چاند سے روشن بالکنی پر اس کا جنگلا تھامے کھڑا ہوں اور دور تک نظر آنے والی عمارتوں

Scanned with CamScanner

کے اندر شاید واحد شخص ہوں جو جاگ رہا ہے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ نیچے سڑک اپنے دورویہ پیڑوں کے ساتھ سنسان پڑی ہے۔ میں ریلنگ پر جھک کر ایک گہری سانس لیتا ہوں۔ ہوا میں کٹھل چمپا کی تیز خوشبو ہے۔ آسمان پر روئی کے گالوں کی شکل کے بادل بکھرے ہوئے ہیں جیسے بے شمار پھاہے نہ نظر آنے والے زخموں پر رکھے ہوں۔ میں نے اپنے داہنے ہاتھ سے جنگلے کو تھام رکھا ہے مگر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اس مادی دنیا سے باہر نکل آیا ہوں۔ جانے کتنا وقت گزر گیا ہے، جب ایک تیز آواز سے میری محویت ٹوٹ جاتی ہے۔ فون کی گھنٹی کمرے کے اندر بج رہی ہے۔ میں جنگلے کو پھلانگ کر بالکنی کی دیوار کے باہری سرے پر قدم جماتا ہوں اور مڑ کر تاکے بغیر بھی سمجھ سکتا ہوں ہمارے فلیٹ کے دونوں نیم تاریک کمرے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف تاک رہے ہیں۔ فون کی گھنٹی لگاتار بجتی رہتی ہے۔ جانے کتنا وقت گزر جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے بھول جاتا ہوں۔ جب مجھے دوبارہ اس کی یاد آتی ہے تو میں دیکھتا ہوں فون کی گھنٹی رک چکی ہے اور ایک گہرے سنّاٹے نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، ایک ایسا سناٹا جو میرے کانوں میں کچھ کہنے کے لیے بے چین ہے۔ میں غور سے سننے کی کوشش کرتا ہوں مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میں سر اٹھا کر دیکھتا ہوں، آسمان پر روئی کے پھاہے ہوا کی زد میں آکر رینگنے لگے ہیں اور چھتوں پر دور تک سوکھنے کے لیے ٹنگے ہوئے کپڑوں نے پریت آتما کی طرح لہرانا شروع کر دیا ہے۔ جنگلے سے میری انگلیوں کی گرفت ہٹ گئی ہے اور اب میں بغیر کسی سہارے کے دیوار پر اپنی جگہ کھڑا ہوں جیسے میں اس پرانی عمارت کا ایک بے جان حصہ ہوں، پرنالے کے طور پر بنایا ہوا کوئی انسانی ڈھانچہ جس کی شرمگاہ سے برسات کا پانی باہر آتا ہے۔

بے جان انسانی ڈھانچے نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ اس نے ایک آخری نظر نیچے بادام کے پیڑ پر ڈالی ہے۔ پیڑ کی ڈالیاں سوڈیم لیمپ کی تیز روشنی میں سونے کی طرح دمک رہی ہیں۔ ان کے زیادہ تر پتے جھڑ چکے ہیں اور ٹہنیوں کے بیچ رکھا ہوا گھونسلا ویران ہے۔

❋ ❋

Scanned with CamScanner

ڈی ایچ لارنس

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

سورج

''انھیں دور کسی دھوپیلی جگہ لے جایئے،'' ڈاکٹروں نے کہا۔

وہ خود دھوپ کی طرف سے مشکوک تھی، لیکن اس نے اپنے بچے، انا اور ماں کے ساتھ سمندر پار بھیجے جانے پر چون و چرا نہ کی۔

جہاز آدھی رات کو روانہ ہوا۔ دو گھنٹے تک، جن کے دوران میں بچے کو سلا دیا گیا اور مسافر جہاز پر سوار ہوتے رہے اس کا شوہر اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ اندھیری رت تھی اور دریائے ہڈسن، جس پر روشنی کے ٹکڑے ہوئے پرزے تھرتھرا رہے تھے، بوجھل سیاہی کے ساتھ ڈول رہا تھا۔ اس نے جنگلے پر جھک کر نیچے دیکھتے ہوئے سوچا یہ سمندر ہے؛ یہ ہمارے قیاس سے کہیں زیادہ گہرا ہے اور یادوں سے زیادہ معمور ہے۔ اس لمحے سمندر، آفرینش سے پہلے کی درہمی کے اژدہے کے مانند، جو ہمیشہ سے زندہ ہے، لہراتا معلوم ہو رہا تھا۔

اس کا شوہر اس کے پہلو میں کھڑا، کہہ رہا تھا، ''یہ جدائیاں اچھی نہیں ہوتیں، پیاری۔ اچھی نہیں ہوتیں۔ مجھے ناپسند ہیں۔''

اس کا لہجہ مشوش اور شک بھرا تھا اور اس میں امید کے آسرے کو آخر تک نہ چھوڑنے کا ایک مستقل انداز پایا جاتا تھا۔

''نہیں، پسند تو مجھے بھی نہیں،'' اس نے یکساں آواز میں جواب دیا۔

اسے یاد آیا کہ ان دونوں نے، کتنی شدت سے، ایک دوسرے سے دور ہو جانا چاہا تھا۔ جدائی کے جذبے سے اس کے جذبات میں خفیف سا جھٹکا آیا لیکن اس سے غم کی وہ تلخی، جو اس کی روح میں اتر گئی تھی، اور گہری ہو گئی۔

انھوں نے اپنے سوتے ہوئے بچے کو دیکھا اور باپ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ لیکن یہ آنکھوں کی نمناکی نہیں، عادت کا، سال بھر کی، زندگی بھر کی، عادتوں کا گہرا آہنی آہنگ اور طاقت کی گہری ضرب ہے جو وقعت رکھتے ہیں۔

اور ان دونوں کی زندگیوں میں، اس کی اور شوہر کی طاقت کی ضرب مخاصمانہ تھی۔ دو ایسے انجنوں کی طرح، جو ایک دوسرے کے خلاف چل رہے ہوں، انھوں نے ایک دوسرے کے پرخچے اڑا دیے۔

"سب ساحل پر! سب ساحل پر!"

"مارلیس، تمھیں جانا چاہیے۔"

اور اس نے دل میں سوچا مارلیس کے لیے "سب ساحل پر" ہے اور میرے لیے دور سمندر کا سفر!

جہاز ساحل سے کھسک رہا تھا تو اس نے گودی کی نیم شبانہ بے رونقی سے اپنا رومال ہلایا: اژدہام میں سے ایک۔ اژدہام میں سے یک 'ہاں، یہی!

مسافر کشتیاں، جو روشنی کی قطاروں سے لدی ہوئی قابوں کے مانند تھیں، ابھی تک ہڈسن کے پار تر چھیا رہی تھیں۔ وہ سیاہ دہانہ ضرور لیکاوانا اسٹیشن ہوگا۔

جہاز چلتا رہا۔ ہڈسن لامتناہی معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن آخر کار وہ ساحلی خم کے گرد گھوم کر پار ہو گئے اور سورپے کی تربتر روشنیاں نظر آ گئیں۔ آزادی کے مجسمے نے غصے میں آ کر اپنی مشعل بلند کی۔ سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔

اور گو بحر اوقیانوس لادے کی طرح خاکستری تھا وہ، آخرش، دھوپ میں پہنچ ہی گئی۔ اس کے پاس سب سمندروں سے نیلے سمندر کے اوپر ایک مکان تھا اور ساتھ ہی، انگور کی بیلوں ورزیتون کے پیڑوں سے بھرا، ایک بہت وسیع باغ یا تاکستان تھا، جو تختہ بہ تختہ، ڈھلوان ہوتا ہوا، ساحلی میدان کی پٹی

تک چلا گیا تھا، اور باغ میں جا بجا گپت جگہیں اور دھرتی کے شگاف میں، دور نیچے، لیموں کے پیڑوں کے گمبھیر جھنڈ اور پانی کے پوشیدہ، شفاف ہرے ذخیرے تھے۔ پھر ایک چھوٹی کھوہ میں سے، جہاں یونانیوں کی آمد سے پہلے قدیم سکولیوں نے پانی پیا تھا، ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا، اور ایک پرانے مقبرے میں، جس کے تمام طاق خالی پڑے تھے، ایک بھوری بکری میا رہی تھی۔ چھوئی موئی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور پرے، آتش فشاں پر، برف تھی۔

اس نے سب کچھ دیکھا اور، ایک حد تک، یہ اندوہ ربا تھا۔ لیکن یہ سب چیزیں خارجی تھیں۔ اسے واقعی ان کی کچھ پروا نہ تھی۔ کسی حقیقی چیز کو محسوس کرنے کی نااہلیت اور اپنے اندر غیظ اور محرومی لیے ہوئے وہ خود ویسی کی ویسی ہی رہی۔ بچے سے اسے کوفت ہوتی تھی۔ وہ اس کے ذہنی سکون میں رخنہ انداز تھا۔ وہ اپنے آپ کو اتنے وحشت ناک اور ناگوار طور پر اس کے لیے ذمے دار محسوس کرتی تھی جیسے اس کے ہر سانس کی جواب دہ ہو۔ اور یہ اس کے اور بچے کے لیے اور ان سب لوگوں کے لیے، جو دونوں سے متعلق تھے، اذیت ناک تھا۔

"تمھیں پتا ہے، جولیٹ، ڈاکٹروں نے تمھیں کپڑوں بغیر دھوپ میں لیٹنے کو کہا تھا۔ تم کیوں نہیں لیٹتیں؟" ماں نے کہا۔

"جب اس قابل ہو جاؤں گی تو لیٹا کروں گی۔ تم کیا میری جان لینا چاہتی ہو؟" جولیٹ اس پر برس پڑی۔

"جان لینا چاہتی ہوں — نہیں! میں تو صرف تمھاری بھلائی چاہتی ہوں۔"

"خدا کے لیے، میرا بھلا چاہنے سے مجھے معاف رکھو۔"

آخر ماں کو اتنا صدمہ پہنچا اور غصہ آیا کہ وہ چلی گئی۔

سمندر سفید ہوا اور پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔ موسلا دھار مینہ برستا رہا۔ ٹھنڈ تھی، اس گھر میں جو دھوپ کے لیے بنا تھا۔

پھر ایک صبح ہوئی جب سورج، سمندری کگر سے، دمکتا ہوا، برہنہ اور گداختہ ابھرا۔ گھر کا رخ جنوب مغرب کی طرف تھا۔ جولیٹ بستر میں لیٹے لیٹے اسے نکلتا دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اس سے پہلے سورج کو نکلتے نہیں دیکھا۔ اس نے برہنہ سورج کو، سمندری افق پر، کبھی اس

Scanned with CamScanner

طرح چیک صاف کرتے ہوئے ذرات کو جھٹک کر دور کرتے نہیں دیکھا تھا۔

چنانچہ دھوپ میں ننگی ہونے کی خواہش چوری چوری اس کے دل میں ابھری۔ اس نے اپنی خواہش کو راز کی طرح سینے سے لگائے رکھا۔

لیکن وہ گھر سے، لوگوں سے دور جانا چاہتی تھی۔ اور ایسے دیس میں چھپ کر پھرنا آسان نہیں جہاں رستوں کا پتہ نہیں رہتا، جہاں ہر ڈھلان دور سے صاف نظر آتی ہو۔

لیکن اس نے ایک جگہ ڈھونڈ لی۔ سمندر اور دھوپ میں نکلا ہوا ایک پتھریلا کڑاڑا، جو چھیتے چھوب والی گھاس سے، جسے جنگلی ناشپاتی کہتے ہیں، ڈھکا ہوا تھا۔ اس ٹیلے پر ایک چپٹے موٹے تنے والا سرو کھڑا تھا، جس کی لچک دار پھننگ، اوپر نیلے فلک میں، ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی پہرے دار کھڑا سمندر کی طرف دیکھ رہا ہو، یا ایک چھوٹی روپہلی موم بتی جس کا بہت بڑا شعلہ روشنی کے سامنے اندھیرا تھا، دھرتی نے اپنی ظلمت کی پرغرور جیبھ باہر نکال رکھی تھی۔

جولیٹ نے سرو کے پاس بیٹھ کر اپنے کپڑے اتار دیے۔ مڑی تڑی ناگ پھنیوں نے اس کے چاروں طرف، بدصورت مگر بھی دلکش، جنگل بنا دیا۔ وہ بیٹھ گئی اور اپنے آپ کو سپرد کرنے کی سعی کے خلاف، ایک کڑے سے درد کے مارے، اب بھی آہ بھرتے ہوئے اس نے اپنا سینہ سورج کو ارپن کر دیا۔

لیکن سورج نیلے آسمان میں خراماں خراماں چڑھتا اور شعاعیں پھینکتا رہا۔ اس نے اپنی چھاتیوں پر، جو ایسے معلوم ہوتے تھے کہ کبھی نہ پکیں گی، سمندر کی ہلکی ہوا کو محسوس کیا۔ لیکن اس نے سورج کو مشکل سے محسوس کیا۔ اس کی چھاتیاں ایسے پھل تھیں جو سوکھ جائیں گے اور نہیں پکیں گے۔

تاہم، جلد ہی اس نے اس کے اندر دھوپ محسوس کی اور وہ جتنی گرم تھی اتنا پیار بھی کسی نے تھا، وہ دودھ پیتے بچے کے ہاتھوں سے بھی زیادہ گرم تھی۔ آخرکار، گرم دھوپ میں اس کی چھاتیاں لمبے، چپٹے انگوروں کے مانند ہو گئیں۔

اس نے سارے کپڑے اتار ڈالے اور ننگی ہو کر دھوپ میں لیٹ گئی اور لیٹے لیٹے، انگلیوں کے بیچ میں سے مرکزی سورج، اس کی نیلی تھرتھراتی گولائی کو دیکھا، جس کے بیرونی کنارے جگمگاہٹ چھوڑ رہے تھے۔ لاجوردی نیلاہٹ سے تھرتھراتا ہوا اور چمکدار اور اپنے کناروں سے سفید آگ

چھلکاتا ہوا سورج‘ جس نے روبرو ہو کر اپنے نیلی آگ بھرے تیور سے نیچے دیکھا اور اس کی چھاتیوں اور چہرے کو، اس کی گردن اور تھکے ہوئے شکم، گھٹنوں اور رانوں اور پاؤں کو ڈھک لیا۔

وہ آنکھیں میچے لیٹے رہی، گلابی شعلے کا رنگ اس کے پپوٹوں سے پار ہو گیا۔ یہ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر آنکھوں پر پتیاں رکھ لیں اور دوبارہ لیٹ گئی، لمبی سفید تونبی کی طرح جیسے دھوپ میں پک کر سنہری ہو رہا ہو۔

اس نے دھوپ کو ہڈیوں تک میں بلکہ ان سے بھی پرے، اپنے جذبوں اور خیالوں میں، سرایت کرتے محسوس کیا۔ اس کے جذبے کی تاریک کھچاوٹیں دور ہو چلیں، اس کے خیالوں کے سرد، تاریک جتھے پگھلنے لگے۔ وہ اپنے آر پار گرم محسوس کرنے لگی۔ وندھی ہو کر اس نے اپنے کندھوں، کولھوں، پچھلی رانوں اور پنڈلیوں تک کو دھوپ میں پگھل جانے دیا۔ اس پر جو بیت رہا تھا اس کی وجہ سے وہ مارے حیرانی کے، بے حواس سی لیٹی تھی۔ اس کا تھکا ہارا، افسردہ دل پگھل رہا تھا اور پگھل کرنا پید ہوتا جا رہا تھا۔

دوبارہ کپڑے پہننے کے بعد وہ ایک مرتبہ اور لیٹ گئی اور سرو کے درخت کو دیکھنے لگی جس کی کچے ریشے جیسی پھننگ ہوا میں ادھر ادھر جھکی پڑ رہی تھی۔ اس اثنا میں اسے عظیم سورج کا احساس رہا، جو آسمان میں آوارہ تھا۔

اس طرح دھوپ سے اندھی، چندھیائی اور چکرائی ہوئی وہ، بے حواس، گھر لوٹی۔ اور اس کا اندھاپن اس کے لیے دھن تھا اور اس کی دھندلی، گرم، بھاری، نیم بیداری دولت تھی۔

”امی! امی!“ اس کا بچہ اسے آواز دیتا ہوا اس کی طرف بھاگا۔ اس کی آواز میں چاہت کا وہی مخصوص چڑیوں جیسا کرب تھا، اسے ہمیشہ ماں کی طلب رہتی۔ جولیٹ کو تعجب ہوا کہ اس کے الجھے دل نے اس دفعہ جواب میں وہ متفکر، محبت بھرا کرب محسوس نہ کیا۔ اس نے بچے کو بانہوں میں اٹھایا لیکن سوچا اسے اتنا گول مٹول نہیں ہونا چاہیے اگر یہ دھوپ میں رہے تو اس میں جان پڑ جائے۔

بچے کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، جو اسے، خاص طور پر اس کی گردن کو، پکڑ رہے تھے، اسے بڑے معصوم ہوئے۔ اس نے اپنی گردن پیچھے ہٹالی۔ وہ چھڑانا چاہتی تھی اس نے آہستہ سے بچے کو اتار دیا۔

Scanned with CamScanner

"بھاگو!" وہ بولی، "دھوپ میں بھاگو!"

اور فوراً ہی اس نے اس کے کپڑے اتار کر اسے گرم چبوترے پر ننگا چھوڑ دیا۔

"دھوپ میں کھیلو!" وہ بولی۔

بچہ ڈر گیا اور رونے والا ہو گیا۔ لیکن اس نے بدن کی گرم آلکسی اور دل کی انتہائی بے اعتنائی کے ساتھ اس کی طرف، سرخ فرش پر، ایک نارنگی لڑھکا دی اور بچہ اپنے پلپلے، ادھورے، چھونے سے جسم کو لیے، ڈگمگاتا ہوا اس کے پیچھے چل دیا۔ لیکن اس نے نارنگی اٹھاتے ہی گرا دی کیونکہ پھل کا لمس اس کے بدن کو عجیب معلوم ہوا۔ اور اس نے رونے کے لیے چہرے کو سکیڑتے ہوئے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ ننگے ہونے کی وجہ سے خوف زدہ اور شاکی تھا۔

"مجھے نارنگی لا کے دو،" اس نے کہا اور بچے کی بے چینی پر اپنی گہری بے پروائی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "امی کو نارنگی لا کے دو۔"

اور اس نے دل میں کہا، "یہ اپنے باپ کی طرح بڑا نہیں ہوگا، جیسے کوئی کیڑا جسے سورج نے کبھی نہ دیکھا ہو۔"

2

ذمے داری کے عذاب میں بچہ اس کے ذہن پر اس طرح سوار رہا کرتا تھا جیسے اسے جننے کے بعد وہ اس کے تمام وجود کی جواب دہ ہو۔ اگر اس کی ناک بھی بہتی ہوتی تو وہ اسے گھناؤنا اور دل میں کھٹکنے والا معلوم ہونے لگتا، جیسے خود سے یہ کہنا اس پر لازم ہو: دیکھو تو سہی، تم نے کیا چیز جنی ہے!

اب ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ اسے بچے میں بہت گہری دلچسپی نہ رہی اور اس نے اپنے تردد اور ارادت کا بار اس پر سے ہٹا لیا۔

وہ دل میں سوچتی رہی، سورج کی شوکت اور اس سے وصل کے متعلق۔ اس کی زندگی اب پوری رسم تھی۔ صبح ہونے سے پہلے، وہ ہمیشہ جاگی ہوتی اور بیٹھے لیٹے بھورے آسمان میں ہلکا سنہرا پن آتا دیکھا کرتی تاکہ اسے پتا چل جائے کہ سمندری افق پر بادل ہیں یا نہیں۔ اسے خوشی اس وقت ہوتی جب وہ بالکل پگھلا ہوا، اپنی برہنگی میں طلوع ہوتا اور کومل آسمان پر نیلی اجلی آگ بکھیر دیتا۔

Scanned with CamScanner

لیکن کبھی کبھار وہ گلابی ہوتا، جیسے کوئی بڑی سی اور شرمیلی مخلوق ہو۔ اور کبھی وہ مست اور قرمزی سرخ ہوتا، اس کے تیور برہم ہوتے اور وہ آہستہ آہستہ دھکیلتا اور ہٹاتا ہوا آتا۔ کبھی وہ اسے دیکھ ہی نہ سکتی، بس افق، بادل بلندی سے سونا اور گلگونہ چھنک دیتے اور وہ دیوار کی آڑ میں ابھرتا رہتا۔

وہ خوش نصیب تھی۔ ہفتے گزر گئے اور کوئی دن بغیر دھوپ کا نہ ہوا، گو کبھی کبھار صبح بڑا آلود اور سہ پہر بھیگی ہوتی اور حالانکہ سردی کی رت تھی، اکثر دن تابناکی سے معمور ہوتے۔ چھوٹے چھوٹے، پتلے، شوخ ارغوانی اور دھاری دار چیتے کرکم لہلہانے لگے اور صحرائی نرگسوں نے اپنے زمستانی ستارے آویزاں کر دیے۔

ہر روز وہ سرو کے درخت تک جاتی جو ناگ پھنی کے جھنڈ والے ٹیلے پر، جس کے پائیں پیلے سے کڑاڑے تھے، کھڑا تھا۔ وہ اب زیادہ سمجھ دار اور زیادہ زیرک ہو گئی تھی اور صرف چپل اور بھورا فختئی لبادہ پہنے رہتی۔ چنانچہ کسی بھی مخفی گوشے میں، آن کی آن میں، دھوپ میں برہنہ ہو سکتی۔ اور جب وہ دوبارہ کپڑے پہن لیتی تو خاکستری اور اوجھل ہو جاتی۔

ہر روز وہ، صبح اور دوپہر کے درمیان، روپہلے پنجے والے تومند سرو کے چرنوں میں لیٹتی اور سورج، شادماں، آسماں میں رواں رہتا۔ اب دھوپ اس کے بدن کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی، ایک بھی سرد سایہ باقی نہ رہا تھا۔ اور اس کا دل، اس کا مشوش اور مسوسا ہوا دل، بالکل ہی غائب ہو گیا تھا، جیسے کوئی پھول، دھوپ میں پنکھڑی پنکھڑی ہو کر، صرف ایک پکا ہوا، اچھا گل چھوڑ جائے۔

وہ آسمان میں سورج سے آشنا تھی، جو اجلی آگ کے کنارے سمیت، نیلا اور پھولا ہوا، آگ بکھیرتا رہتا تھا۔ اور گو وہ سارے سنسار پر چمکتا لیکن جب وہ کپڑے اتارے لیٹی ہوتی تو اس پر مرکوز ہو جاتا۔ سورج کے کرشموں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لاکھوں آدمیوں پر چمکنے کے باوجود وہ صرف اس پر مرکوز ہونے والا تابناک، یگانہ سورج رہتا۔

سورج سے آشنائی اور اس یقین کی وجہ سے کہ سورج "آشنائی" کے کائناتی نفسانی مفہوم میں اس سے آشنا تھا، اس پر لوگوں سے بے تعلقی اور تمام انسانوں کو ایک خاص حقارت کی نظر سے دیکھنے کا جذبہ غالب آ گیا۔ وہ سب اتنے غیر عنصری اور دھوپ نہ کھائے ہوئے تھے۔ وہ گورستان کے کیڑوں سے اتنے مشابہ تھے۔

Scanned with CamScanner

اور گدھوں کے ساتھ پرانی، پتھریلی چھوٹی سڑک پر سے گزرنے والے دھوپ سے سنولائے کسان تنگ دار پار دھو پیائے ہوئے نہ تھے۔ خوف کا ایک چھوٹا، ملائم سفید مرکز تھا جیسے بیج میں گھونگا ہوتا ہے، جہاں مرد کی روح موت کے خوف سے زندگی کی فطری بھڑک سے سہم کر دبکی ہوئی تھی۔ باطن میں ہمیشہ سہا ہوا وہ پوری طرح سر اٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ سب مردوں کا یہی حال تھا۔

لیکن مردوں کا کیا مذکور!

لوگوں اور مردوں کی طرف سے بے اعتنا ہو کر اس نے خود کو نظروں سے اوجھل رکھنے کا پہلا سا اہتمام کرنا اب چھوڑ دیا۔ اس نے ماری نینا کو، جو اس کے لیے گاؤں سے سودا سلف لایا کرتی تھی، بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر نے سورج غسل تجویز کیا تھا۔ اتنا کہنا کافی تھا۔

ماری نینا ساٹھ سال سے اوپر کی عورت تھی، لمبی، دبلی اور راست قامت، اس کے بھرے سرمئی گھونگریالے بال تھے اور گہری سرمئی آنکھیں تھیں جن میں ہزاروں سال کی فراست اور وہ ہنسی تھی جو تمام طویل تجربے کی تہہ میں ہوتی ہے۔ المیہ تجربے ہی کا نتیجہ ہے۔

"دھوپ میں ننگا پھرنا ضرور سہانا معلوم ہوتا ہوگا!" ماری نینا نے، آنکھوں میں سیانی کھلکھلاہٹ کے ساتھ، دوسری عورت کو تکتے ہوئے، دیکھتے ہوئے، کہا۔ جولیٹ کے شانوں تک کٹے ہوئے بھورے بال، بل کھا کر، کنپٹی کے پاس چھوٹا سا غبار معلوم ہو رہے تھے۔ ماری نینا ایک پرانی عورت تھی اور اس کی یادیں بہت پرانی تھیں۔ اس نے جولیٹ پر دوبارہ نظر ڈالی۔ "بلکہ خود بھی حسین ہونا چاہیے، اگر سورج کو آزردہ کرنے کا ارادہ نہ ہو؟ یہی بات ہے نا؟" اس نے پرانے وقتوں کی عورتوں کی طرف، دم بستہ، چھوٹی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"کسے پتا کہ میں حسین ہوں بھی؟" جولیٹ نے کہا۔

لیکن حسین ہو یا نہ ہو، اسے یہ احساس تھا کہ سورج اس کی قدر کرتا تھا۔ جو ایک ہی بات ہے۔ دوپہر کو دھوپ چھوڑ کر جب وہ کبھی کبھار چٹانوں کے اوپر اور نشیبوں کے کناروں کے پاس سے دبے پاؤں چلتی ہوئی گہری تنگ گھاٹی میں اتر جاتی، جہاں ٹھنڈی ابدی چھاؤں میں لیموں لٹکے ہوئے تھے، اور پھر شفاف ہرے حوضوں میں سے ایک میں جلدی سے نہانے کے لیے اپنا لبادہ اتارتی تو لیموں کے پتوں کے سادہ، ہرے جھٹپٹے میں دیکھتی کہ اس کا سارا بدن گلابی ہو گیا ہے، سنہرا

Scanned with CamScanner

ہوتا جارہا ہے۔ جیسے وہ کوئی اور ہی عورت ہو۔ وہ کوئی اور ہی تھی۔

یوں اسے یاد آیا کہ یونانی کہا کرتے تھے کہ سفید، دھوپ نہ کھایا ہوا جسم مچھلی کا سا اور روگی ہوتا ہے۔ اور وہ بدن پر تھوڑا سا زیتون کا تیل مل کر، ناف میں لیموں کا پھول رکھے آپ ہی آپ ہنستی ہوئی، پل بھر کو لیموں کے درختوں کے زیریں طبقے میں گھومتی۔ یہ امکان البتہ تھا کہ شاید کوئی کسان اسے دیکھ لے۔ لیکن اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو وہ اس سے اتنی نہ ڈرتی جتنا وہ ڈرتا۔ مردوں کے ملبوس جسموں میں خوف کے سفید مرکز سے وہ آگاہ تھی۔

وہ اسے اپنے چھوٹے لڑکے تک میں نظر آ چکا تھا۔ وہ اس سے کتنا بدگمان تھا کہ اب وہ اپنے چہرے میں دھوپ بھرے اس پر ہنسا کرتی تھی۔ وہ اسے روز روز، دھوپ میں ننگا پھرانے پر مصر تھی۔ اور اب اس کا چھوٹا سا بدن بھی گلابی ہو گیا تھا، اس کے سنہرے بال آگے سے گھنے ہو کر پھیل گئے تھے اور اس کی اجلی رنگت کے لطیف سنہرے پن کے سامنے اس کے گال ایسے تھے جیسے گل انار۔ وہ سندر اور توانا تھا اور نوکر چاکر، جو اس کی لالی، سنہرے پن اور نیلاہٹ سے پیار کرتے تھے، اسے آسمانی فرشتہ کہتے تھے۔

لیکن ماں سے وہ بدگماں تھا؛ وہ اس پر ہنستی تھی۔ اور اس نے بچے کی پیشانی پر، چھوٹی سی شکن کے نیچے، بڑی نیلی آنکھوں میں خوف اور شک کا وہی مرکز دیکھا تھا، جو اب اسے یقین تھا کہ تمام مردوں کی آنکھوں کے بیچوں بیچ موجود ہے۔ وہ اسے دھوپ کا خوف کہتی تھی۔

بچے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ دل میں کہتی: "یہ دھوپ سے ڈرتا ہے۔"

اور اسے دھوپ میں ڈگمگاتے، لڑکھڑاتے، جھومتے اور چڑیوں جیسی چھوٹی چھوٹی آوازیں نکالتے دیکھ کر جولیٹ پر روشن ہوا کہ وہ خود کو، اپنے اندر، سورج سے پوشیدہ اور کھنچا کھنچا رکھتا تھا۔ اس کی روح، بیج کے کھونگھے کی طرح، اس کے اندر ایک مرطوب، سرد درز میں تھی۔ اسے دیکھ کر جولیٹ کو اس کا باپ یاد آتا۔ اس کی تمنا تھی کہ کاش وہ اسے سامنے نکلنے پر، ہر قید و بند سے اس طرح آزاد ہو جانے پر آمادہ کر سکے، جو بے باکی اور استقبال کی دلیل ہو۔

اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اسے اپنے ہمراہ ناگ بھنیوں میں گھرے سرو کے پاس لے جایا کرے گی۔ کانٹوں کی وجہ سے اس پر نگاہ تو ضرور رکھنی پڑے گی لیکن وہاں وہ اس چھوٹے سے خول

Scanned with CamScanner

سے، جو اس کی گہرائیوں میں تھا، یقیناً نکل آئے گا۔ وہ چھوٹا، متمدن کھچاؤ اس کے ماتھے سے دور ہو جائے گا۔

اس نے ایک گدّا اچھا کر اسے بٹھا دیا۔ پھر اس نے اپنا لبادہ اتار ڈالا اور لیٹ کر نیلے آسمان میں بہت بلندی پر اڑنے والے باز اور سرو کی جھکی ہوئی پھننگ کو دیکھنے لگی۔

بچہ گدّے پر بیٹھا کنکروں سے کھیلتا رہا۔ جب وہ اٹھ کر چل دیا تو وہ بھی اٹھ بیٹھی۔ اس نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں، تقریباً، اصلی مرد کے گرم، للکارنے والے تیور تھے۔ اور وہ خوب صورت تھا، اس کی جلد کے سنہرے گورے پن میں لالی تھی۔ وہ سچ مچ گورانہ تھا۔ اس کی رنگت سنہری سانولی تھی۔

"کانٹوں کا دھیان رکھنا، پیارے،" وہ بولی۔

"کانٹے!" بچے نے، چڑیوں جیسی چہچہاہٹ سے، دُہرایا اور سر موڑے ماں کی طرف دیکھتا رہا، جیسے کسی تصویر میں کوئی ننھا فرشتہ، ہچکچایا ہوا، کھڑا ہو۔

"بڑے خراب نوکیلے کانٹے۔"

"نکیلے کانٹے!"

وہ خشک جنگلی پودینہ توڑتے توڑتے، اپنے چھوٹے چپلوں کی وجہ سے، پتھروں پر لڑکھڑایا اور کانٹوں پر گرنے ہی والا تھا کہ وہ، سانپ کی سی تیزی سے، چھلانگ مار کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس پر خود اسے بھی تعجب ہوا۔ "تو پھر، میں بھی کیسی ہوں!" اس نے دل میں کہا۔

ہر روز، جب سورج چمکنے لگتا، وہ اسے سرو کے درخت کے پاس لے جاتی۔

"آؤ!" وہ کہتی، "سرو کے درخت کے پاس چلیں۔"

اور اگر دن ابر آلود ہوتا، پہاڑوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی اور وہ باہر نہ جا سکتے تو بچہ لگاتار چہچہاتا، "سرو کا درخت! سرو کا درخت!"

وہ بھی اسے اتنا ہی یاد کرتا تھا۔

یہ محض آفتابی غسل نہیں تھا۔ یہ اس سے کہیں بڑی بات تھی۔ اس کے اندر کوئی گہری شے کھل گئی اور آسودہ ہو گئی، اور وہ دے دی گئی۔ اپنے اندر کی کسی پُراسرار طاقت سے، جو اس کے ظاہری شعور اور

اور اسے عمیق زندگی تھی، وہ سورج سے جوڑی گئی اور وہ چشمہ، اس کے رحم سے، خود بخود جاری تھا۔ وہ خود اس کی شعوری ذات، ثانوی حیثیت رکھتی تھی، ایک ثانوی ہستی تھی بلکہ تماشائی کہنا چاہیے۔ اصلی جولیٹ وہ تاریک بہاؤ تھا جو اس کے گمبھیر جسم سے سورج کی طرف رواں تھا۔

وہ ہمیشہ اپنی مرضی کی مالک رہی تھی اور اسے پتا ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور اپنی ذاتی طاقت کی احتیاط سے چمٹی رہتی تھی۔ اب اس نے اپنے اندر ایک بالکل ہی مختلف طرح کی طاقت محسوس کی، وہ ایک شے جو اس سے عظیم تھی اور خود بخود جاری تھی۔ اب وہ مبہم تھی لیکن اس کے پاس اپنے سے ماورا طاقت تھی۔

3

فروری کے آخر میں [illegible] ہوگئی۔ بادام کے پھول، ہلکی سے ہلکی ہوا چلنے سے، گلابی [illegible] رہے تھے۔ [illegible] رنگ والی روشنی جیسے پھول کھل گئے تھے۔ خشخشی پیلی کلیاں [illegible] تھی۔

[illegible] تھی۔ [illegible] میں وہ اور بچہ دھوپ میں [illegible] سمندر میں نہاتی، اکثر [illegible] دھوپ [illegible] اور نظروں سے غائب رہتی۔ کبھی کبھار اسے کوئی کسان [illegible] لیکن وہ اتنی سادگی اور خاموشی سے بچے کے ساتھ گھوما [illegible] اور جسم دونوں کے لیے تھی، شہرہ لوگوں میں پھیل چکا تھا اس لیے کوئی کھلبلی نہ پڑی۔

[illegible] ایک گلابی سنہرا پن چڑھ گیا تھا۔ "میں [illegible] دیکھتے ہوئے دل میں کہا۔

[illegible] دھوپ کی سنولائی محویت تھی۔ اب [illegible] ضرورت بھی نہ پڑتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب اسے بھی پتا نہ چلتا تھا کہ وہ اکیلا ہے۔

Scanned with CamScanner

ہوا تھم کو بھی نہ تھی اور سمندر ناچورونی تھا۔ وہ سرو کے بڑے زرد پیلے پنجے کے پاس، دھوپ سے محروم بیٹھی تھی یعنی اس کی چھاتیاں چست اور رس بھری تھیں۔ وہ آگاہ ہوتی جا رہی تھی کہ ایک نئی فعلیت اس میں جاگ رہی ہے، جو اسے زندگی کی ایک نئی روش پر لے جائے گی۔ تاہم وہ آگاہ ہونا نہ چاہتی تھی۔ وہ درد کی ہڑک اور سرد مہر سرگرمی سے بخوبی واقف تھی، جس سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہے۔

بچہ پتھریلی پگڈنڈی پر چند گز آگے، ایک ناگ پھنی کے چوڑے پھیلاؤ کے گرد، چلا گیا تھا۔ وہ اسے جاتے دیکھ چکی تھی، ہواؤں کا ایک ننھا منا سنہرا اسلوتا بالک، جس کے جلے سونے جیسے بال اور لال گال تھے، جو چیتے صحرائی پھول کٹھے کر کے قطاروں میں رکھ رہا تھا۔ وہ اب اپنا توازن قائم رکھنے کے قابل ہو گیا تھا، اور اپنی فوری ضرورتوں کے لیے تیار، یک چپ چاپ کھیلنے والے محو کسن جانور کی طرح۔

اچانک اس نے بچے کو بولتے سنا: "دیکھو، امی امی، دیکھو!" اس کی چڑیوں جیسی آواز میں ایک نئے جذبے کی موجودگی نے اسے یک بیک آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ گردن موڑے، اپنے برہنہ کندھے پر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے، چھوٹے سے ڈمپلے ہاتھ سے ایک سانپ کی طرف اشارہ کر رہا تھا، جو اس سے گز بھر کے فاصلے پر پھن کو اپنا منہ کھول رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی دو شاخہ نرم زبان، سائے کی طرح کالی لہرائی اور اس نے چھوٹی سی پھنکار ماری۔

"دیکھو امی!"

"ہاں بیٹے، یہ سانپ ہے۔" بھری بھری سی گہری آواز آئی۔

اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی نیلی آنکھیں مذبذب تھیں کہ ڈرنا چاہیے یا نہیں۔

ماں میں محبوب کا سا سکون دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھ گئی۔

"سانپ!" وہ چہکا۔

"ہاں پیارے، اسے چھونا نہیں، یہ کاٹ سکتا ہے۔"

سانپ نے پھن نیچے کر دیا، اور جب جانے کے لیے جو پگڈنڈی پر رکی تھی اسے موڑنے لگا اور،

آہستہ آہستہ، اپنا لمبا سنہری، کُل بھورا جسم، دھیمے بلوں کے ساتھ، پتھروں میں گھسانے لگا۔ بچہ مڑ کر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا: "سانپ جا رہا!"

"ہاں! اسے جانے دو۔ اسے اکیلے رہنا اچھا لگتا ہے۔"

جب تک سانپ بے اعتنائی سے رینگتا ہوا اوجھل نہ ہو گیا، وہ اس کی سست، گھسٹتی ہوئی لمبائی دیکھتا رہا۔

"سانپ واپس چلا گیا،" اس نے کہا۔

"ہاں، واپس چلا گیا۔ امی پاس آؤ ذرا۔" اس نے آ کر اپنا چھوٹا، بگلگو تھا بدن ماں کی ننگی گود میں ڈال دیا۔ اور ماں اس کے اجلے، چکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی لیکن یہ محسوس کر کے کہ جو ہونا تھا ہو چکا، کچھ نہ بولی۔ سورج کی تسکین دینے والی نرالی طاقت اس کے اندر اور اس ساری جگہ میں جادو کی طرح سما گئی اور اس کے اور بچے کے ساتھ سانپ بھی اس جگہ کا حصہ تھا۔

ایک اور دن اس نے ایک کالا سانپ زیتون کے پیڑوں والے چبوتروں میں سے ایک کی خشک، سنگین دیوار پر افقی چلتا دیکھا۔

"ماری نینا،" اس نے کہا، "میں نے ایک کالا سانپ دیکھا۔ کیا یہ زہریلے ہوتے ہیں؟"

"اوہ، کالے سانپ، نہیں! لیکن پیلے سانپ، ہاں! اگر کوئی پیلا تمھیں کاٹ لے تو مر جاؤ۔ لیکن میں تو جب بھی کوئی سانپ دیکھتی ہوں مجھے ہول آتا ہے، خواہ وہ کالا ہی ہو۔"

جولیٹ بچے کے ساتھ برابر سرو کے درخت کے پاس جاتی رہی۔ لیکن جہاں جہاں بچہ جا سکتا ہو ان جگہوں کو، بیٹھنے سے پہلے، ہمیشہ دیکھ بھال کر چاروں طرف غور سے نگاہ ڈال لیتی۔ پھر وہ دھوپ کا رخ کر کے لیٹ جاتی اور اس کی سنولائی ہوئی، ناشپاتیوں جیسی، چھاتیاں اوپر کو اٹھی رہتیں اور وہ آنے والی کل کے بارے میں کچھ نہ سوچتی۔ اسے اپنے باغ سے باہر سوچ بچار کرنے سے انکار تھا اور وہ خط نہ لکھ سکتی تھی۔ لکھنا ہوتا تو نرس سے کہہ دیتی۔

4

اب مارچ تھا اور سورج بہت قہری ہو چکا تھا۔ گرم ساعتوں میں وہ درختوں کی چھاؤں میں

پڑی رہتی یا لیموں کے درختوں کے ٹھنڈے جھنڈ کے نشیب تک کا چکر لگا آتی۔ بچہ، زندگی میں کمسن جانور کی طرح، دور دور، بھاگا پھرتا۔

ایک دن وہ، بڑے حوضوں میں سے ایک میں نہانے کے بعد، گھاٹی کی تیکھی ڈھلان پر دھوپ میں بیٹھی تھی۔ نیچے، لیموں کی چھاؤں میں، بچہ سائے میں کھلنے والے ترشے کے پیلے پھولوں میں لڑکھڑا لڑکھڑا کر چلتا ہوا، گرے پڑے لیموں اکٹھے کر رہا تھا۔ اس کا ننھا، سنولایا ہوا بدن جب روشنی کے دھبوں سے گزرتا تو چتکبرا ہو جاتا۔

اچانک، دھرتی کی لکر کے بہت اوپر، پرنور نیلے آسمان کے سامنے ماری نیتا، سر پر کالا کپڑا باندھے، رنج سے پکارتی ہوئی نمودار ہوئی: ''سینورا! سینورا! سینورا جولیتا!''

جولیٹ اس کی طرف منہ کر کے کھڑی ہونے لگی۔ برہنہ عورت کو، جس کے دھوپ سے تمتمائے ہوئے بھورے بال چھوٹا سا غبار تھے، ننگ کھڑا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکی، پھر اس پھرتیلی بڑھیا نے کھڑی پگڈنڈی کی ڈھلان پر نیچے اترنا شروع کیا۔

وہ دھوپ رنگی عورت کے سامنے، چند قدم کے فاصلے پر تن کر کھڑی ہوئی اور بغور دیکھنے لگی۔

''لیکن تم کتنی خوبصورت ہو، تم!'' اس نے بے پروائی سے تقریباً چڑاتے ہوئے کہا، ''تمھارے میاں آئے ہیں۔''

''میرے میاں!'' جولیٹ چیخی۔

بڑھیا نے عفعف سے مشابہ چھوٹی ہنسی ہنسی گزرے زمانے کی عورتوں کا استہزا!

''تمھارا میاں نہیں کیا، تمھارا؟'' اس نے چڑایا۔

''لیکن کہاں ہے وہ؟'' جولیٹ چیخی۔

بڑھیا نے منہ موڑ کر پیچھے دیکھا۔

''وہ میرے پیچھے آ رہا تھا،'' اس نے کہا، ''لیکن اسے پگڈنڈی نہیں ملی ہوگی۔'' اور پھر عفعف کے ذرا ہنسی۔

پگڈنڈیوں پر اس قدر لمبی لمبی گھاس، دھرتی دار چپتلا اور پھول اُگے ہوئے تھے کہ وہ کسی دنیا رنگ میں چڑیوں کی تیتیں معلوم ہونے لگی تھیں۔ تہذیب و تمدن کے قدیم گہواروں کا نمایاں

اجاڑپن بھی عجیب اجاڑپن ہے کہ وحشت ناک نہیں۔

جولیٹ نے نوکرانی کو متامل آنکھوں سے دیکھا۔

"اچھا، خیر!" اس نے آخر کہا: "آنے دو۔"

"یہاں آنے دوں؟ ابھی؟" ماری نینا نے مسکراتی ہوئی، بھورے دھوئیں جیسی آنکھیں، تمسخر کے ساتھ، جولیٹ کی آنکھوں میں ڈال کر پوچھا۔ پھر اس نے اپنے کندھوں کو ذرا جھٹکا۔

"بہت بہتر، جو تمھاری مرضی۔ لیکن اس کے لیے یہ طرفہ ہے..."

اس نے منہ کھول کر بے صدا خوشی کا ایک قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے بچے، بچے کی طرف، اشارہ کیا، جو اپنے چھوٹے سینے پر لیموں اٹھائے رہا تھا۔ "دیکھو، بچہ کتنا سندر ہے! اسے دیکھ کر باپ ضرور خوش ہوگا، بے چارہ۔ یہ میں اسے مانتی ہوں۔"

"بلاؤ!" جولیٹ نے کہا۔

بڑھیا پھرتی ہوئی جلدی سے پگڈنڈی پر چڑھتی گئی۔ ماریس خاکستری فلیٹ ہیٹ اور سیاہی مائل بھورا سوٹ پہنے، پژمردہ، نارنگستانی چبوتروں کے درمیان، چکرایا ہوا کھڑا تھا۔ وہ اس بھڑکیلی دھوپ اور یونانی دیومالائی لطافت میں، افسوس کے طور پر، بے محل معلوم ہو رہا تھا جیسے دھوپ میں دمکتے، کم رنگ ڈھلان پر روشنائی کا دھبا ہو۔

"آؤ!" ماری نینا نے کہا: "وہ یہاں نیچے ہے۔"

اور پھرتی سے قدم اٹھاتی ہوئی اور جلدی جلدی بڑھتی ہوئی گھاس میں چلتی رہی۔ ڈھلان کی نکڑ پر وہ یکایک رک گئی۔ دور نیچے، لیموں کے درختوں کی کالی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔

"وہاں نیچے چلے جاؤ،" ماری نینا نے اس سے کہا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور ماری نینا پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ چالیس سال کا تھا، اس کی مونچھیں صاف تھیں اور چہرہ بے رونق، بہت کم گو اور سچ مچ شرمیلا۔ وہ اپنا کاروبار حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ لیکن موثر طور پر احتیاط سے چلاتا تھا، اور اسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ یونان اکبر کی بڑھیا نے اسے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا: "اچھا یہ آدمی بھلا ہے،" اس نے دل میں کہا، "لیکن مرد نہیں، بے چارہ۔"

"سینور وہاں نیچے ہے" ماری نینا نے کہا اور اس طرح اشارہ کیا جیسے قسمت کی دیویوں میں

Scanned with CamScanner

سے ایک ہو۔

اور اس نے مدھم آواز میں کہا: ''شکریہ! شکریہ!'' اور پلک جھپکی۔ ماریں اور بڑی احتیاط سے پگڈنڈی پر قدم دھرے۔ ماری مینا نے سرور حرارت سے اپنی ٹھوڑی اوپر کی۔ پھر وہ گھر کی طرف چلی گئی۔

پھر وہ بڑے سے ناہموار پگڈنڈی میں ماریں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہا تھا، اس لیے بیوی کو ایک موڑ پر گھومنے سے پیشتر نہ دیکھ سکا، گو وہ اس موڑ کے بالکل نزدیک کھڑی تھی۔ وہ آگے نکلی ہوئی چٹان کے پاس ننگی دھرتی پر کھڑی، دھوپ اور گرم زندگی سے چمچما رہی تھی۔ اس کی چھاتیاں، معلوم ہوتا تھا، پکے ہوئے کو چست کھڑی ہیں اور اس کی رانیں دیکھنے میں سانولی اور بھرتیلی تھیں۔ جب وہ، جاذب پر روشنی کی طرح نمودار ہوا تو جولیٹ نے اس پر ایک سریع اور مضطرب نظر ڈالی۔

ماریں غریب نے ٹھٹک کر اس پر سے نگاہ ہٹا لی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔

''ہیلو، جولی!'' اس نے ایک اضطراب آمیز مختصر کھنکار کے ساتھ کہا، ''بہت خوب! بہت خوب!''

وہ منہ موڑے، جولیٹ پر دزدیدہ نگاہیں ڈالتا، بڑھتا گیا۔ جولیٹ کے سنولائے ہوئے بدن پر دھوپ کی مخصوص اطلسی چمک تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ بے طرح ننگی نہ معلوم ہو رہی تھی۔ اسے دھوپ کے چڑھائے ہوئے سنہرے گلابی رنگ نے ڈھانپ رکھا تھا۔

''ہیلو، ماریں!'' اس نے ماریں سے چہکتے ہوئے کہا، ''مجھے امید نہ تھی تم اتنی جلد آؤ گے۔''

اس نے کہا، ''نہیں، نہیں، بس میں موقع نکال کر ذرا پہلے ہی کھسک آیا۔'' اور دوبارہ بے سلیقگی سے کھانسا۔

وہ ایک دوسرے سے کئی گز دور کھڑے تھے اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''خیر''... ''وہ... اور... بہت خوب، بہت خوب! تم بہت خوبرو ہو! بچہ کہاں ہے؟'''' ''وہ وہاں ہے،'' اس نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں ایک ننگا چنچل بچہ، گھنی چھاؤں میں جھڑے ہوئے لیموؤں کا ڈھیر لگا رہا تھا۔

باپ نے عجیب مختصر سا قہقہہ لگایا۔

''ارے ہاں! وہ رہا! تو ننھے میاں وہاں ہیں! خوب!'' اس نے کہا۔ اس کی مغلوب اور

Scanned with CamScanner

پراضطراب روح نے بیچ بیچ اہتزاز محسوس کیا۔ "ہیلو، جونی!" اس نے آواز دی، جو کچھ ناتواں سی معلوم ہوئی۔ "ہیلو، جونی!"

بچے نے، گداز بانہوں سے لیموں لٹکاتے ہوئے، اوپر دیکھا لیکن جواب نہ دیا۔

"میرے خیال میں ہم نیچے اس کے پاس چلیں،" جولیٹ نے مڑ کر پگڈنڈی پر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کا شوہر پیچھے ہولیا۔ وہ کمر کے خم نے میں ذرا بل کھا رہی تھی اور وہ اس کے بھرے بھرے کولھوں کا گلابی، سبک سایہ چڑھاؤ اتار دیکھتا رہا۔ وہ اچنبھے کے مارے ششدر رہ گیا، لیکن ساتھ ہی شدید بے یقینی میں گرفتار تھا۔ وہ خود کو کہاں لے جائے؟ اس کا سیاہی مائل بھورا سوٹ اور خاکستری فیلٹ ہیٹ اور شرمیلے کاروباری مرد جیسا اکتایا ہوا راہبانہ چہرہ اس منظر میں بالکل بے محل تھا۔

"اچھا بھلا معلوم ہوتا ہے، نہیں معلوم ہوتا؟" پیلے پھولوں بھرے ترشوں کے گھنے پھیلاؤ میں چلتے چلتے، لیموؤں کے تلے آ کر، جولیٹ نے کہا۔

"وہ، ہاں، ہاں بہت خوب! بہت خوب! — ہیلو جونی! تم نے ابا کو پہچانا؟ ابا کو پہچانا، جونی؟" اس نے نیچے بیٹھ کر اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

"لیموں!" بچے نے چڑیوں کی طرح چہچہا کر کہا، "دو لیموں!"

"دو لیموں!" باپ نے جواب دیا، "ڈھیروں لیموں!"

بچے نے بڑھ کر باپ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ایک ایک لیموں رکھ دیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔

"دو لیموں!" باپ نے دہرایا، "آؤ، جونی! آؤ اور ابا سے کہو 'ہیلو'۔"

"ابا واپس جا رہے؟" بچے نے کہا۔

"واپس جا رہے؟ خیر — ابھی آج تو نہیں۔" اور اس نے بچے کو گود میں لے لیا۔

"ایک کوٹ اتار دو ابا، ایک کوٹ اتار دو!" بچے نے، بانکپن کے ساتھ، کپڑوں سے بچتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا بیٹے! ابا نے ایک کوٹ اتارا۔"

اس نے کوٹ اتارا، درستنبھل کر ایک طرف ڈال دیا اور بچے کو دوبارہ گود میں بٹھا لیا۔ ننگی

عورت ننگے بچے کو کوٹ اتارے مرد کی گود میں بیٹھا دیکھتی رہی۔ بچے نے باپ کا ہیٹ اتار پھینکا اور جولیٹ نے شوہر کے چکنے، کالے اور سرمئی بال دیکھے، ایک بال بھی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا نہ تھا۔ وہ قطعاً گھریلو تھا۔ جولیٹ بہت دیر تک خاموش رہی۔ اتنے باپ بچے سے، جو باپ کو بہت چاہتا تھا، باتیں کرتا رہا۔

''اس بارے میں تمھارا کیا کرنے کا ارادہ ہے، ماریس؟'' وہ اچانک بولی۔

ماریس نے کن انکھیوں سے اسے پل بھر دیکھا۔ ''ار — کس بارے میں، جولی؟''

''ہر چیز کے اسی کو لے لو! میں نیو یارک واپس نہیں جا سکتی۔''

''نہیں . . . '' وہ ہچکچایا، ''نہیں، میرے خیال میں نہیں — کم از کم فی الحال تو نہیں۔''

''کبھی نہیں،'' وہ بولی اور خاموشی چھا گئی۔

''اچھا — ار — مجھے پتا نہیں۔''

''کیا خیال ہے، تم یہاں آ جا سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! — میں مہینے بھر تو یہاں ٹھیر ہی سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں ایک ماہ قیام کرنے کا موقع نکال لوں گا۔'' وہ جھجکا، پھر اس نے جسارت کر کے جولیٹ پر شرمیلی، دزدیدہ نظر ڈالی اور دوبارہ منھ موڑ لیا۔

وہ نیچے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی چست چھاتیاں ایک آہ کے ساتھ ابھریں، جیسے بے صبری کا ایک جھونکا آ کر انھیں ہلا گیا۔ اس نے رک رک کر کہا، ''میں واپس نہیں جا سکتی۔ میں یہ دھوپ چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ گر تم یہاں نہیں آ سکتے ''

اس نے واضح انداز میں بات ختم کی۔ ماریس، بڑھتے ہوئے اچرج اور کم ہوتی ہوئی الجھن سے، جولیٹ پر، بار بار، دزدیدہ نظریں ڈالتا رہا۔

''نہیں!'' وہ بولا، ''یہ چیز تمھیں راس ہے۔ تم بہت خوبرو ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم واپس جا سکتی ہو۔'' وہ سوچ رہا تھا کہ نیو یارک کے فلیٹ میں جولیٹ کی خاموشی اور زرد روئی اسے کس بری طرح مضمحل کرتی تھی۔ وہ اپنے انسانی تعلقات میں نرم دل تر سنا کی کا نمونہ تھا اور بچہ ہونے کے بعد جولیٹ کے خاموش، ڈراؤنے پیرے سے بہت بری طرح خوف زدہ ہوا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس میں

جولیٹ کا قصد شامل نہ تھا۔ عورتیں ہوتی ہی ایسی تھیں۔ ان کے جذبات، خود ان ہی کی ذات کے خلاف بھی، الٹی نہج اختیار کر لیتے تھے، جو بے حد بھیانک بات تھی، بے حد! گھر میں کسی ایسی عورت کے ساتھ گزر کرنا جس کے جذبات الٹ کر خود اس کے خلاف ہو گئے ہوں، کتنا ڈراؤنا تھا! اس کی مجبور عداوت کے بھاری پاٹ کے "نیچے" کہ اس نے خود کو پچا محسوس کیا تھا۔ جولیٹ نے خود اپنی اور ساتھ میں بچے کی جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ نہیں، یہ نہیں، اور چاہے کچھ ہو جائے۔

"لیکن تم کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں؟ اوہ، میں! میں کاروبار کرتا رہوں گا اور چھٹیوں میں یہاں آیا جایا کروں گا۔ جب تک تم یہاں ٹھہرنا چاہو۔ تم یہاں جب تک دل چاہے رہو۔" وہ بہت دیر تک زمین کو تکتا رہا، پھر گھبرائی گھبرائی آنکھوں میں التجا کی جھلک کے ساتھ جولیٹ کی طرف دیکھا۔

"ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھی؟"

"بھئی۔ ار—ہاں، اگر چاہو۔ بہت طویل مدت ہے ہمیشہ۔ تاریخ کون مقرر کر سکتا ہے۔"

"اور میں جو چاہے کروں؟" جولیٹ نے اس سے نظر ملا کر چنوتی دی اور اس کی گلابی، ہوا کی کرائی ہوئی برہنگی کے سامنے وہ بے بس تھا۔

"ار—ہاں!—میرے خیال میں ہاں—جب تک تم اپنا یا بچے کا دل نہ دکھاؤ۔"

اس نے دوبارہ جولیٹ کی طرف پیچیدہ اور بے چین التجا سے دیکھا۔ وہ سوچ تو بچے کے بارے میں رہا تھا لیکن امید اپنے لیے باندھ رکھی تھی۔

"میں نہیں دکھاؤں گی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں!" وہ بولا، "نہیں! میں نہیں سمجھتا کہ تم دکھاؤ گی۔"

خاموشی کا وقفہ آیا۔ گاؤں کی گھنٹیاں جلدی جلدی دوپہر کی نوبت بجا رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کھانے کا وقت آ گیا۔

جولیٹ نے بھوری کریپ کا جاپانی حبہ پہنا اور کمر پر چوڑا ہرا پٹکا باندھ لیا۔ پھر اس نے بچے کو ایک چھوٹی نیلی قمیض پہنا دی اور وہ گھر چلے گئے۔

کھانے کی میز پر وہ اپنے شوہر، اس کے بے رونق شہری چہرے، جمے ہوئے کالے سرمئی

بادلوں، بہت باقاعدہ آداب تناول اور کھانے پینے میں انتہائی اعتدال پسندی کو بھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ بھی، کالی پلکوں کے نیچے سے، اس کی طرف چوری چوری دیکھ لیتا۔ اس کی سہری بھوری آنکھیں ایسے جانور کی معلوم ہوتی تھیں جو چھوٹی عمر میں پکڑے جانے کے بعد گرفتاری میں پروان چڑھ کر بڑا ہوا ہو۔

وہ کافی پینے کے لیے شہ نشین پر جا بیٹھے۔ نیچے دور، چھوٹی عمودی گھاٹی کے اس پار، اگلے کھیت میں ایک کسان اور اس کی بیوی، گیہوں کے ہرے پودوں کے پاس، بادام کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے، زمین پر بچھونا، اجلا کپڑا بچھائے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ایک بہت بڑا روٹ رکھا تھا اور گلاسوں میں کالی کالی شراب تھی۔

جولیٹ نے شوہر کو اس طرح بٹھایا کہ اس منظر کی طرف اس کی پیٹھ ہوگئی۔ وہ خود اس کے سامنے بیٹھی، کیونکہ ان کے شہ نشین پر آتے ہی کسان نے نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔

5

وہ اسے اس دوران میں، بھولی بیٹھی تھی۔ وہ ذرا موٹا، بہت چوڑا چکلا، تقریباً چالیس سال کا آدمی تھا اور روانی سے ... بڑے تھے بیمار رہا تھا۔ اس کی سانولی، روکھے چہرے والی بیوی دبلی سی اور ملول تھی۔ ان کے بچے نہیں تھے۔ جولیٹ کو اتنا معلوم تھا۔

وہ سامنے کے کھیت میں آٹھ دس ہفتے تک کام کیا کرتا تھا۔ اس کی پوشاک ... سفید پتلون اور رنگدار قمیص اور ایک پرانا پنامائی ٹوپ۔ ہمیشہ بہت صاف ستھری اور نگہداشت ہوئی تھی۔ اس میں اور اس کی بیوی میں خاموش وقعت کی وہ شان تھی جو کسی طبقے سے تعلق نہیں رکھتی، افراد کا خاصہ ہوتی ہے۔

اس کی دلکشی اس کی جسمانی اس مخصوص تیز توانائی میں تھی، باوجود اس کے کہ وہ چوڑا اور بھاری تھا، اس کی حرکات میں لطف پیدا کرتی تھی، پنہاں تھی۔ شروع کے دنوں میں، جب کہ دھوپ کہانی شروع ہوئی تھی، وہ بیٹھ ... چڑھا کر دوسرے کھیت میں پہنچ جانے کے بعد پیٹوں میں اچانک اس سے دوچار ہوگئی۔ جولیٹ نے تو بعد میں دیکھا، اسے جولیٹ کے آنے کی پہلے ہی سے خبر ہوگئی ... اور جب جولیٹ سے اوپر پہنچی تو اس نے اپنا ٹوپ اتار دیا اور ...

آنکھوں [illegible] ساتھ دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور دھوپ سے سنولایا ہوا تھا۔ [illegible] چھوٹی چھوٹی بھوری مونچھیں تھیں اور قریب قریب آتی ہی چھوٹی بھوری بھنویں تھیں جو اس کی کوتاہ، بھکی پیشانی کے نیچے مل گئی تھیں۔

"اوہ!" وہ بولی۔ "کیا میں یہاں ٹہل سکتی ہوں؟"

[illegible]

[illegible] لیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] وہ اس کی کمی محسوس کرتی۔

[illegible]

میں سوئی اور چپ چاپ جدھر سے آئی تھی اُدھر ہی چل دی۔ اور خفیف سی زردگی کے ساتھ اس خاموشی پر تعجب کرتی رہی جس سے وہ جھاڑی اور جنگلوں میں کام کر سکتا تھا۔ وحشی جانوروں کی سی صلاحیت اس میں تھی۔

جب ان دونوں کے جسموں میں آگاہی کی واضح جھلک تھی، تو دونوں میں سے کوئی اس کا اعتراف کرنے پر راضی نہ تھا اور نہ ان دونوں نے اقرار کرنے کا کوئی اشارہ دیا۔ لیکن کسان کی بیوی بھی [illegible] طور پر آگاہ تھی۔

اور جولیٹ نے سوچا تھا میں کیوں نہ [illegible] کے لیے اس مرد سے ملوں اور اس کا بچہ جنوں؟ [illegible] تک اپنی اور اس مرد کی زندگی [illegible] ہمیں کیوں نہ اس سے [illegible] جب تک خواہش باقی رہے اور [illegible] ہمارے درمیان چنگاری تو روشن ہو چکی تھی۔

لیکن جولیٹ نے کبھی کوئی اشارہ نہ کیا تھا۔ اور اب [illegible] وہاں سے، جہاں وہ سفید کپڑے [illegible] بیوی کے سامنے [illegible] بیوی نے بھی مڑ کر دیکھا۔

اور جولیٹ نے [illegible] محسوس [illegible] اپنے شوہر کی آنکھوں میں [illegible] تم بھی [illegible] دھوپ میں [illegible]؟ تو [illegible] نے جواب دیا [illegible] میں یہاں [illegible] پسند کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں [illegible] کی ہے۔

[illegible] آنکھوں میں ایک جھلک تھی، اس کی خواہش کے حوصلے کی ایک [illegible] قسم [illegible] چھپی ہوئی تھیں۔ اپنے طور پر وہ بھی [illegible] جرأت بالکل زائل نہ ہوئی تھی۔ وہ دھوپ میں [illegible] کی جرأت کرے گا۔

[illegible] اور وہ خاص [illegible] تھی۔ اس پر [illegible] تھی [illegible] افضلیت کی مہر تھی۔

اب جب کہ تیز دھوپ سے تمام سونی کالی اور جھڑے گلاب جیسے دل نے ساتھ اس نے چاہا تھا کہ گرم رتیلے کسان کے پاس جائے اور اس کا بچہ جنے۔ اس کے جذبات پنکھڑیوں کی طرح منتشر ہو گئے تھے۔ اس نے دھوپ سے سوالات چہرے میں لہو کی چمک اور جنوب کی نیلی آنکھوں میں لو دیکھی تھی اور اس کے جواب میں اس کے تن بدن میں آگ کی ایک بھبک اٹھی تھی۔ وہ اس کے لیے ایک تولیدی آتش کی مسلسل ثبات ہوتا [illegible] سے خوش تھی۔

[illegible] کا [illegible] اس کا سبب بنے گا۔

** **

ڈی ایچ لارنس

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمن

پادری کی بیٹیاں

1

مسٹر لنڈلی ایلڈ کروس کا سب سے پہلا وکر تھا۔ آباد ہونے کے بعد سے اس چھوٹے سے گاؤں کے گھروندوں پر امن کی فضا چھائی ہوئی تھی اور ہر اتوار کی روشن صبح کو وہ پتلی گلیوں، کھیتوں کھیتوں ہوتے ہوئے گریمیڈ کے بڑے گرجا جایا کرتے تھے جو وہاں سے دو تین میل دور تھا۔ لیکن جب وہاں کوئلے کی کانیں کھد گئیں، شاہراہوں کے کنارے مکانوں کی کوری قطاریں نظر آنے لگیں اور ایک نئی آبادی، جو مزدور پیشہ سیلانی لوگوں کے سب سے گھٹیا طبقے پر مشتمل تھی، اس جگہ بسا دی گئی تو دیہاتیوں اور ان کے گھروندوں کا نام و نشان تقریباً مٹ گیا۔

نئے کان کن باشندوں کی سہولت کے لیے ایلڈ کروس میں گرجا بننا اب ضروری ہو گیا تھا۔ روپیہ زیادہ نہ تھا۔ چنانچہ شاہراہ کے گڑھے کی آبادی سے جتنی دور ممکن تھا، جھونپڑوں اور سیب کے درختوں کے نزدیک کھیتوں میں بنی ہوئی گرجا کی پست عمارت ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے اینٹ اور پتھر کا بنا ہوا چوہا اور مغربی گوشوں کی برجیاں اس کے کان تھے۔ عمارت سے تذبذب اور [illegible] ٹپکتی تھی۔ اس لیے اس کے سمٹے ہوئے ننگے پن کو چھپانے کے لیے انھوں نے وہاں بڑے پتوں والی عشق پیچاں کی بیلیں لگا دی تھیں۔ چنانچہ اب وہ چھوٹا سا گرجا، کھیتوں میں سب سے الگ تھلگ اور خوابیدہ، سرسبزی سے ڈھکا ہوا کھڑا ہے اور اینٹوں کے مکان اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں گویا اسے پامال کر ڈالیں گے۔ وہ ابھی سے متروک ہو گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اس گرجے کا پادری بنا ستائیس سالہ ریورنڈ ارنسٹ لنڈلی، جس نے نئی تعمیری
کی تھی۔ شروع سے نائب پادری کا عہدہ چھوڑ کر آیا۔ وہ ایک معمولی جوان آدمی تھا۔ کیمبرج میں تعلیم
پائی تھی اور پادری بن گیا تھا۔ اس کی نوجوان اور پر اعتماد بیوی کیمبرج شائر کے ایک رینٹر کی لڑکی تھی۔
اس کے باپ نے ایک ہزار پونڈ کی سالانہ تنخواہ خرچ کر دی تھی، اس لیے مسز لنڈلی کے حصے میں کچھ
نہیں آیا تھا۔ اس طرح یہ نوجوان میاں بیوی آئے۔ ایک سو بیس پاؤنڈ سالانہ سرکاری وظیفے پر
اپنے اوقات بسر کرنے اور اپنی بلند حیثیت برقرار رکھنے کے لیے ایلڈرکراس میں وارد ہوئے۔

یہاں کے کان کن سب کے سب ... کان کنوں کے ساتھ بڑی سرد مہری سے پیش آئے۔ دیہاتیوں میں
رہتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو مسلمہ طور پر اعلیٰ یا متوسط طبقے کا فرد سمجھنے لگا تھا۔ پہلے سے
زمیندار خاندانوں کے سامنے اسے انکساری سے کام لینا پڑتا تھا، لیکن پھر بھی اس کا شمار تو انھیں کے
زمرے میں ہوتا تھا اور عام لوگ تو کچھ سے گئے گزرے تھے۔ اسے اپنی حیثیت کے متعلق کسی طرح کا شک نہ تھا۔
بہر حال اسے معلوم ہو گیا کہ کان کنوں کی آبادی کو یہ ترتیب قبول کرنے سے انکار تھا۔ ان کی
زندگی میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اور انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے یہ بات اس کے منھ پر کہہ دی۔
عورتوں نے صرف اتنا کہا، ”ہم تو خالی نہیں“ یا ”تم یہاں بیکار آتے ہو، ہم تمھارے گرجے کو مانتے ہی
نہیں۔“ مرد بڑی بے تکلفی سے اس کو حقیر سمجھتے تھے اور ان کی غضبناک حقارت کے سامنے وہ لاچار رہا۔
جب تک وہ ان کے معاملوں میں دخل دینے کی کوشش نہ کرتا تھا، وہ بظاہر خوش مزاجی سے پیش آتے
تھے۔

پہلے اس کو غصہ آیا۔ پھر اس غصے کی جگہ خاموش آزردگی نے لے لی اور آخر میں نوبت یہاں
تک پہنچی، اگرچہ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کا اظہار کر سکتا، کہ اسے اپنے حلقے کے بیشتر لوگوں سے
شعوری اور اپنی ذات سے لاشعوری نفرت ہوئی اور اس نے اپنے دائرہ عمل کو چند کاٹیجوں تک محدود
کر کے حالات کے سامنے سر جھکا دیا۔ اس کے کردار میں کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ عوام میں اس کی
حیثیت کا دار و مدار ہمیشہ اعلیٰ طبقے کے ایک فرد کے ناطے سے رہا تھا۔ اب وہ اس قدر غریب تھا کہ ضلع
کے عام اور چھوٹے دکاندار بھی اس کی عزت نہ کرتے تھے اور اس کی فطرت ایسی نہ تھی اور نہ اسے
خواہش تھی کہ وہ اپنی رفاقت ان کے لیے خوشگوار بنا سکتا، اور نہ اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ اپنی حیثیت

Scanned with CamScanner

جہاں منوانا پسند کرتا وہاں زبردستی جگہ بنا لیتا۔ زرد رو، محزون اور بے تعلق، دن پورے کرتا رہا۔

شروع شروع میں اس کی بیوی بڑی جھڑی۔ اس نے بننے کی کوشش کی اور دل کھول کر خرچ کرنے لگی۔ لیکن آمدنی محدود تھی، دوکانداروں کا حساب چکانے کا جھگڑا اتنا قابل رحم تھا کہ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں اسے ہر طرف سے ظالمانہ تضحیک کا سامنا کرنا پڑا۔

تمکنت کا خون ہو جانے کے بعد اس نے خود کو اس سنگدل اور بے پروا بستی میں بے دخل سا پایا۔ گھر میں ہو یا باہر، اسے ہر وقت غصہ آتا رہتا، لیکن اسے جلد ہی پتا چل گیا کہ بار بار غصہ کرنا بہت مہنگا سودا ہے اور اس کے بعد اس کی خفگی گھر کی چاردیواری تک محدود رہ گئی۔ وہاں اس کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ اس کو اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے شوہر سے نفرت ہو گئی ہے اور یہ کہ اگر اس نے احتیاط سے کام نہ لیا تو وہ اپنے رہنے سہنے کے معمول کو درہم برہم کر دے گی، خود بھی تباہ ہو گی، اپنے شوہر کو بھی تباہ کرے گی۔ اس ڈر کے مارے اس نے مسکینی اختیار کر لی۔ خوف سے ناکام ہو کر، شکست کھا کر، اس نے خود کو اپنے اندھیرے اور افسردہ مکان میں چھپا لیا، جو دنیا میں اس کا واحد مامن تھا۔

ہر سال بچے پیدا ہوتے رہے اور وہ تقریباً مشین کی طرح اپنا مادرانہ فرض پورا کرتی رہی، جو اس پر زبردستی عائد کر دیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ، اپنے شدید غصے، فلاکت اور تنفر کو ضبط کرنے کی وجہ سے صحت سے ہاتھ دھو کر، معذوری کے عالم میں صاحب فراش ہو گئی۔

بچے بڑے ہو گئے۔ وہ تندرست تھے، لیکن سرد مہر اور اکھڑے سے تھے۔ ان کے والدین نے انھیں گھر پر تعلیم دی تھی اور انھیں بہت زیادہ مغرور اور شائستہ بنا کر، ظالمانہ اور قطعی طور پر گرد و پیش کے رذیلوں سے بالکل جدا طبقۂ اعلیٰ میں شامل کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ دیکھنے میں وہ خوشرو تھے، اور ان کی شکل صورت سے وہ عجیب ستھری اور نیم شفاف نمایاں تھی جو تنہا رہنے والے شرفا کا خاصا ہے۔

بتدریج لنڈلی اور اس کی بیوی زندگی کے لطف سے بالکل محروم ہو گئے۔ ان کی گھڑیاں، دن اور سال محض کل کل کر کے گزر اوقات کرنے اور بچوں کو سختی سے دبا کر رکھنے اور تراش خراش کر شریف بنانے، انھیں جاہ اور مرتبے کے حصول کے لیے اکسانے اور فرائض سے گراں بار کرنے میں بسر

Scanned with CamScanner

رہتے تھے۔ اتوار کی صبح دوسرے گھر والے، ماں کو چھوڑ کر، گلی میں سے گزر کر گرجا جایا کرتے۔ لمبی ٹانگوں والی لڑکیاں، اونچی اور تنگ فراکیں پہنے، لڑکے کالے کوٹوں اور لمبی بھوری پتلونوں میں ملبوس، جو ان پر ٹھیک نہیں آتی تھیں۔ اپنے والد کے گرجا آنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت ان کے چہرے سپاٹ اور صامت ہوتے۔ اطفالانہ لب غرور کے مارے، جوان کے لیے تحریر سے کم نہ تھا، بند اور معصومانہ آنکھیں پہلے ہی سے خالی خالی سی۔ میری، جو ان سب میں بڑی تھی، ان کے آگے ہوتی۔ وہ چھریرے بدن کی لمبی لڑکی تھی۔ اس کا ناک نقشہ عمدہ تھا اور اس کے مغرور اور پاکیزہ انداز سے ایک ارفع مقدر کے سامنے تسلیم و رضا کا اظہار ہوتا تھا۔ دوسری لڑکی، لوئیزا، چھوٹی اور گداز جسم کی تھی اور جسے میں شگفتگی معدوم ہوتی تھی۔ اس میں ضد زیادہ اور صبر انھیں کم تھے۔ وہ چھوٹے بچوں کی خبر رکھتی تھی، میری سب سے بڑے بچے تھے۔ کان کنوں کے بچے پادری کے گھرانے کے اس زرد رو اور مختصر جلوس کو چپ چاپ گزرتے دیکھ کر، ان کی سردوری اور نجابت کے انداز سے مرعوب ہو جاتے، چھوٹے بچوں کی پتلونوں کا مذاق اڑاتے، اپنے آپ کو احساس کمتری میں مبتلا پاتے اور نفرت ان کے دلوں کو گرما دیتی۔

بڑی ہو کر میری کو تجارت پیشہ گھرانوں کی کچھ بچیوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ گھر بار لوئیزا کے سپرد تھا اور وہ اپنے والد کے گرجا آنے والوں کے گھروں پر جا کر کان کنوں کی لڑکیوں کو پیانو نوازی کے سبق دیتی تھی۔ چھبیس سبقوں کے تیرہ شلنگ ملتے تھے۔

2

میری کوئی بیس برس کی ہو گئی تھی جب کا ذکر ہے کہ جاڑوں میں ایک صبح کو دبلے پتلے، منکسر مسٹر لنڈلی، سیاہ اوورکوٹ اور نمدے کا ہیٹ پہنے، سفید کاغذوں کا پلندا بغل میں دبائے، ایلڈر کروس گئے۔ وہ گرجا کی جنتری بانٹ رہے تھے۔

جب تک کان کی طرف، جو پٹڑی کے نزدیک ہی بڑے زور شور سے کھڑکھڑا رہی تھی، جانے والی گاڑی ادھر سے گزرتی ہوئی چونگی سے گزرتی رہی وہ ادھیڑ، پیلا سا، بے تعلق آدمی وہاں کھڑا رہا۔ پھر ایک چھوٹی سی ٹانگوں والا آدمی لنگڑاتا ہوا ریل کا پھاٹک کھولنے آیا اور لنڈلی آگے بڑھ گیا۔ اس کے

بائیں ہاتھ کے بالکل پاس ہی، سڑک اور ریل کی پٹڑی کے نیچے، سیب کے درختوں کی خالی ٹہنیوں میں سے ایک گھر کی لال چھت نظر آ رہی تھی۔ سنڈلی نے نیچی دیوار کا چکر لگایا اور پھر سڑک سے گھر کی طرف جانے والی گھسی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگا۔ آنے والی گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور کوئلہ لے جانے والے چھکڑوں سے چھپا چھپا، دبکا ہوا تھا۔ برف ریزے کے پھول، بھینچی ہوئی کلیوں کے ساتھ، دا کھ کی بے برگ و بار جھاڑیوں کے نیچے بالکل ساکت لٹکے ہوئے تھے۔

لنڈلی دستک دینے ہی والا تھا کہ پیچھے سے جھناکے کی آواز آئی۔ مڑ کر جو دیکھا تو کالے چھپر کے کھلے دروازے میں، سیاہ فیتے کی ٹوپی اوڑھے، ادھیڑ عمر کی عورت نظر پڑی، جو لال سے رنگ کے بڑے بڑے کنستروں کے درمیان جھکی ہوئی ایک بڑے پیپے میں کوئی بہت ہی چپکیلی چیز انڈیل رہی تھی۔ پارافین کی بو آئی۔ عورت نے کنستر کو نیچے اور پیپے کو اٹھا کر تختے پر رکھ دیا۔ پھر ایک ٹین کی بوتل لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھیں لنڈلی سے چار ہوئیں۔ وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی ''اوہ، لنٹی صاحب ہیں۔ اندر چلے جاؤ۔''

وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ گرم باورچی خانے میں ادھیڑ عمر کا ایک بھاری بھرکم آدمی، جس کی بڑی ساری بھوری داڑھی تھی، بیٹھا نسوار لے رہا تھا۔ اس نے گہری، غیر واضح آواز میں بڑبڑا کر پادری سے بیٹھنے کو کہا اور اس کے بعد اسے بالکل نظر انداز کر کے کھوئی کھوئی نظروں سے آگ کو دیکھتا رہا۔ لنڈلی انتظار کرتا رہا۔

عورت اندر آئی۔ اس کے کالے فیتے کی ٹوپی یا بونیٹ کے ربن اس کی شال پر پڑے تھے۔ اس کا قد درمیانہ تھا اور اس کی ہر چیز صاف ستھری تھی۔ وہ پارافین کا ٹین لیے ایک چبوتری پر چڑھ کر باورچی خانے سے باہر گئی۔ چبوتری کے اوپر والے کمرے میں داخل ہونے والے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کمرہ چھوٹا سا بساط خانہ تھا۔ دیواری الماریوں کے خانوں میں پارسل دھرے تھے اور کھلی جگہ میں ایک پرانی وضع کی سینے کی بڑی مشین رکھی تھی، اور اس کے ارد گرد سینے کا سامان پڑا تھا۔ عورت نے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر آنے والی بچی کو پارافین کا ٹین دے کر ایک جگ لے لیا۔ ''میری ماں کہتی ہے، اسے حساب میں لکھ لینا۔'' بچی یہ کہہ کر چلی گئی۔ عورت نے کھاتے میں درج کیا اور پھر جگ لیے ہوئے باورچی خانے میں آ گئی۔ اس کے شوہر نے، جو بہت تنومند آدمی تھا، اٹھ کر آگ میں، جو پہلے

ہی سے خوب جل رہی تھی، اور کوکے لا کر ڈال دیے۔ لیکن اس کی حرکات بہت آہستہ اور سست تھیں۔ وہ ابھی سے بے جان ہو چکا تھا۔ درزی ہونے کی وجہ سے اس کا بھاری تن و توش اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ جوانی کے دنوں میں بڑا عمدہ رقاص اور سکاز تھا، پر اب کم گو اور کاہل ہو گیا تھا۔ پادری کو خود کچھ نہیں کہنا تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ وہ کچھ گپ شپ کرے۔ جون ڈیورنٹ نے اس کو توجہ ہی نہ دی اور چپ اور افسردہ رہا۔

مسز ڈیورنٹ نے میز پوش بچھا دیا۔ اس کے شوہر نے گلاس میں بیئر انڈیلی اور پینے لگا، ساتھ ہی پائپ بھی پی رہا تھا۔ "کچھ پیو گے تم؟" اس نے پادری سے لے کر جگ تک آہستگی سے نظر ڈالتے ہوئے، داڑھی میں سے غور کر پوچھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال آ سکا۔

اگرچہ وہ تھوڑی بیئر پینی پسند کرتا تھا لنڈلی نے جواب دیا، "نہیں، شکریہ۔" شرابیوں کی آبادی میں مثال جو قائم کرنی تھی۔ مسز ڈیورنٹ نے کہا، "کام چلانے کو ہمیں ایک دو گھونٹ پینے ہی پڑتے ہیں۔"

اس کا انداز کچھ شکایت آمیز سا تھا۔ جتنی دیر وہ میز پر ساڑھے نو بجے کا کھانا چنتی رہی، پادری بے آرامی سے بیٹھا رہا۔ اس کے میاں نے کرسی بڑھا کر کھانا شروع کر دیا۔ وہ خود آگ کے نزدیک چھوٹی، گول آرام کرسی پر بیٹھی رہی۔

وہ ایسی عورت تھی جو آرام کی زندگی گزارنی پسند کرتی، لیکن اس کے مقدر میں اجڈ اور ہنگامہ خیز خاندان اور کاہل شوہر تھا، جو سوائے اپنی کچھ پروا کرتا تھا نہ کسی اور کی۔ چنانچہ اس کے بھلے سے چوڑے چہرے پر چڑچڑاپن تھا اور اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ تمام عمر اپنی مرضی کے خلاف کام کاج کرنے اور ایسی جگہ حکم چلانے پر، جہاں وہ حکم چلانا چاہتی تھی، مجبور رہی ہے۔ اس میں ایسی عورت کا، جس نے بیٹوں کو پالا اور ان پر حکومت کی ہو، خود سر ضبط اور اعتماد بھی تھا۔ لیکن اپنے بیٹوں پر بھی اس نے خاموشی سے حکمرانی کی تھی۔ اس کو اپنا چھوٹا بساط خانہ چلانے، کرائے کے جھگڑے پر توجہ جمانے اور بڑے بڑے مال خانوں میں گھوم پھر کر سامان خریدنے میں مزہ آتا تھا۔ لیکن بیٹوں کو سنبھالنے کی جھک جھک اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ صرف اپنے چھوٹے بیٹے سے پیار کرتی تھی، کیونکہ وہ اس کا آخری تھا اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے بعد سے وہ آزاد تھی۔

Scanned with CamScanner

یہ ان گھروں میں سے ایک تھا جن میں پادری کبھی کبھار جایا کرتا تھا۔ مسز ڈیورینٹ نے، اپنے اصول کے ماتحت، اپنے سب بیٹوں کو گرجا میں پڑھایا تھا۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ مذہبی خیال کی تھی، بلکہ اس نے یہی ہوتا دیکھا تھا۔ ڈیورینٹ کو مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ایک مجتسس حظ کے ساتھ حوشیے اندار ی انجیل ''حیات جون ویزلی'' پڑھا کرتا تھا۔ اس سے اسے وہی آسودگی حاصل ہوتی تھی جو آگ کی گرمی یا برانڈی کے جام سے، لیکن، درحقیقت، وہ جون ویزلی کی جون ملٹن سے، جس کا اس نے نام بھی نہیں سنا تھا، زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔

مسز ڈیورینٹ نے اپنی کرسی میز کے قریب کر لی اور آہ بھر کر کہا: ''کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔''

''کیوں... طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پادری نے مربیانہ پوچھا۔

''یہ بات نہیں۔'' اس نے آہ بھری۔ اس کے ہونٹ بند اور سیدھے تھے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا کیا بنے گا۔''

لیکن پادری کو اپنا سر چھوڑتے ہوئے اتنی مدت ہو چکی تھی کہ آسانی سے ہمدردی کا اظہار کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

''کیا کوئی مشکل آ پڑی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، مجھ پر کیا کوئی مشکل آ پڑی!'' اچیز عورت نے زور سے کہا: ''میں محتاج خانے میں جا کر مروں گی۔''

پادری پر کچھ اثر نہ ہوا، وہ منتظر رہا۔ اس چھوٹے سے، نعمتوں میں بھرے گھر میں رہ کر اس عورت و فلاس کا کیا پتا ہو سکتا ہے! ''خدا نہ کرے،'' وہ بولا۔

''اور جس لڑکے کو میں اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی،'' اس نے رو کر کہا۔

پادری بالکل بے تعلقی سے، ہمدردی محسوس کیے بغیر منتظر رہا۔

''جو اس بڑھاپے میں میرا سہارا ہوتا ہمارا کیا بنے گا؟'' اس نے کہا۔

پادری نے افلاس کے ماتم پر تو بے طور پر یقین نہ کیا، لیکن حیران ہوا کہ لڑکے کے ساتھ کیا پیش آ گیا۔

''الفریڈ کے ساتھ کوئی بات ہو گئی کیا؟'' اس نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"ہمیں خبر ملی ہے کہ وہ بحری فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔" وہ رو دے بولی۔

"بحری فوج میں چلا گیا" لنڈلی بول اٹھا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس سے اچھی بات وہ مشکل سے کر سکتا تھا۔ اپنی ملکہ اور ملک کی سمندر پر خدمت کرتا۔"

"اس کی خدمت کی ضرورت مجھے ہے۔" وہ تیز ہو کر بولی۔ "اور میں اسے یہاں گھر پہ چاہتی تھی۔" الفرڈ اس کا آخری لڑکا تھا، جسے ناز برداری کر کے بگاڑنے کے عیش کی اجازت اس نے خود کو دی تھی۔

لنڈلی نے کہا: "تم اس کی کمی محسوس کرو گی، یہ تو یقینی بات ہے۔ لیکن، اس کے برخلاف، یہ کوئی ایسا اقدام نہیں جو پشیمانی کا باعث ہو۔"

"مسٹر لنڈلی، آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں چاہتی ہوں میرا لونڈا دوسروں کے اشاروں پر بندروں کی طرح رسوں پر چڑھتا پھرے۔" اس نے چڑ کر جواب دیا۔

"بحری فوجی ہونے میں یقیناً کوئی بے عزتی نہیں۔"

"بے عزتی کی ایسی تیسی۔" ناراض بڑھیا نے چیخ کر کہا، "جا کے غلامی کی نوکری کر لی، اور پچھتائے گا، دیکھ لینا۔"

اس کی طیش آلودہ، تحقیر آمیز بے صبری نے پادری کو چونکا کر تھوڑی دیر کے لیے چپ کرا دیا۔ جب اس نے الٹ کر جواب دیا تو وہ ٹھیک طرح دے بھی نہ سکا اور اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک کی فوج میں بھرتی ہونا، کان میں کام کرنے سے زیادہ غلامی کس طرح ہو گیا۔"

"گھر کی بات اور ہے۔ گھر پہ وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ مجھے پتا ہے یہ فرق اسے نظر آ جائے گا۔"

"شاید اسی سے وہ سنور جائے۔" پادری نے کہا۔ "اس طرح وہ بری صحبت اور شراب کی لت میں پڑنے سے بچ جائے گا۔"

ڈیورینٹ کے چند بیٹے شراب کے دھتی تھے اور الفرڈ بھی کچھ بگڑا ہوا تھا۔

ماں بول اٹھی، "تو وہ کیوں نہ پیے شراب؟ کسی کی جیب کاٹ کے تو نہیں پیتا!"

پادری تن گیا۔ وہ سمجھ کہ یہ اشارہ اس کے اپنے پیشے اور چڑھے ہوئے قرضے کی طرف تھا۔

Scanned with CamScanner

کہنے لگا: "ان تمام باتوں کے باوجود مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ وہ بحریہ میں بھرتی ہو گیا ہے۔"

"جبکہ میں ہو چلی ہوں بوڑھی اور اس کا باپ تھوڑا کام کرتا ہے، مہربانی فرما کر کسی اور بات پر خوش ہوئیے، مسٹر لنڈلی۔"

وہ رونے لگی۔ اس کے شوہر نے، بالکل بے حسی سے، گوشت کا شوربہ ختم کیا اور تھوڑی بیئر پی، پھر آگ کی طرف رخ کر لیا، گویا کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔

پادری نے ہٹ دھرمی کے ساتھ کہا، "مسز ڈیورینٹ، میں ان سب کی عزت کروں گا جو سمندر پر، خدا اور اپنے ملک کے کام آتے ہیں۔"

"جب ذلیل کام کرنے والے اچھے بیٹے نہ ہوں تو یہ سب بالکل درست ہے، ورنہ فرق پڑ جاتا ہے۔" اس نے چڑ کر جواب دیا۔

"مجھے تو فخر ہو اگر میرے لڑکوں میں سے کوئی بحری فوج میں چلا جائے۔"

"ہاں... خیر... ہم سب کوئی ایک سے تو نہیں ہیں۔"

پادری اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بڑا سا تہہ شدہ کاغذ میز پر رکھ دیا اور کہا، "میں جنتری لے آیا ہوں۔"

مسز ڈیورینٹ نے اسے کھولا اور تلخی سے کہا، "چند دنوں میں تھوڑا بہت کم ہو تو مجھے پتا چلتا ہے۔"

پادری نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ارغنون فنڈ کا چندہ اس لفافے میں ڈال رکھا ہے۔" بیوی نے کہا۔ اس نے وہ لفافہ کارنس پر سے اٹھا کر کان میں لگایا اور اسے پکڑاتی ہوئی کہنے لگی، "اور مجھ میں اتنی ہی استطاعت ہے۔"

اس لفافے کو جیب میں ڈال کر، جس میں اس کی خدمات کا معاوضہ تھا، لنڈلی رخصت ہوا۔

وہ گھر گھر جنتری بانٹنے کے لیے ہر دروازے پر جاتا رہا، جیسا کہ اس کا معمول تھا، ان لوگوں کے ساتھ، جن سے اس کی واقفیت واجبی تھی، بار بار صاحب سلامت کرنے کی کوشش سے تھک کر اس

نے خوامخواہ [illegible] آخر کار وہ گھر واپس پہنچی۔

کھانے کے کمرے میں [illegible] روشن تھی۔ مسز [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔ صوفے پر لیٹی تھی۔ پادری نے [illegible] گوشت چھری سے کاٹا۔ [illegible] اور [illegible] تھیں [illegible] خوشنما اور بھوری تھیں [illegible] معلوم ہوتی تھی۔

[illegible]

طرح شراب کا دھتی بننے سے تو بچ جائے گا۔"

[illegible]

[illegible] باعث ہے۔"

[illegible] گی۔ کیا عمر ہے اس کی، ماں؟"

"نہیں" [illegible] نے بتایا

''نہیں'' پادری نے دہرایا۔ ''اس سے اسے مفید تعلیم حاصل ہوگی اور فرض اور عزت کا کسی نہ کسی طرح کا معیار سامنے رہے گا۔ اس سے بہتر اس کے لیے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن''

''مگر جاڑے میں گانے دنوں میں اس کی کمی ہمیں محسوس ہوگی،'' لوئیزا نے ایسے کہا جیسے والدین کی مخالفت کر رہی ہو۔

''کچھ بھی ہو،'' پادری نے کہا، ''یہاں رہ کر بری عادتوں میں پڑنے کا خطرہ مول لینے سے میں اسے بحریہ میں محفوظ دیکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔''

تب لوئیزا نے سوال کیا، ''کیا اسے بری عادتیں پڑ گئی تھیں؟''

''تمہیں پتا تو ہے، لوئیزا، کہ وہ اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا،'' میری نے نرمی اور روانی کے ساتھ کہا۔ لوئیزا نے اپنا چھوٹا سا منہ خفا ہو کر بند کر لیا۔ وہ اس سے انکار کرنا چاہتی تھی، پر جانتی تھی کہ بات سچ ہے۔

اس نے سوچا وہ ایک جنس تھی گرم لڑکا تھا، جس کو دیکھ کر زندہ دلی اور بے حد خوشگواری کا احساس ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ خود کو گرم محسوس کرتی تھی۔ چونکہ وہ چلا گیا تھا اس لیے معلوم ہوتا تھا کہ آنے والے دن اب اور بھی ٹھنڈے ہوں گے۔

اس کی ماں نے دہرا کر کہا، ''اس سے بہتر وہ نہیں کر سکتا تھا۔''

''میرا بھی خیال ہے،'' پادری نے کہا، ''لیکن مجھے اس کا شبہ ہے'' پر اس کی ماں تقریباً جذباتی ہو گئی۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''اسے بچے کیوں بھاتے ہیں جب کہ وہ بیکار ہے؟'' بیوی نے کہا، ''بس اس کی تنخواہ سے مطلب ہے۔''

''میرا خیال ہے وہ چاہتی تھی کہ الفریڈ گھر پر اس کے پاس رہے،'' لوئیزا نے کہا۔

''ہاں، بالکل چاہتی تھی تاکہ پھر دوسروں کی طرح وہ بھی شرابی ہو جائے،'' اس کی ماں نے جواب دیا۔

''جارج ایورسٹ تو شراب نہیں پیتا،'' بیٹی نے صفائی پیش کی۔

''اس لیے کہ جب وہ بیس سال کا تھا تو کان میں بہت بری طرح جل گیا تھا اور اسے ڈر لگتے

لگا۔ شراب ہی چھوڑنی ہو تو کم از کم، جیسے سے بھی نفس میں بھلی ہونا بہتر طریقہ ہے۔"

پادری بولا "بیشک، بیشک۔"

اور اس بات سے وہ ہمیشہ اتفاق کیا۔ لیکن اس نے اتنے برسوں کے لیے دور چلے جانے پر خفا ہوتی تو کیا کرتی۔ وہ تو صرف ایک بیوی تھی۔

3

جب میری تیس برس کی ہوئی تو زندگی بہت بیزار تھی۔ اس وقت وہ بے حد غریب تھے۔ روپیہ بہت چاہیے تھا اور آمدنی بہت کم تھی۔ میری اور ماں کا خدمتگار بھی کوئی نہ تھا۔ اس کو موقع ہی کب نصیب ہوا تھا۔ یلڈرسوں میں کوئی اہل و جوان انجمن نہیں ملتا تھا۔ اور ان کی کمائی بھی برابر تھی۔ زندگی کی اس ناروانی بستی، اس گھٹی گھٹی سی ... بے مہر گرمی نے دونوں لڑکیوں کے دلوں کو سخت اور بے حس بنا دیا تھا۔

گرجا کے لیے کسی پادری کا ... ضروری تھا۔ اتفاق سے مسٹر لنڈلی نے کسی پرانے دوست سے ایک عہدہ ... سے پہلے ... کی وصیت تھی۔ وہ ... لنڈلی کی قوم ... کا۔ اس کی عمر ستائیس سے ... تھی۔ ... پرانے کیمبرج شائر خاندان سے تھا ... ایک اچھے مشاہرے پر ... اور شوہر کی بیماری پر ذرا بھی تاسف نہ کیا۔

میں جب ... کوئی نوجوان آدمی ہوگا، ... کے بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ ... بارہ سال کے لڑکے سے بڑا، عینک لگائے، ... شرمیلا ... بات کرنے سے بھی ... لیکن ساتھ میں ایک طرح کی غیر انسانی خود اعتمادی بھی اس میں تھی۔

پادریوں کا کوٹ پہنے، اوپر تک بٹن لگائے، جب وہ آیا تو مسز لنڈلی نے اسے دیکھتے ہی جی میں کہا: ''کیسا ذرا سا بھتنا!'' اور پہلی مرتبہ کئی دن تک خدا کی انتہائی شکرگزار رہی کہ اس کے سب بچے آدمی کی صورت تھے۔

میسی میں ادراک کی طبعی صلاحیت نہ تھی۔ گھر والوں کو جلد ہی پتا چل گیا کہ انسانی جذبات کے تمام مدارج سے وہ آشنا نہ تھا؛ لیکن اس کے پاس ایک ذرا پختہ اور فلسفیانہ ذہن تھا، جس کے سہارے وہ جیتا تھا۔ اس کے جسم کا تصور تقریباً محال تھا، ذہنی طور پر البتہ وہ واضح وجود رکھتا تھا۔ اس کے شریک ہوتے ہی گفتگو میں متوازن اور مجرد لہجہ پیدا ہو جاتا۔ یک بیک بول اٹھنے، مغضوب دعووں، ذاتی یقین کے مظاہروں کی جگہ غیر جذباتی اور معقول دعوے لے لیتے۔ یہ مسز لنڈلی پر بہت گراں تھا۔ جب وہ کچھ کہتی تو وہ چھوٹا آدمی اس کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی باریک آواز میں، اسی بات کو، اپنے طور پر ناپ تول کر بیان کرتا اور مسز لنڈلی کو یوں محسوس ہوتا کہ جس جھرجھری سطح پر ان کی گفتگو ہو رہی تھی، اس کے کسی شگاف میں سے ہلکی پھلکی ہوا میں جا گری ہے۔ بات کر کے وہ خود ہی الجھتی تھی اور جلد ہی مصمم خاموشی پر اتر آنے کے لیے مجبور ہو گئی۔

پھر بھی اس نے اپنے ذہن سے یہ فراموش نہ کیا کہ میسی مجرد شریف زادہ تھا، جسے تھوڑے ہی عرصے بعد چھ سو یا سات سو پاؤنڈ سالانہ کی آمدنی ہوا کرے گی۔ اگر مالی آسائش ہو تو مرد کی کیا اہمیت! مرد ایسا ہی تھا جیسے دولت میں ذرا اور اضافہ۔ بائیس سال میں اس کی جذباتیت بالکل پامال ہو گئی تھی اور اسے غریبی کے بھاری چکر کے سوا کسی بات کا فکر نہ تھا۔ اسی لیے وہ میسی کی، ایک معقول آمدنی کے نمائندے کی حیثیت سے، حمایت کرتی تھی۔

ایسے موقعوں پر، جب وہ کسی دوسرے کی کوئی غیر منطقی، مہمل بات پکڑ لیتا یاد ہراتا، آپ ہی آپ طنزیہ کھلکھلانا میسی کی سب سے زیادہ کوفت پیدا کرنے والی عادت تھی۔ مزاح کی فقط یہی صورت سے معلوم تھی۔ لیکن ناول کوئی سا بھی ہو، اس کی نظر میں ناقابل فہم طور پر بے معنی اور بے مزہ تھا اور بازاری مذاق کو وہ یا تو تحیر کے ساتھ سنتا، اسے ریاضی کی طرح جانچتا، یا بالکل نہ سنتا۔ عام انسانی تعلقات میں اس کا وجود عدم تھا۔ روزمرہ کی سیدھی سادی باتوں میں حصہ لینے کے بالکل ناقابل، وہ گھر میں چپ چاپ ٹہلا کرتا یا کھانے کے کمرے میں بیٹھ گھبرایا ہوا سا، اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہتا،

Scanned with CamScanner

ہمیشہ اپنی سرد، تلطیف شدہ، چھوٹی دنیا میں سب سے الگ۔ کبھی کبھار کوئی یا طنزآمیز فقرہ کستا جو انسانی معیار سے برمحل نہ معلوم ہوتا، یا اپنی، طعنہ سی، چھوٹی ہنسی ہنستا۔ اسے اپنا اور اپنی کم مائیگی کا بچاؤ کرنا پڑتا تھا۔ وہ سوالوں کا جواب، بڑی بےدلی سے، ہاں یا نہیں میں دیا کرتا تھا، کیونکہ وہ ان کا مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے گھبراتا تھا۔ لوئیزا نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک آدمی کو دوسرے سے پہچاننے میں بھی مشکل سے تھا، لیکن کسی طرح کے اتصال کے واسطے، جو نامعلوم طور پر اس پر خوشگوار اثر کرتا، میری یا خود اس کے قریب رہنا پسند کرتا تھا۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر وہ نہایت قابل قدر کارکن تھا۔ دائمی شرمیلا، لیکن اپنے فرض کے احساس میں مکمل تھا۔ جہاں تک وہ عیسائیت کو سمجھ سکا تھا وہ ایک سچا عیسائی تھا۔ اگر وہ کبھی یہ محسوس کرتا کہ کسی کے لیے کچھ کرسکتا ہے تو اسے کیے بغیر نہ رہتا، گو وہ کسی سے تعلق پیدا کرنے میں قطعی نااہل ہونے کی وجہ سے مدد دینے سے قاصر تھا۔ وہ بیماروں کو بڑی تندہی سے دیکھنے جاتا رہا، اس نے حساب کتاب درست کیا، ضرورت مندوں اور بیماروں کی فہرست تیار کی اور امداد لے کر، اور یہ دیکھنے کو کہ وہ اور کیا کرسکتا ہے، گھوما پھرا۔ بیٹوں کے بارے میں مسز لنڈلی کی تشویش کا سنا تو انھیں کیمبرج یونیورسٹی بھجوانے کے وسیلوں کی تفتیش کرنے لگا۔ اس کی ہمدردی نے میری کو تقریباً خوفزدہ کردیا۔ وہ اس ہمدردی کی جتنی عزت کرتی تھی اس سے تئیں ہی متنفر بھی تھی۔ کیونکہ ان تمام باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میسی کو یہ احساس نہ تھا کہ وہ کسی شخص یا کسی آدمی کی مدد کر رہا ہے۔ اس کو تو محض ایک طرح کی ریاضیاتی تفصیلات سے حل، دیے ہوئے مسائل کی عقدہ کشائی اور ایک مدلل کارکردگی کا احساس تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے عیسوی عقائد کو بدیہیات مان لیا ہے۔ اس کا مذہب مشتمل تھا ان باتوں پر جن کی منظوری اس کے مجرد ذہن نے دے دی ہو۔

اس کے کاموں کو مدنظر رکھتے ہوئے میری پر اس کی تعظیم و تکریم واجب ٹھیری، جس کے نتیجے میں میری پر اس کی خدمت گذاری بھی لازم ہوگئی۔ کراہیتاً لیکن آرزو کے ساتھ، اس نے خود کو اس بات پر مجبور کیا لیکن میسی کو اس کا احساس نہ ہوا۔ جب وہ حلقے کے گشت پر نکلتا تو میری اس کے ہمراہ جاتی اور سرد مہری سے اسے تحسین کی نظروں سے دیکھنے کے باوجود اس کا دل اکثر اس چھوٹی سی، پیدہ پا، ٹھوڑی تک اوورکوٹ کے بٹن لگائے، خمیدہ کندھوں والی صورت کے لیے رحم سے معمور ہو جاتا تھا۔ وہ ایک

Scanned with CamScanner

خوبصورت، پُرسکون، کشیدہ قامت لڑکی تھی، اس کی متانت میں حسن تھا۔ لیکن وہ شریف زادی تھی۔
جب لوگوں نے، ایلڈ کروس میں، اسے میسی کے ساتھ جاتے دیکھا تو کہنے لگے

''میں نے کہا، مس میری نے شکار پھانس لیا۔ کبھی ایسا سراسر ابالشتیا دیکھا ہے تم نے!''

میری کو پتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کا دل ان کی نفرت سے دہک اٹھا اور، گویا تحفظ کے خیال سے، ہمراہ چھوٹے آدمی کے اور قریب ہوگئی۔ بہرطور وہ میسی کی سچی نیک نیتی کو محسوس بھی کر سکتی اور اس کی عزت بھی۔

زیادہ دور یا تیز چلنا میسی کے بس کی بات نہ تھی۔

''آپ کی صحت اچھی نہیں رہی؟'' میری نے اپنے پُروقار انداز میں دریافت کیا۔

''مجھے اندرونی شکایت ہے۔''

میری کی خفیف کپکپاہٹ کا اسے پتا نہیں چلا۔ اس کے ساتھ نرم انداز دوبارہ اختیار کرنے کے لیے میری نے سر جھکا کر اپنا سکون حاصل کرنا چاہا اور خاموشی چھائی رہی۔

وہ میری کا شائق تھا۔ میری نے میزبانی کا یہ اصول بنا دیا تھا کہ میسی جب بھی حلقے میں کہیں جائے گا، اور اس کی نوبت کم آتی تھی، تو ہمیشہ وہ خود یا اس کی بہن ہمراہ ہوگی۔ لیکن کسی دن صبح کو اسے فرصت نہ ہوتی اور لوئیزا کو ساتھ جانا پڑتا۔ لوئیزا کی، میسی کے ساتھ، ایک شائستہ نوازش کا انداز اختیار کرنے کی کوشش فضول تھی۔ وہ اس کو نفرت کی نظر کے علاوہ کسی طرح نہ دیکھ سکتی تھی۔ جب وہ پیچھے سے اسے دیکھتی، دبلا پتلا، کندھے جھکے ہوئے اور وہ تیرہ برس کا بیمار لڑکا نظر آتا تو، بے انتہا متنفر ہوکر، اس کا دل چاہتا کہ اس کا وجود ہی مٹا دے۔ اور اس کے باوجود، انصاف کے عمیق تر احساس کے سامنے، جو میری میں تھا، لوئیزا کو سر جھکا دینا پڑتا تھا۔

وہ ڈیورینٹ کو دیکھنے جا رہے تھے، جس پر فالج گر گیا تھا اور بچنے کی امید کم تھی۔ اس چھوٹے پادری کے ساتھ، ڈیورینٹ کے مکان میں داخل ہوتے ہوئے، لوئیزا بے ڈھنگی طرح محجوب ہوئی۔

ڈیورینٹ کی بیوی، بہرحال، اپنی اصل آزمائش کے موقعے پر کافی پُرسکون تھی۔

''مسٹر ڈیورینٹ کیسے ہیں؟'' لوئیزا نے پوچھا۔

جواب ملا، ''ویسی ہی حالت ہے اور ہمیں تبدیلی کی کوئی توقع بھی نہیں۔'' چھوٹا پادری کھڑا

دیکھتا رہا۔

وہ اوپر گئے، اور تھوڑی دیر کھڑے بوڑھے کے تکیے پر دھرے سفید سر، چادر پر پڑی سفید داڑھی اور بستر کو دیکھتے رہے۔ لوئیزا کو صدمہ پہنچا اور وہ ڈر گئی۔

"اتنا خوفناک معلوم ہوتا ہے،" اس نے کانپ کر کہا۔

"مجھے ہمیشہ سے خیال تھا کہ ایسا ہی ہوگا،" مسز ڈیورینٹ نے جواب دیا۔

پھر لوئیزا کو اس سے بھی خوف آنے لگا۔ دونوں عورتیں، بے چین میسی کے کچھ کہنے کی منتظر تھیں۔ وہ چھوٹا اور جھکا ہوا، اضطراب کے مارے بولنے سے قاصر کھڑا تھا۔

"کچھ ہوش ہے انھیں؟" آخر اس نے پوچھا۔

"شاید ہو،" مسز ڈیورینٹ نے کہا۔ "جون، آواز سنائی دیتی ہے؟" اس نے زور سے پوچھا۔ بے حس مرد کی بے رونق، نیلی آنکھوں نے ناتوانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، ہوش ہے،" مسز ڈیورینٹ نے میسی سے کہا۔ آنکھوں کی بجھی بجھی چمک کے سوا بیمار بالکل مردہ سا پڑا تھا۔ تینوں خاموش کھڑے رہے۔ لوئیزا مضطرب تھی، لیکن بے جانداری کے بوجھ سے غمگین بھی تھی۔ اس کے ضبط کو، ہاں میسی نے قائم رکھا۔ اس کی غیر انسانی قوتِ ارادی ان سب پر حاوی آ گئی۔

پھر انھوں نے نیچے مرد کے قدموں کی چاپ سنی اور کسی نے دبی آواز میں پکارا، "ماں، تم اوپر ہو؟"

مسز ڈیورینٹ چونک کر دروازے کی طرف بڑھی، لیکن تیز، ڈول قدموں نے اوپر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"میں ذرا جلدی آ گیا، ماں،" ایک پریشان آواز نے کہا اور انھوں نے سیڑھیوں پر ملاح کی صورت دیکھی۔ اس کی ماں آئی، جیسے یکایک کسی سہارے کی ضرورت کا احساس ہوا تھا، اور اس سے چمٹ گئی۔ الفرڈ نے ماں کو بانہوں میں گھیر لیا اور جھک کر چومنے لگا۔

"وہ گزر تو نہیں گئے، ماں؟" اس نے اضطراب کے ساتھ، آواز کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے، پوچھا۔

Scanned with CamScanner

مس لوئیزا ساتھ کھڑے ماں بیٹے سے نظر ہٹا کر سیڑھیوں کے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ اپنا اور میں کا اس وقت وہاں ہونا اس کی برداشت سے باہر تھا میں گھبرایا ہوا کھڑا تھا، جیسے جذبات کے اس مسلسل اظہار کے سامنے حواس باختہ ہو۔ وہ اس کو مضطرب ہو کر، بادل ناخواستہ، بے حسی سے دیکھ رہا تھا۔ لوئیزا کو جو بھرے دل میں، ایسا معلوم ہوا کہ ان کا وہاں موجود ہونا سراسر بے محل تھا۔

مسز ڈیوربینٹ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

''یہ مس لوئیزا اور پادری صاحب ہیں،'' اس نے بیٹھی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

سرخ چہرے اور چھریرے بدن کے بیٹے نے تن کر سلام کرنا چاہا لیکن لوئیزا نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ پھر اس نے الفرڈ کی بادامی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی اور اس کے چھوٹے، سفید دانت لمحے بھر کو نمایاں ہوئے۔ اس کے سلام کا یہ طریقہ کبھی لوئیزا کو بہت محبوب تھا۔ لوئیزا پر پریشانی چھا گئی۔ وہ پلنگ کے پاس گیا، پتھر کے فرش پر اس کے جوتوں کی کھٹ کھٹ ہوئی، اس نے وقار کے ساتھ اپنا سر جھکایا۔

''ابا، کیسے ہیں آپ؟'' اس نے چادر پر ہاتھ رکھتے ہوئے، ہچکچاتے ہوئے کہا۔ لیکن بوڑھا، کچھ نہ دیکھنے والی، پتھرائی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ چند منٹ تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد الفرڈ دھیرے دھیرے پیچھے کو ہٹنے لگا۔ اس کا سینہ ابھرا اور لوئیزا کو، نیلی بجری قمیص کے نیچے، اس کے سینے کے عمدہ خطوط نظر آئے۔

''وہ مجھے نہیں پہچانتے،'' اس نے ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ بتدریج اس کا رنگ فق ہوتا گیا۔

''نہیں، بیٹے!'' اس کی ماں، سر اٹھا کر، پکاری۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ اور اچانک اس نے اپنا سر لڑکے کے کندھے پر ٹیک دیا، اور وہ جھک کر اسے اپنے سے لگائے ہوئے تھا، اور چند لمحوں کے لیے وہ زور زور سے روئی۔

لوئیزا نے لڑکے کے پہلو کانپتے دیکھے اور اس کی سانس کی تیزی سی سنی اور منہ موڑ لیا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ باپ اجلے بستر پر، ساکت، پڑا تھا۔ اب دھوپ سے سنولایا ملاح کمرے میں تھا تو میں عجیب، ادھمنا سا اور بالکل چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔ وہ انتظار میں کھڑا تھا۔ لوئیزا مر جانا، کسی طرح فنا ہو جانا چاہتی رہا۔ اس میں مڑ کر دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

"میں دعا مانگوں کیا؟" پادری کی کمزور آواز آئی اور سب گھٹنوں کے بل جھک گئے۔

لوئیز، بستر پر پڑے ہوئے جامد آدمی سے، ڈر گئی تھی۔ اور میسی کی باریک اور مفروق آواز کو سن کر اسے، لمحے بھر کو، میسی سے ڈر لگا۔ پھر سنبھل جانے کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ بستر کے سرہانے ماں اور بیٹے کے سر نظر آ رہے تھے: ایک پر کالے فیتے کی ٹوپی تھی اور پیچھے سفید گردن؛ دوسرے پر بھورے، دھوپ جلے بال تھے جن کا گھنا پن اور سختی، مانگ نکالنے کے مانع تھی اور گردن کا پکا، سانولا رنگ تھا اور گویا دل ناخواستہ جھکی ہوئی تھی۔ بوڑھے کی بڑی، سفید داڑھی ذرا بھی نہ ہلی، دعا جاری رہی۔ میسی نے ایک شفاف وصاحت کے ساتھ دعا مانگی کہ وہ سب منشائے ایزدی کی تعمیل کے قابل ہوں۔ وہ کوئی ایسی شے تھا جو ان جھکے ہوئے سروں پر مسلط تھی، کوئی بے حس شے، جو ان پر سنگدلی سے حکمراں تھی۔ لوئیز اس سے خوفزدہ تھی اور دعا کے دوران میں، میسی کا تھوڑا سا احترام، اس کے دل میں ہونا یقینی تھا۔ یہ جابر، سرد موت کے قبل از وقت ذائقے کے مانند تھا، خالص انصاف کا ذائقہ تھا۔

اس شام کو لوئیز نے میری سے وہاں جانے کی باتیں کیں۔ ماں کو تھامے ہوئے الفرڈ ڈیورینٹ کا خیال اس کے دل اور رگ و پے پر چھایا ہوا تھا۔ رہ رہ کر، اس کی آواز کا بھرانا یاد آتے ہی، اس کے اندر شعلہ سا لپک جاتا۔ وہ وہ اس کے چہرے کو، اپنے تصور میں، اور زیادہ واضح دیکھنا چاہتی تھی: چہرہ دھوپ سے لال، بے پروا اور زمسار سنہری بھوری آنکھیں، جو اس وقت ایک فطری خوف سے کشیدہ تھیں، ستواں ناک، دھوپ سے خوب سنولائی ہوئی اور منہ، جو اسے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس کے تن بدن کے متعلق سوچنے سے، جو زندگانی کا ایک راست اور نفیس فوارہ تھا، اس کا دل فخر سے بھر گیا۔

"وہ خوبصورت لڑکا ہے،" اس نے میری سے کہا، جیسے وہ اس سے ایک سال بڑا نہیں، چھوٹا تھا۔

اور اس بات کی تہہ میں میسی کی غیر انسانی ہستی کا عمیق تر خوف، تقریباً نفرت تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے خود کو اور الفرڈ کو میسی سے بچانا چاہیے۔

"جب وہاں میں نے مسٹر میسی کی موجودگی محسوس کی،" اس نے کہا، "تو مجھے اس سے تقریباً گھن سی آئی۔ اسے وہاں موجود ہونے کا کیا حق تھا!"

میری نے ایک وقفے کے بعد جواب دیا: ''وہ یقیناً حق بجانب تھا۔ وہ واقعی سچا عیسائی ہے۔''

''مجھے تو وہ قریب قریب پگلا معلوم ہوتا ہے۔'' لوئیزا نے کہا۔

میری، پُرسکون اور خوبصورت، ایک لمحے کے لیے خاموش رہی، پھر بولی: ''ارے نہیں، پگلا نہیں ـــــ''

''تو پھر، اسے دیکھ کر مجھے چھٹے یا پانچویں مہینے میں پیدا ہو جانے والے بچّے کا خیال آتا ہے، جیسے پیدا ہونے سے پہلے اسے پوری طرح بڑھنے کا موقع نہ ملا ہو۔''

میری نے آہستہ آہستہ کہا: ''ہاں، کسی چیز کی کمی اس میں ہے۔ لیکن اس میں کوئی بڑی حیرت انگیز خوبی ہے، اور وہ واقعی نیک ہے۔''

لوئیزا نے کہا: ''جی، یہ درست نہیں معلوم ہوتا کہ وہ نیک ہے۔ آخر اس بات کو نیکی کہلانے کا کیا حق ہے!''

''لیکن وہ نیکی ہی تو ہے۔'' میری نے اصرار کیا، اور پھر ہنس کر بولی: ''بولو، اس کو تم بھی جھٹلا نہیں سکتیں۔''

اس کی آواز میں ایک طرح کی مستقل مزاجی تھی۔ وہ اپنا کام بڑے اطمینان سے کرتی رہی۔ دل میں وہ جانتی تھی کہ کیا پیش آنے والا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میسی اس سے زیادہ طاقتور تھا اور اس کی ہستی کے سامنے اسے سر جھکانا پڑے گا۔ اس کا جسم میسی سے زیادہ طاقتور اور مغرور تھا۔ اس کا جسم میسی کو ناپسند کرتا تھا، حقیر جانتا تھا۔ لیکن وہ میسی کی اخلاقی، ذہنی ہستی کی گرفت میں تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دن گنے جا چکے تھے۔ اور گھر والے نگراں تھے۔

4

چند دن بعد بوڑھا ڈیورینٹ فوت ہو گیا۔ لوئیزا الفرڈ سے ایک دفعہ اور ملی لیکن وہ اس کے روبرو ایک پُراسرار ہالا اور اس طرح پیش آیا جیسے لوئیزا عورت نہیں، کسی قسم کی حکمراں ارادت تھی اور وہ خود ایک جدا اور متمیز ارادت تھا، جو اس کے سامنے منتظر کھڑی تھی۔ لوئیزا، جس نے کبھی اس بالکل اَن سنی دیوار جیسی علیحدگی کو اپنے اور کسی دوسرے کے درمیان حائل نہ پایا تھا، اس سے حیران بھی ہوئی اور

خوفزدہ تھی۔ الفرڈ کو کیا ہو گیا تھا؟ اور وہ فوجی تنظیم سے نفرت کرتی تھی، اس کی سخت مخالف تھی۔ اب الفرڈ خود نہیں تھا بلکہ وہ ادارہ تھا جو حکم دینے والی ادارت پر حاوی آ کر تعمیلِ حکم کرتی ہے۔ لوئیزا کو یہ قبول کرنے میں تامل تھا۔ الفرڈ نے اپنی ذات کو لوئیزا کی دسترس سے باہر پہنچا دیا تھا۔ اس نے خود کو کمپنی اور لوئیزا کا تابع قرار دے دیا تھا۔ اور اس نے لوئیزا سے پیچھا چھڑانے اور ذرا سا تعلق بھی نہ رکھنے کی یہ ترکیب نکالی تھی کہ ایک کمپنی کی مجرد حیثیت اختیار کر کے، مخالف فریق کی طرف سے لاشخصی طور پر اس کے مقابل آیا کرے گا۔

وہ رنجیدہ، مستقل اس کے متعلق خیال باندھتی رہی، باندھتی رہی۔ اس کا وحشی، ضدی دل درماندہ نہ ہوا تھا اور اپنے حقوق سے دستبردار نہ ہوا۔ کبھی کبھی وہ الفرڈ کا خیال چھوڑ دیتی۔ آخر وہ اس سے کترا اسے کیوں پریشان رکھے؟

پھر وہ دوبارہ اس کے خیال میں کھوئی گئی اور اس سے قریب قریب نفرت کرنے لگی۔ یہ الفرڈ نے بچ نکلنے کا طریقہ نکالا تھا۔ لوئیزا نے اس فعل کی بزدلی کو محسوس کیا کہ الفرڈ نے ایسے اطمینان سے اسے اعلیٰ اور خود سے وابستہ طبقے میں رکھ کر اپنی ذات کو ناقابلِ حصول حد تک علیحدہ کر دیا تھا جیسے کہ وہ، اس کو چاہنے والی ایک عورت، کسی شمار میں ہی نہیں تھی۔ لیکن لوئیزا یہ تسلیم کر لینے کو تیار نہیں تھی۔ دل میں ہٹ دھرمی لیے وہ اس سے لو لگائے رہی۔

5

چھ مہینے بعد میری نے مسٹر میسی سے شادی کر لی۔ کوئی عشق بازی ہوئی تھی نہ کسی نے اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی۔ لیکن ہر ایک، توقعات لیے ہوئے، بے چین اور منتظر تھا۔ ایک دن جب میسی نے میری سے شادی کی درخواست کی تو اس کی باریک، مجرد آواز کو سن کر لنڈلی چونک گیا اور کانپنے لگا۔ میسی بہت گھبرایا ہوا، مگر عجیب طرح سے مطلق رہا۔

میری نے کہا، "مجھے بڑی خوشی ہوگی، لیکن فیصلہ تو یقیناً میری کی مرضی پر منحصر ہے۔" اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ڈیسک پر پنسل رکھتے ہوئے کانپا۔

چھوٹا آدمی، اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم، کمرے سے میری کو ڈھونڈنے نکلا۔ بہت دیر

اس کے پاس بیٹھے رہنے کے بعد وہ خود کو بات کرنے کے لیے تیار کر سکا۔ اتنے میری ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پیش آنے والی بات سے وہ خوفزدہ، تشویش کے مارے اکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ لیکن اس کی روح مرتعش اور منتظر تھی۔ تقریباً پُر توقع، وہ انتظار میں تھی، تقریباً اس کی آرزومند تھی۔ اور پھر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ بولنے والا ہے۔

پادری نے کہا اور اتنے وہ یکایک اس کے چھوٹے چھوٹے گھٹنوں کو نفرت سے دیکھتی رہی،

''میں مسز لنڈلی سے دریافت کر چکا ہوں کہ کیا وہ میری درخواست کو قبول کر لیں گے۔'' اسے اپنی تنقیص کا علم تھا، لیکن اس کا ارادہ مصمم تھا۔ بیٹھے بیٹھے میری سن اور غیر نفوذ پذیر ہوگئی، جیسے پتھر کی بن گئی ہو۔ میسی سے ایک لمحے بے اطمینانی سے انتظار کیا۔ اسے ترغیب وہ کیا دیتا، وہ خود بھی ترغیب کو نہیں سنتا تھا بلکہ اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کرتا تھا۔ اس نے میری کی جانب دیکھا اور، اپنی طرف سے یقین، اس کی طرف سے غیر یقینی، کہنے لگا:

''تم میری بیوی ہوگی، میری؟''

میری کا دل اب بھی سرد اور کشور تھا۔ وہ مغرورانہ بیٹھی رہی

''میں پہلے ممی سے بات کرنا چاہتی ہوں،'' اس نے کہا۔

''بہت بہتر،'' میسی نے جواب دیا اور لمحے بھر بعد اٹھ کر چل دیا۔

میری ماں کے پاس گئی۔ وہ سرد مہر اور کم آمیز تھی۔

''مسٹر میسی نے مجھ سے شادی کرنے کو کہا ہے، ممی،'' اس نے کہا۔ مسز لنڈلی اپنی کتاب کو تکتی رہی۔ اس کے احساس کا گلا گھٹا ہوا تھا۔ ''اچھا، اور تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کہ، میں جواب دینے سے پہلے آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

یہ جواب خود سوال تھا۔ مسز لنڈلی اس کا جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ، جھنجھلا کر، اپنے بھاری بدن کو صوفے پر اِدھر اُدھر کرتی رہی۔ میری منہ بند کیے، مطمئن سر اٹھائے بیٹھی تھی۔

''تمھارے والد کا خیال ہے کہ تم دونوں کا جوڑ کچھ برا نہیں رہے گا۔''

اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہر کوئی سرد مہر اور بے تعلق رہا۔ میری نے لوئیزا سے کوئی بات نہ کی، پادری لنڈلی سامنے ہی نہیں آئے۔

Scanned with CamScanner

شام کو میری نے میسی کو قبول کر لیا۔

"ہاں، میں آپ سے شادی کروں گی،" میری نے، اس کی طرف ذرا مشفقانہ بڑھتے ہوئے، کہا۔ وہ پریشان لیکن مطمئن تھا۔ میری دیکھ سکتی تھی کہ وہ بھی اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے: وہ اس کے اندر کے مرد کی، جو کوئی سرد اور فتح مندی سے بھرا تھا، دعوے داری کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ، پتھری، بیٹھی انتظار کرتی رہی۔

جب لوئیزا کو یہ پتا چلا تو اس نے ہر ایک سے، میری تک سے، ناراض ہو کر چپ سادھ لی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اعتقاد پر وار ہوا ہے۔ کیا حقائق واقعی اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتے تھے؟ وہ وہاں سے دور چلی جانا چاہتی تھی۔ اس نے میسی کے بارے میں سوچا۔ میسی کے پاس کوئی عجیب قوت تھی، اسے کوئی ناقابل تردید حق حاصل تھا: وہ ایک ارادہ تھا، جسے وہ سب مل کر بھی نہ جھٹلا سکتے تھے۔ یکا یک اس کے دل میں جذبات کا ہجوم ہوا۔ اگر میسی اس کے پاس آتا تو وہ اسے چٹکی سے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیتی۔ وہ اسے کبھی ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ اور وہ خوش تھی۔ وہ خوش تھی کہ اگر وہ چھوٹا آدمی اس کے زیادہ قریب آیا تو، چاہے وہ اس کے فیصلے کی قوت کو کتنی ہی سلوج کر دے، چاہے وہ کتنی ہی مجرد نیکی میں گزر کرتا ہو، اس کا خون طیش میں آ کر اسے فنا کر ڈالے گا۔ لوئیزا نے سوچا کہ وہ بدکیش تھی جو اس طرح خوش ہو رہی تھی۔ لیکن وہ خوش تھی۔

"میں چٹکی سے اٹھا کر اسے کمرے سے باہر پھینک دوں گی،" اس نے کہا اور اس واضح بیانی سے بہت تسکین حاصل کی۔ اس کے باوجود، اسے غالباً یہ محسوس کرنا چاہیے تھا کہ میری، اپنی سطح پر، اس سے بلند ہستی تھی۔ لیکن میری میری تھی، اور وہ تھی لوئیزا، اور اس امر میں بھی کسی طرح کا تغیر ناممکن تھا۔

میسی کو بیاہنے میں میری نے ایسا خالص تعقل بننے کی کوشش کی جیسا میسی خود تھا، بے حس اور جذبات سے عاری۔ اس نے خود کو مجبوس کر لیا۔ شروع شروع میں محسوس ہونے والی شرمندگی کی اذیتوں اور بے عصمتی کے خوف کو، نڈر ہو کر، دل میں آنے ہی نہ دیا۔ وہ محسوس نہیں کرے گی، اور وہ محسوس نہیں کرے گی۔ وہ ایک خالص ارادت تھی، جو میسی کو خاموشی سے قبول کر رہی تھی۔ اس نے ایک نئی طرز کی تقدیر کا انتخاب کیا۔ وہ نیک اور خالصاً منصف ہو گی، ایک ایسی اعلیٰ تر آزادی کی زندگی بسر کرے گی جس سے وہ آج تک ناآشنا تھی۔ اس نے خود کو فروخت کر ڈالا تھا، لیکن اس کو ایک نئی آزادی

مل گئی تھی۔ اب جسم سے نجات حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے ایک ادنیٰ شے کو، اپنے جسم کو، ایک اعلیٰ شے، مادی چیزوں سے آزادی، کے لیے بیچ ڈالا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کو شوہر سے جو کچھ ملا ہے، اس کی قیمت ادا کر چکی ہے۔ اس لیے، ایک طرح کی آزادی میں، وہ نازاں اور بے قید رہتی تھی۔ اس نے جسم سے قیمت ادا کی تھی، اس لیے جسم اس کے بعد سے توجہ کے قابل نہ تھا۔ وہ اس سے چھٹکارا پا کر خوش تھی۔ اس نے دنیا میں اپنے لیے مقام خرید لیا تھا، جو بعد ازیں بلا ثبوت تسلیم شدہ تھا۔ اب تو صرف یہ بات باقی تھی کہ عالی منش زندگی گزارنے اور فیاضی کی جانب اس کے فعل اور عمل کی نہج کیا ہو گی۔

اپنے اور شوہر کے پاس دوسروں کی موجودگی وہ بمشکل برداشت کر سکتی۔ اس کی خانگی زندگی اس کی خفت کا سبب تھی، لیکن وہ اسے دنیا کی نظروں سے چھپا سکتی تھی۔ ریل کی لائن سے میلوں دور وہ چھوٹے سے گاؤں کے پادری خانے میں تن تنہا رہتی تھی۔ اس نفرت کو، جو لوگ اس کے شوہر سے محسوس کرتے تھے، یا اس خاص انداز کو دیکھ کر جس سے لوگ اس کے شوہر سے یوں پیش آتے تھے جیسے وہ کوئی مریض ہو، اسے دکھ ہوتا؛ گویا کہ وہ خود میری کے تن بدن کی توہین تھی۔ لیکن اکثر لوگ اس کے شوہر کے سامنے گھبرائے سے رہتے، جس سے اس کا غرور دوبارہ واپس آ جاتا۔

اگر وہ اپنی اصلیت پر اتر آتی تو میسی سے، گھر میں دبے پاؤں اس کے اِدھر اُدھر پھرنے سے، اس کی باریک اور انسانی سمجھ بوجھ سے محروم آواز سے، جھکے ہوئے چھوٹے کندھوں اور کچھ نامکمل سے چہرے سے، جس کو دیکھ کر قبل از وقت پیدا ہو جانے والے بچے کا خیال آتا تھا، نفرت کرنے لگتی۔ لیکن وہ بڑی سختی سے اپنی وضع پر قائم رہی۔ اس نے میسی کا خیال رکھا اور اس کے ساتھ صحیح برتاؤ کیا۔ اس کے علاوہ، اس کے دل میں میسی کا ایک گہرا، بزدلانہ خوف تھا، جو غلامانہ ذہنیت سے ملتا جلتا تھا۔

میسی کے رویے میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی۔ اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے وہ محتاط طور پر منصف اور مہربان تھا۔ لیکن اس کے اندر کا مرد از خود مکمل شدہ اور سرد اور بے حد تحکم نہ تھا۔ اس کے مختصر، کمزور اور ناکافی وجود کو دیکھتے ہوئے میری کو امید نہ تھی کہ وہ ایسا ہو گا۔ یہ ایک ایسی بات اس کے پلے پڑی تھی جسے وہ سمجھ نہ پائی تھی اور جس نے اسے ذہن کو قابو میں رکھنے اور خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری کو مبہم طور پر معلوم تھا کہ وہ خود کو ہلاک کر رہی ہے۔ آخر کو اس کا جسم کوئی ایسی شے تو نہ تھا کہ جس سے آسانی سے چھٹکارا مل جائے۔ اور پھر اسے ٹھکانے لگانے کا یہ طریقہ! بعض دفعہ تو وہ یہ

Scanned with CamScanner

محسوس کرتی کہ اسے باغی ہو کر موت کا کھیل کھیلنا چاہیے، ایک عام تخریب کے ذریعے، ہر شے سے قطعی انکار کے لیے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہیے۔

میسی اپنے گرد و پیش کے حالات سے تقریباً ناواقف تھا۔ وہ خانگی معاملات میں مین میخ نہیں نکالتا تھا۔ میری گھر میں من مانی کرنے کو آزاد تھی۔ درحقیقت وہ اس سے بڑی حد تک مستغنی تھی۔ وہ گھنٹوں کھویا کھویا بیٹھا رہتا تھا۔ مہربان تھا اور تشویش کی حد تک میری کا خیال رکھتا تھا۔ لیکن جب وہ سوچ لیتا کہ حق پر ہے تو اس کی قوت ارادی، کسی بے جان مشین کی طرح، محض کورانہ مردہ ہوتی۔ اور بیشتر معاملات میں وہ منطقی طور پر صائب تھا یا پھر اس کو اس عقیدے کا، جسے دونوں مانتے تھے، استحقاق تھا۔ صورت حال یہ تھی۔ کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں جس کے خلاف میری کچھ کر سکے۔

پھر اس نے خود کو حاملہ پایا اور پہلی دفعہ، انسانوں اور خدا کے سامنے خائف۔ کراہت محسوس کی۔ یہ بھی اسے برداشت کرنا پڑا ـــ یہ بھی آخر حق تھا۔ بچہ خوبصورت اور صحت مند پیدا ہوا۔ جب میری نے اس کو گود میں لیا تو دل بدن میں کانٹے کی طرح چبھا۔ اس کے اندر کے پامال شدہ اور صامت بدن کا اب پھر سے لڑکے کے بدن میں جی اٹھنا لازمی تھا۔ آخر اسے زندہ تو رہنا تھا۔ بہرکیف، یہ بات بالکل آسان نہ تھی۔ وہ بچے کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، اس سے نفرت کرنے لگی اور اس کی خاطر دکھ، محبت کا اٹھایا۔ سے نفرت تھی کیونکہ بچے نے دوبارہ اسے مادی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جبکہ وہ جسمانی زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ذہن میں جینے کی خاطر اپنے جسم کو بالکل کچل ڈالنا، مٹا دینا چاہتی تھی۔ اور اب اس بچے کا ہونا انتہائی ظلمات اور اذیت ناک تھا، کیونکہ بچے سے محبت کرنا اس پر فرض تھا۔ اس کا مقصد پھر سے دو نیم ہو گیا تھا، وہ غیر متشکل، بے مقصد ہونے پر مجبور ہو گئی، اس کا کوئی اصل وجود نہ رہا۔ بحیثیت ماں کے، وہ ایک شکستہ، ذلیل شے تھی۔

میسی پر، جو انسانی جذبات کے سلسلے میں ہر بات سے ناآشنا سا تھا، اب بچے کی فکر سوار ہو گئی۔ بچے نے پیدا ہوتے ہی میسی کے جذبات کی دنیا میں ساری جگہ گھیر لی۔ میسی کے ذہن میں ہر وقت اسی کا خیال رہتا تھا کہ بچے کے آرام اور سلامتی میں کچھ حارج نہ ہو جائے۔ وہ اس کے لیے ایک نئی چیز تھا، جیسے بچے کی شکل میں وہ خود جنم ننگا پیدا ہوا ہو، اور بچے پر خطر ننگے پن سے باخبر اور وسوسوں میں گرفتار ہو۔ زندگی بھر اسے کسی دوسرے کا احساس نہ ہوا تھا اور اب بچے کے سوا کسی کی خبر نہ تھی۔ اس کا یہ

مطلب نہیں کہ وہ اسے کھلاتا، پیار کرتا اور اس کی دیکھ ربھال کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے کرتا کچھ نہیں تھا، لیکن بچہ اس پر چھا گیا تھا۔ اس نے بیک وقت میسی کے ذہن کو خالی اور پُر کر دیا تھا۔ تمام دنیا کی جگہ بچے نے لے لی تھی۔

اس کی بیوی کو یہ بھی برداشت کرنا پڑتا تھا: اس کا سوال، ''اس کے رونے کی کیا وجہ ہے؟'' بچے کی آواز سنتے ہی اس کا یاد دلانا ''میری، یہ بچے کی آواز ہے'' دودھ پلانے کے وقت میں پانچ منٹ کی دیر ہو جانے پر اس کی بے قراری' اس نے یہ مصیبت خود ہی مول لی تھی اور اب اس پر فرض تھا کہ اپنی بات کو نبھائے۔

6

لوئیزا نے میلے کچیلے وکر خانے میں گھر پر، اپنی بہن کی شادی کی وجہ سے بہت کلفت اٹھائی۔ منگنی کے دوران میں اس نے ایک دفعہ اس کے خلاف احتجاج شروع کیا تھا لیکن میری کے پرسکون لہجے میں یہ بات سن کر خاموش رہ گئی تھی: ''لوئیزا، میسی کے بارے میں مجھے تم سے اتفاق نہیں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اس پر لوئیزا دل ہی دل میں ناراض ہوئی اور اسی لیے خاموش رہی۔ اس خطرناک کیفیت نے اس کے اندر تغیر کا آغاز کیا۔ اس کے ذاتی تنفر نے میری سے بھی اس کا جی پھیر دیا، جس پر اس سے قبل اس کو پورا اعتماد تھا۔

''میں ننگے پاؤں سڑکوں پر بھیک مانگنے کو تیار ہوں،'' لوئیزا نے میسی کے متعلق سوچتے ہوئے کہا۔

لیکن ظاہر تھا کہ میری ایک مختلف الوالعزمی کا ثبوت دے سکتی تھی۔ چنانچہ لوئیزا نے، جو عمل کی قائل تھی، یکایک محسوس کیا کہ اس کا معیار، یعنی میری، بالآخر اعتراض کی حد سے باہر تھا۔ میری پاک کس طرح ہو سکتی تھی — یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی کام کرے ذلیل اور کہلائے روحانی۔ لوئیزا میری کی ارفع روحانیت کی طرف سے مشکوک تھی۔ اس کی نظر میں وہ سچی نہیں رہی تھی۔ اور اگر میری روحانیت پسند اور گمراہ تھی تو اس کے باپ نے اسے کیوں نہیں بچایا؟ روپے کی وجہ سے۔ باپ کو یہ معاملہ ناپسند تھا لیکن وہ، روپے کی وجہ سے، کنارہ کش ہو گیا تھا۔ ماں کی رائے ''میسی کو کچھ بھی پیش

آ ئے، میری کی زندگی تو بن گئی۔" اتنی صریحی اور سطحی طور پر خود غرضانہ تھی کہ لوئیزا کے آگ لگ گئی۔

"یوں زندگی بنانے سے تو میں محتاج خانے کو ترجیح دوں گی:" اس نے زور سے کہا۔

"تمھارے والد اس کا انتظام کر دیں گے:" ماں نے بے رحمی سے جواب دیا۔ اس بات نے، کما یتا، لوئیزا کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ دل کی گہرائیوں میں ماں سے اور تقریباً خود سے نفرت کرنے لگی۔ اس نفرت کا تجزیہ کرنے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ لیکن وہ برابر کوشش کرتی رہی اور آخر اس نوجوان عورت نے کہا:

"وہ غلطی پر ہیں، سراسر غلطی پر ہیں۔ انھوں نے اپنی روحوں کو ایک نکمی، بیکار شے کے لیے غارت کر دیا ہے" اور اب ان میں کہیں ذرہ برابر محبت بھی باقی نہیں ہے۔ لیکن میں محبت حاصل کر کے رہوں گی۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم اسے جھٹلا دیں۔ انھیں خود محبت کبھی نہیں ملی اس لیے وہ کہنا چاہتے ہیں کہ محبت کا وجود نہیں۔ لیکن میں اسے پا کر رہوں گی۔ میں محبت کروں گی— یہ میرا پیدائشی حق ہے۔ میں جس مرد سے شادی کروں گی، اس سے محبت کروں گی۔ بس مجھے اور کسی بات کی پروا نہیں۔"

چنانچہ لوئیزا سب سے الگ تھلگ ہو گئی تھی۔ وہ اور میری، میسی کی وجہ سے، جدا ہو چکے تھے۔ میسی سے شادی کر کے، لوئیزا کی نظروں میں، میری نے اپنی عزت کھو دی تھی۔ اپنی بلند خیال، روحانی بہن کے اس طرح جسمانی طور پر ذلیل ہونے کا تصور اس کی برداشت سے باہر تھا۔ میری سراسر غلطی پر تھی، سراسر۔ وہ اس سے بلند نہیں، مکمل اور عیب دار تھی۔ دونوں بہنیں علیحدہ ہو گئی تھیں۔ وہ اب بھی ایک دوسرے سے محبت کرتی تھیں اور زندگی بھر کرتی رہیں گی، لیکن ان کی راہیں جدا جدا تھیں۔ ضدی لوئیزا پر ایک نئی تنہائی غالب آ گئی اور اس کے چوڑے چہرے سے مستقل مزاجی ٹپکنے لگی۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق چل پڑی تھی: لیکن کدھر کو؟

وہ بالکل اکیلی تھی اور ایک خالی دنیا اس کے سامنے تھی۔ تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کوئی راہ اختیار کر لی تھی؟ اس کے باوجود وہ محبت کرنے کا، اپنے محبوب کو جیتنے کا عزم کر چکی تھی۔

7

جب اس کا لڑکا تین سال کا تھا تو میری کے ایک اور بچہ ہوا، ایک لڑکی۔ یہ تین سال، جو یکساں

Scanned with CamScanner

بے لطفی میں گزر رہے تھے، ابدیت کے برابر بھی ہو سکتے تھے اور نیند کے مانند تھوڑی دیر کے بھی، میری کو
پتا نہ تھا۔ بس، اس کے سر پر ہمیشہ ایک بوجھ سا تھا، کوئی ایسی شے جو اس کی زندگی پر دباؤ ڈال رہی تھی۔
ان سالوں کا واحد واقعہ میسی کا آپریشن تھا۔ وہ ہمیشہ سے بے حد نازک تھا۔ اس کی بیوی نے، فرض کے
ایک پہلو کے طور پر، جلد ہی مشین کی طرح اس کی تیمارداری کرنی سیکھ لی تھی۔

لیکن اس تیسرے سال، بچی کے پیدا ہونے کے بعد، میری نے خود کو افسردہ اور مضمحل پایا۔
کرسمس قریب آ گئی: پادری خانے کی افسردہ اور بے تنوع کرسمس، جہاں سال کے سارے دن ایک ہی
تیرہ سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے تھے، اور میری کو ڈر لگنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس پر تیرگی
چھائی جا رہی ہو۔

"ایڈورڈ، میں کرسمس کے موقعے پر گھر جانا پسند کروں گی"، اس نے کہا، اور یہ کہتے ہوئے
ایک طرح کا خوف اس کے دل میں بھر گیا۔

"لیکن تم بچی کو تو نہیں چھوڑ سکتیں"، اس کے شوہر نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

"ہم سب چلیں گے۔"

میسی نے سوچا اور اپنے احتجاجی انداز میں دیکھتا رہا۔

"تم کیوں جانا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ مجھے آب و ہوا کی تبدیلی ضرورت ہے۔ اس تبدیلی سے مجھے بھی فائدہ ہوگا اور دودھ
بھی بڑھے گا۔"

اس نے بیوی کی آواز میں ارادہ سنا اور ہٹپٹا گیا۔ میری کی بولی اس کے لیے ناقابل فہم تھی۔
لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے یہ محسوس کر لیا کہ میری جانے کا تہیہ کر چکی ہے۔ اور جب اس کی گود بھری
ہوتی تو، خواہ ایام حمل ہوتے یا ایام رضاعت، وہ اسے ایک خاص قسم کی مخلوق سمجھا کرتا تھا۔

"گاڑی میں لے جائیں گے تو بچی کو تکلیف تو نہیں ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

ماں نے جواب دیا: "نہیں، تکلیف کیوں ہوگی؟"

وہ روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں تھے تو برف پڑنے لگی۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے کی کھڑکی میں سے
چھوٹا پادری بڑے بڑے گالوں کو گرتے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے کھڑکی سے نظر آنے

Scanned with CamScanner

والے منظر پر پردہ ڈال دیا ہو۔ اس پر بچی کی فکر سوار تھی اور وہ ڈبے میں آنے والی ہوا سے خوفزدہ تھا۔

اس نے بیوی سے کہا: ''بالکل کونے میں بیٹھو اور بچی کو آڑ میں رکھو۔''

وہ اس کے کہنے پر اٹھ گئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ بیبی کی دائمی موجودگی اس کے ذہن پر آہنی وزن کے مانند تھی۔ لیکن اب اسے، کچھ دن کے لیے، کسی قدر محفوظ رہنے کی توقع تھی۔

باپ نے کہا: ''جیک، دوسری طرف جا کے بیٹھو۔ وہاں ہوا کم ہے۔ اس کھڑکی پر آ جاؤ۔''

وہ بچے کو تشویش سے دیکھتا رہا۔ لیکن دنیا بھر کے لوگوں میں فقط اس کے بچے ہی ایسے تھے جو اس کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔

''دیکھو، ممی، دیکھو!'' لڑکا چیخا: ''یہ اڑ اڑ کر میرے منھ پر آ رہے ہیں۔'' اس کا مطلب برف کے گالوں سے تھا۔

''اس کونے میں آ جاؤ!'' باپ نے یک دوسری دفعہ اپنی بات دہرائی۔

''پہلا دوسرے کی کمر پر چڑھ گیا، ممی، اور وہ سوار ہو کر نیچے جا رہے ہیں!'' لڑکا خوشی کے مارے اچھلتے ہوئے چلایا۔

چھوٹے آدمی نے بیوی کو حکم دیا: ''اس سے ادھر آنے کو کہو۔''

''جیک، اس کشن پر گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو!'' ماں نے، اپنا گورا ہاتھ اس جگہ پر رکھتے ہوئے، کہا۔ بچہ چپ چاپ، ماں کی بتائی ہوئی جگہ پر، کھسک آیا۔ ایک لمحے تک ساکت منتظر رہا، پھر تقریباً قصداً، آواز بگاڑ کر، چیخا: ''کونے میں، ممی، دیکھو انھیں، وہ ڈھیر لگا رہے ہیں۔'' کھڑکی کے شیشے پر ڈرامائی انداز میں انگلی چسپاں کر کے اس نے برف کے گالوں کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ اکڑ کے ماں کی طرف مڑا۔

''سب کا ڈھیر لگ رہا ہے!'' ماں نے کہا۔

بیبی میری کا چہرہ اور ردعمل دیکھ کر کچھ مطمئن سا ہو گیا۔ مبہم طور پر بے چین، اگر وہ اس کی توجہ حاصل کر لیتا تو مطمئن ہو جاتا۔

وہ ڈھائی بجے ورکرخانے پہنچے۔ انھوں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔

''کیا حال ہیں، ایڈورڈ؟'' سنڈلی نے، اپنی طرف سے پدرداری کا اظہار کرنے کی کوشش

کرتے ہوئے، کہا۔لیکن وہ اپنے داماد کے سامنے ہمیشہ ایک بناوٹی وضع میں، شکست خوردہ سا، ہوتا اور اسی لیے، جہاں تک ممکن تھا، اسے دیکھتا نہ اس کی بات سنتا۔ لنڈلی دبلا اور زرد رو اور بدخوراک نظر آ رہا تھا۔

اس کا سر بالکل سفید ہو گیا تھا۔ بہر حال، وہ مغرور اب بھی تھا لیکن، بچوں کے بڑے ہو جانے کے بعد، یہ غرور کڑکیلا ہو گیا تھا اور کسی وقت بھی خاک میں مل سکتا تھا، جس کے بعد اس کی حالت فلاکت زدہ اور قابل رحم ہو جاتی۔ مسز لنڈلی نے اپنی ساری توجہ بیٹی اور نواسے تو اسی پر مبذول رکھی، داماد کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ لوئیزا بچی پر خوش ہو کر، ہنس رہی تھی، اسے چمکار رہی تھی۔ میسی ایک طرف کھڑا تھا! ایک خمیدہ، نہ ہٹنے والی، منحنی شکل۔

''اہا، پیاری سی! پیاری سی منی! اہا، ایک برف سی، پیاری منی گاڑی میں آئی!'' سعید اونی چادروں کو ہٹا کر، بچی کو آگ کے سامنے کر کے، آتش دان کے آگے کی چٹائی پر جھکی ہوئی لوئیزا بچی کو پیار کر رہی تھی۔ چھوٹے پادری نے کہا: ''میری، میرے خیال میں بہتر یہ ہو گا کہ بچی کو گرم پانی سے نہلا دو: کہیں اسے سردی لگ جائے۔''

''میرے خیال میں تو ضروری نہیں:'' ماں نے آ کر ننھی بچی کے گلابی ہاتھ پیر، ماہرانہ انداز میں، ہاتھوں میں لے کر دیکھتے ہوئے کہا: ''اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے نہیں۔''

''ذرا بھی ٹھنڈے نہیں:'' لوئیزا بول پڑی۔ ''اسے سردی نہیں لگی ہے۔''

''میں جا کے اس کے کپڑے لے آتا ہوں:'' میسی نے ایک ہی خیال میں محو، کہا۔

''پھر میں اسے باورچی خانے میں نہلا دوں گی:'' میری نے بدلے ہوئے، سرد لہجے میں کہا۔ لوئیزا نے کہا: ''تم وہاں نہیں نہلا سکتیں۔ وہاں نوکرانی دھو دھلا رہی ہے۔ پھر یہ کہ دن کے اس وقت بچی کو نہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اچھا، بے نہلائے گی:'' میری نے متانت سے، اطاعت کی وجہ سے کہا۔ لوئیزا کو بڑا غصہ آیا اور وہ چپ ہو گئی۔ جب چھوٹا آدمی کپڑے بازو پر ڈالے دھیرے دھیرے نیچے اترا تو مسز لنڈلی نے پوچھا:

''ایڈورڈ، کیا بہتر نہ ہو گا جو گرم پانی سے تم نہا لو؟''

Scanned with CamScanner

لیکن چھوٹے پادری پر یہ طنز بیکار گئی۔ وہ بچی کے ارد گرد کی تیاریوں میں محو تھا۔

کمرہ بے رونق اور فرسودہ تھا اور باہر لان پر بکھری ہوئی، جھاڑیوں پر گچھوں کی طرح پڑی ہوئی سفید سفید برف اس کے مقابلے میں پری سی لگ رہی تھی۔ اندر بھاری بھاری تصویریں دیواروں پر، مبہم سی، لٹکی ہوئی تھیں اور جہاں آگ کی روشنی پڑ رہی تھی وہاں کے علاوہ ہر شے اندھیرے سے میلی میلی معلوم ہو رہی تھی۔

آگ کی روشنی میں، انھوں نے چٹائی پر نہانے کا ٹب رکھ دیا تھا۔ مسز میسی، اس کے کالے بال ہمیشہ کی طرح مرغولوں کی شکل میں سجے ہوئے اور شاہانہ، ربڑ کا پیش بند باندھے، لاتیں چلاتی ہوئی بچی کو پکڑے، ٹب کے پاس گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ شوہر پاس کھڑا، تولیوں اور بچی کے کپڑوں کو آگ پر گرم کر رہا تھا۔ لوئیزا اتنی ناراض تھی کہ بچی کو نہلانے کی خوشی میں حصہ نہ لے سکی تھی اور میز پر کھانا چن رہی تھی۔ لڑکا کواڑ کے دستے پر لٹکا ہو زور لگا رہا تھا کہ کھول کر باہر نکل جائے۔ باپ نے مڑ کر دیکھا۔

"دروازے سے ہٹ جاؤ، جیک۔" اس نے بغیر اثر کے کہا۔ جیک دستے کو اور زیادہ زور سے کھینچنے لگا، جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ میسی نے آنکھیں جھپکا کر اسے دیکھا۔

"میری، اسے دروازے سے ہٹ جانا چاہیے۔ اگر کواڑ کھل گئے تو ہوا آنے لگے گی،" اس نے کہا۔

ماں نے بجتی، چکیلی بچی کو، بڑی صفائی سے، گھٹنوں پر بچھے تولیے پر لٹاتے ہوئے کہا: "جیک، دروازے سے ہٹ جاؤ، پیارے،" اور پھر مڑ کر دیکھا: "جاؤ خالہ لوئیزا کو گاڑی کی باتیں بتاؤ۔"

لوئیزا ابھی دروازہ کھولنے سے خائف، چٹائی پر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ میسی بچی کے کپڑے لیے یوں کھڑا تھا جیسے کسی رسم کی ادائی میں حصہ لے رہا ہو۔ اگر سب پر ایسی خنگی نہ طاری ہوتی تو وہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا۔

"میں کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہتا ہوں،" جیک نے کہا۔ باپ نے فوراً مڑ کر دیکھا۔

"لوئیزا، تم اسے ذرا کرسی پر چڑھا دو گی،" میری نے جلدی سے کہا، کیونکہ باپ نازک ٹھیرا۔ جب بچی کو کپڑے پہنائے جا چکے تو میسی اوپر آ گیا اور چار تکیے لے کر واپس ہوا، جنھیں اس

نے آتش دان کے جنگلے میں، گرم کرنے کے لیے اڑا دیا۔ پھر وہ، اپنی بچی کے خیال میں گم، کھڑا ہو کر ماں کو دودھ پلاتے دیکھتا رہا۔ لوئیزا کھانے کی تیاری میں لگی رہی۔ وہ بتا نہیں سکتی تھی کہ آخر اتنی آزردگی سے خفا کیوں تھی۔

مسز لنڈلی، حسب معمول، لیٹی ہوئی، چپ چاپ سب کچھ دیکھتی رہی۔

میری بچی کو اوپر لے گئی، پیچھے پیچھے بکیے لے کر شوہر گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر نیچے اتر آیا۔

"میری کیا کر رہی ہے؟ وہ نیچے آ کر کھانا کیوں نہیں کھا لیتی؟" مسز لنڈلی نے دریافت کیا۔

"وہ بچی کے پاس ہے۔ کمرہ ذرا ٹھنڈا ہے۔ میں نوکرانی سے کہتا ہوں، اس میں آگ جلا دے۔" وہ محویت کے عالم میں دروازے کی طرف جا رہا تھا۔

"لیکن میری نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ ٹھنڈ تو اسے لگ جائے گی۔" ماں نے تنگ آ کر کہا۔

میسی کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے بات نہیں سنی۔ پھر بھی اس نے مڑ کر ساس کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "میں اس کے لیے کچھ لے جاؤں گا۔"

وہ باہر چلا گیا۔ مسز لنڈلی نے غصے میں آ کر صوفے پر کروٹ لی۔ لوئیزا نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں، کیونکہ میسی کے پاس سے اس گھر میں خرچ آتا تھا۔

لوئیزا اوپر گئی۔ اس کی بہن بستر کے پاس بیٹھی کاغذ کا ایک پرزہ پڑھ رہی تھی۔

"نیچے چل کر کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟" چھوٹی نے پوچھا۔

"ابھی آتی ہوں۔" میری نے ایسی پرسکون اور حکم آمیز آواز میں جواب دیا جس سے مترشح تھا کہ مزید گفتگو کی اجازت نہیں۔ اس بات سے لوئیزا بہت ناراض ہوئی۔ اس نے نیچے جا کر اپنی ماں کو سنایا۔

"میں باہر جا رہی ہوں۔ چائے کے وقت تک شاید نہ لوٹوں۔"

8

کسی نے اس کے جانے پر رائے زنی نہیں کی۔ اس نے اپنی سمور کی ٹوپی، جو گاؤں کے لوگوں کی خوب جانی پہچانی تھی اور پرانی 'نورفاک' جاکٹ پہن لی۔ لوئیزا چھوٹی اور گداز اور سادہ تھی۔ اس کا

چوڑا ٹکا ماں پر تھا، باپ کی سی اونچی پیشانی تھی، اور بھوری، متفکر آنکھیں اس کی اپنی تھیں، جو، جب وہ مسکراتی، تو بے حد خوشنما معلوم ہوتیں۔ لوگوں کی یہ بات درست تھی کہ وہ چڑچڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی دلکشی کا خاص پہلو اس کے چمکیلے، گھنے، گہرے سرخ بال تھے اور جس لطافت سے وہ چمکتے اور جھکتے تھے وہ اس پر بالکل اجنبی نہ لگتے تھے۔

باہر، برف میں نکل کر اس نے اپنے سے پوچھا: ''میں کہاں جا رہی ہوں؟'' بہر حال، وہ تھکی نہیں اور مشین کی طرح چلتے رہنے کے بعد اس نے خود کو پہاڑی سے پرانے ایڈ کروس کی جانب اترتے پایا۔ درختوں سے کالی وادی میں کوئلے کی کان، خرخراہٹ کے ساتھ، ہانپ ہانپ کر سانس لیتی ہوئی بھاپ کے، اوپر تک رستے رہنے والے، اونچے، بجڑولی بادل اگل رہی تھی، جو پہاڑیوں پر کی برف سے سفید لیکن پھر بھی، اس جامد فضا میں، سایہ آسا تھے۔ لوئیز اپنے دل میں یہ قبولنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ کدھر جا رہی ہے، حتیٰ کہ وہ ریل کے چوپڑ پر جا پہنچی۔ پھر باڑ کی طرف جھکے ہوئے سیب کے درخت کی ٹہنیوں پر پڑے برف کے گچھوں نے اسے بتایا کہ اسے مسز ڈیورینٹ کے پاس ضرور جانا چاہیے۔ درخت مسز ڈیورینٹ کے باغ میں تھا۔

الفرڈ اب پھر سے گھر پر تھا اور سڑک کے نیچے کی کاٹیج میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ سڑک کے کنارے کی باڑ اور ریل کے پھاٹک کے پاس سے برف سے ڈھکا باغ، کسی گڑھے کے کنارے کے مانند، عمودی ڈھلان میں شروع ہوتا تھا، اور ڈھلان کے اختتام پر چہار دیواری تھی۔ اس گہرائی میں گھر خوب محفوظ تھا اور اس کی چمنی بس سڑک جتنی اونچی تھی۔ لوئیز اینٹی سیڑھیاں اتری اور نیچے چھوٹے، پچھلے احاطے میں، دھندلے اور نیم پنہائی میں جا کھڑی ہوئی۔ ایک بڑا درخت اوپر، پارافین کی جھونپڑی پر جھکا ہوا تھا۔ لوئیز نے خود کو وہاں تمام دنیا سے محفوظ محسوس کیا۔ اس نے کھلے دروازے پر دستک دی اور پھر مڑ کر نظر دوڑائی۔ کان کی پرت کی جانب سے، اندر کو تنگ ہوتی ہوئی، باغ کی راس برف سے سفید تھی۔ اس نے برف ریزوں کے دبیز حاشیوں کا تصور کیا، جو وہاں ایک ماہ کے بعد، داکھ کی جھاڑیوں کے نیچے نظر آئیں گے۔ اس کے پیچھے، باغ کے کناروں پر آویزاں، پیاری پھولوں کی ژولیدہ پٹی، جو گرمیوں میں لوئیز کے چہرے کو سفید پھولوں سے چھو لیتی تھی، اب برف کے گالوں سے سفید ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ ان پھولوں کو توڑنا، جو اوپر سے کسی کے چہرے پر جھکے ہوئے

Scanned with CamScanner

ہوں، خوشگوار ہوتا ہے۔

اس نے دوبارہ دستک دی۔ اندر جھانکا تو باورچی خانے کی قرمزی دھک نظر آئی، آگ کی سرخ چمک اینٹوں کے فرش اور چینٹ کے چمکیلے گدوں پر پڑ رہی تھی۔ اندرونِ خانہ 'روزنی نظارے کے مانند جیتا جاگتا اور روشن تھا۔ لوئیزا نے باورچی خانے کے سامان کی کوٹھڑی، جس میں اب بھی ایک جنتری لٹکی ہوئی تھی، پار کی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ لوئیزا نے آہستہ سے آواز دی، ''مسز ڈیورینٹ، مسز ڈیورینٹ،'' وہ اینٹوں کی چبوتری چڑھ کر اگلے کمرے میں گئی، جہاں اب بھی چھوٹا سا دکان کا کاؤنٹر تھا اور تجارتی سامان کے بنڈل رکھے تھے۔ اس نے سیڑھی پر سے آواز دی۔ اب اسے پتا چل گیا کہ مسز ڈیورینٹ گھر میں نہیں تھی۔ وہ احاطے میں گئی، اور بڑھیا جدھر گئی تھی، باغ کے رستے پر ادھر ہی کو چل پڑی۔ وہ جھاڑیوں اور رس بھری کی چھڑیوں سے گزر کر کھلے میں آ گئی۔ سامنے کان کی ساری پرت تھی؛ ایک چوڑا باغ، سفید اور دھندلایا ہوا، سیاہ جھاڑیوں سے داغ دار، برف سے آدھا ڈھکا ہوا؛ بائیں طرف، بلندی پر، کان کی چھوٹی ریل گاڑی گھڑ گھڑ کرتی گزر رہی تھی۔ داہنی جانب، بالکل پیچھے، درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔

لوئیزا دائیں بائیں دیکھتی ہوئی، کھلی پگڈنڈی پر ہو لی، اور پھر وہ تشویش سے چیخ پڑی۔ بڑھیا، نیچے کھیت، برف سے ڈھکے کرم کلوں کے درمیان، بیٹھی دھیرے دھیرے ہل رہی تھی۔ لوئیزا دوڑ کر اس کے پاس گئی اور اسے چھوٹی، غیر ارادی چیخوں کے ساتھ، بسورتے ہوئے پایا۔

''کیا کر لیا آپ نے؟'' لوئیزا، گھٹنوں کے بل برف پر جھک کر چیخی۔

''میں نے... میں نے... میں ایک 'بروسل' کرم کلا اکھاڑ رہی تھی اور آہ! میرے اندر جیسے کچھ پھٹ گیا۔ تکلیف ہو رہی ہے—'' بسورنے کے دوران میں ہانپتے ہوئے، بڑھیا صدمے اور تکلیف کے مارے رو پڑی۔

''تکلیف ہو رہی ہے میرے یہاں... بڑی دیر سے... اور اب تو... ہائے، ہائے!'' وہ ہانپی، اس نے پہلو کو تھوڑے سے دبایا، جھکی، جیسے بے ہوش ہونے والی ہو۔ برف کے سامنے وہ بالکل پیلی نظر آ رہی تھی۔ لوئیزا نے اسے سہارا دیا۔

''کیا خیال ہے، اب آپ پیدل چل لیں گی؟'' اس نے پوچھا۔

"ہاں،" بڑھیا ہانپی۔

لوئیزا نے اس کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"کرم کلا اٹھا لو... مجھے یہ الفرڈ کے کھانے کے لیے چاہیے،" مسز ڈیورینٹ نے ہانپ کر کہا۔ لوئیزا نے کرم کلا اٹھا لیا اور بمشکل بڑھیا کو اندر لے گئی۔ وہاں اس نے اسے برانڈی دی، صوفے پر لٹا دیا اور کہنے لگی:

"میں ڈاکٹر کے پاس کسی کو بھیجنے جا رہی ہوں۔ ذرا ایک منٹ انتظار کیجیے۔"

نوجوان عورت بھاگ کر، سیڑھیاں چڑھ کے، سرائے میں پہنچی، جو چند گز کے فاصلے پر تھی۔ سرائے والی مس لوئیزا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"مسز ڈیورینٹ کے لیے فوراً کسی کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوا لیجیے،" اس نے کہا۔ اس کے تحکمانہ انداز میں کچھ ہانپ کی خو بو تھی۔

"کوئی بات ہو گئی کیا؟" سرائے والی فکرمند ہو کر بولی۔

لوئیزا نے سڑک کی طرف نظر ڈالی تو پنساری کے چھکڑے کو ایسٹ وڈ کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ بھاگ کر گئی، اور آدمی کو روک کر، اس سے کہہ دیا۔

جب لوئیزا واپس آئی تو مسز ڈیورینٹ، منھ پھیرے، صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔

"چلیے، میں آپ کو بستر پر لٹا دوں،" لوئیزا نے کہا۔ مسز ڈیورینٹ نے مزاحمت نہ کی۔

لوئیزا مزدور پیشہ لوگوں کے طور طریق سے واقف تھی۔ برتنوں کی الماری کی نچلی دراز میں اسے صافیاں اور فلالین کے جاے مل گئے۔ کان میں پہننے کے پرانے لباس سے اس نے تنور کے تختے اٹھائے اور انھیں لپیٹ لپاٹ کر بستر میں رکھ دیا۔ بیٹے کے بستر میں سے اس نے ایک کمبل نکالا، بھاگ کے نیچے آئی، اور اسے آگ کے سامنے کر دیا۔ پھر چھوٹی سی بڑھیا کے کپڑے اتار کر اسے اوپر لے گئی۔

"تم مجھے گرا دو گی، تم مجھے گرا دو گی،" مسز ڈیورینٹ چیخی۔

لوئیزا نے جواب نہیں دیا بلکہ اپنے بوجھ کو جلدی سے اٹھا کر لے گئی۔ وہ آگ نہ جلا سکی کیونکہ سونے کے کمرے میں آتش دان نہیں تھا اور فرش پلاستر کا تھا۔ چنانچہ وہ لیمپ اٹھا لائی اور اسے جلا کر

Scanned with CamScanner

ایک کونے میں رکھ دیا۔ "اس سے ہوا صاف ہو جائے گی" اس نے کہا۔
"ہاں" بڑھیا کراہی۔
لوئیزا دوڑ کر اور گرم کپڑے لے آئی اور تنور کے کپڑوں کی جگہ انھیں رکھ دیا۔ پھر اس نے بھوسے کی تھیلی بنا کر بڑھیا کے پہلو پر رکھ دی۔ پیٹ کے پہلو میں ایک بڑا سا گومڑا پڑ گیا تھا۔
جب درد ذرا ہلکا ہوا تو بڑھیا کراہ کر بولی، "مجھے بہت دن سے پتا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے، لیکن میں نے کچھ کہا نہیں۔ میں اپنے الفرڈ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔"
لوئیزا کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر "اپنے الفرڈ" کو کیوں بخشا جائے۔
"کیا بجا ہے؟" مغموم آواز آئی۔
"سوا چار۔"
"ہائے،" بڑھیا نے رونا مچایا، "وہ آدھے گھنٹے میں گھر آ جائے گا اور کھانا اس کے لیے تیار نہیں۔"
"میں کیے دیتی ہوں،" لوئیزا نے نرمی سے کہا۔
"ایک تو وہ کرم کلا ہے... اور نعمت خانے میں سے تمھیں گوشت مل جائے گا... اور ایک سیب سموسہ ہے جسے تم گرم کر سکتی ہو۔ لیکن یہ تم نہ کرنا!"
"پھر کون کرے گا؟" لوئیزا نے پوچھا۔
بیمار عورت نے کراہ کر کہا، "مجھے پتا نہیں۔" وہ یہ سوچنے کے قابل نہ تھی۔
لوئیزا نے کھانا پکا دیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے بڑی توجہ سے دیکھا بھالا۔ وہ بہت سنجیدہ معلوم ہو رہا تھا۔
"کیا بات ہے، ڈاکٹر صاحب؟" بڑھیا نے اس کی طرف بوڑھی، حسرت بھری نگاہوں سے، جن میں امید ابھی سے دم توڑ چکی تھی، دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"میرا خیال ہے کہ کسی رسولی کے گرد کی کھال پھٹ گئی ہے،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔
"ہاں،" اس نے بڑبڑا کر کہا اور منھ موڑ لیا۔
"دیکھیے، یہ کسی وقت بھی فوت ہو سکتی ہیں... اور ممکن ہے یہ رسولی ہی ٹھیک ہو جائے۔"

Scanned with CamScanner

بوڑھے ڈاکٹر نے لوئیزا سے کہا۔ جوان عورت دوبارہ اوپر گئی۔

"وہ کہتے ہیں ممکن ہے ورم اتر جائے اور آپ پھر سے بالکل صحت یاب ہو جائیں" اس نے پوچھا:

"آگ خوب تیز ہے؟"

"میرا خیال تو یہی ہے۔" لوئیزا نے جواب دیا۔

"اسے تیز آگ کی ضرورت ہوگی۔" ماں نے کہا۔ لوئیزا نے جا کے آگ کو دیکھا۔

ایورمنٹ کے انتقال کے بعد بیوہ چند ایک بار گرجا گئی تھی اور وہاں لوئیزا اس کے ساتھ لطف سے پیش آتی تھی۔ لڑکی کے دل میں ارادہ مستحکم تھا۔ الفرڈ ایورمنٹ کی طرح اور کسی آدمی نے اسے متاثر نہیں کیا تھا اور وہ اسی جیسے پر قائم تھی۔ دل میں وہ اس سے وابستہ تھی۔ اور الفرڈ کی قدرے درشت، محبت پرست ماں اور اس کے درمیان ایک فطری ہمدردی موجود تھی۔

بوڑھی عورت کے تمام بیٹوں میں الفرڈ سب سے زیادہ اقرب تھا۔ بہر حال، اور سب کی طرح تھا وہ بھی خود سر اور اپنی مرضی کا مالک۔ دوسرے لڑکوں کی طرح اس نے بھی سکول چھوڑتے ہی کان میں کام کرنے کے لیے اصرار کیا تھا کیونکہ جلد از جلد مرد بن جانے کی، دوسرے مردوں کا ہمسر ہونے کی صرف یہی صورت تھی۔ اس سے ماں بہت ناخوش ہوئی تھی۔ وہ اپنے آخری بیٹے کو شریف زادہ بنا دیکھنا چاہتی تھی۔

لیکن وہ ہمیشہ اس سے وابستہ رہا۔ ماں کی محبت کا احساس اس میں عمیق اور بے اظہار تھا۔ الفرڈ فوراً سمجھ جاتا تھا کہ کب ماں تھکی ہوئی ہے یا اس نے نئی ٹوپی پہنی ہے۔ اور کبھی کبھار وہ اس کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں بھی خرید لاتا تھا۔ لیکن وہ اتنی دانا تھی کہ یہ سمجھ سکتی کہ اس کی ذات لڑکے کو کتنا بڑا سہارا ہے۔

بظاہری طور پر وہ ماں کو مطمئن سا رکھتا تھا، وہ پوری طرح مرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی کتابیں پڑھنا بھی پسند کرتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ پکولو بجانے کا شوقین تھا۔ ٹھیک سر نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے سر کو جھٹکے سے اوپر اٹھتا دیکھ کر ماں کو مزہ آتا اور وہ اس کو مشفقانہ، تقریباً ترس کھا کر لیکن عزت سے دیکھے چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مرد ہو مستقل مزاج، اور عورت کو رازدار بنائے بغیر۔

اپنی ڈگر پر قائم رہے اور اسے معلوم تھا کہ الفرڈ اس کا دست نگر تھا۔ وہ گرجا میں سنگ میں گاتا، کیونکہ اسے گانے کا شوق تھا۔ گرمیوں میں باغ میں کام کرتا، مرغیوں اور سؤروں کی دیکھ بھال کرتا: اس نے کبوتر پال رکھے تھے، ہفتے کے دن کرکٹ یا فٹ بال کی ٹیم میں کھیلتا تھا۔ لیکن ماں کو اپنے دوسرے لڑکوں کی طرح آزاد آدمی نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس کا لاڈلا منا تھا، لیکن جہاں اس وجہ سے وہ اس سے محبت کرتی تھی، وہاں اس کو کچھ حقارت سے بھی دیکھتی تھی۔

ان میں آپس میں کچھ دشمنی پیدا ہو گئی۔ پھر الفرڈ نے، دوسروں کی طرح، شراب پینی شروع کر دی، مگر ان کی طرح نادانستہ اور نسیانی انداز میں نہیں پی، وہ تھوڑا خود آگاہ بھی تھا۔ ماں نے یہ دیکھا اور اس کی خود آگاہی پر ترس کھایا۔ سب سے زیادہ محبت الفرڈ سے تھی لیکن اس کی طرف سے وہ مطمئن نہ تھی، کیونکہ وہ اس سے آزاد نہ تھا۔ وہ اپنی من مانی کرنے ہی نہ پاتا تھا۔

پھر بیس سال کی عمر میں وہ بھاگ گیا اور اس نے بحریہ میں نوکری کی میعاد پوری کی، جس نے اسے پوری طرح مرد بنا دیا۔ نوکری اور ماتحتی سے وہ شدت سے نفرت کرتا رہا۔ سال ہا سال، خودداری کی خاطر، اپنے آپ سے جدوجہد کی، دیوانہ وار غصے اور شرم اور محذوف کر دینے والے احساسِ کمتری سے بمشکل جان چھڑائی۔ ذلت و خواری اور خود سے نفرت کے راستے سے وہ ایک طرح کی باطنی آزادی تک پہنچ گیا۔ جس ماں کو اس نے اپنا معیارِ کامل قرار دے رکھا تھا، اس سے محبت اس کے لیے امید اور یقین کی سچائی بنی رہی۔

وہ تقریباً تیس سال کا ہو کے گھر لوٹا، لیکن کسی لڑکے کی طرح بھولا اور ناتجربہ کار: اس میں نئی بات بس اس کی خاموشی تھی زندگی کے حضور میں ایک طرح کی گنگ عاجزی، جینے کا خوف۔ وہ قریب قریب بالکل پاک دامن تھا۔ ایک شدید حساسیت نے اسے عورتوں سے دور رکھا تھا۔ مردوں کا آپس میں جنسی گفتگو کرنا بالکل درست تھا لیکن اس کا اطلاق جیتی جاگتی عورتوں پر کسی طرح نہ ہوتا تھا۔ الفرڈ کے لیے دو باتیں تھیں عورت کا تصور، جس سے وہ اکثر عیاشی کیا کرتا تھا، اور اصل عورت، جس کے آگے اسے بہت گہری بے کلی اور پرے ہٹ جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی تھی۔ وہ ہر عورت کے قرب سے خود کو بچاتا، جھجکتا، اور پھر شرمندگی محسوس کرتا۔ اپنی عمیق ترین روح میں اسے احساس ہوتا کہ وہ مرد نہیں تھا، ایک معمولی مرد سے کمتر تھا۔ ایک دفعہ جنیوا میں وہ ایک انڈر آفیسر کے ساتھ ایک

شراب خانے میں گیا، جہاں سستی قسم کی کسبی لڑکیاں عشق بازوں کی تلاش میں آیا کرتی تھیں۔ وہ وہاں شراب کا جام لیے بیٹھا رہا۔ لڑکیوں نے اس کی طرف دیکھا، لیکن پاس نہ آئیں۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اس کے پاس آتیں تو وہ صرف ان کو کھلا پلا سکتا تھا، کیونکہ اسے ان پر ترس آتا تھا اور یہ تشویش تھی کہ کہیں وہ زندگی کی اچھی ضروریات سے محروم نہ ہوں، لیکن ان کے ساتھ جانا اس کے امکان سے باہر تھا۔ اسے یہ علم تھا اور وہ منفعل تھا، اور ایک عجیب رشک سے اکڑ باز، آسانی سے عشق کے جو میں آجانے والے اطالوی کو دیکھتا رہا، جس کا جسم، جبلی، غیر ذہنی کشش، عورت کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ وہ مرد تھے، وہ مرد نہیں تھا۔ وہ بیٹھا، خود کو پست اور کوڑھی سا محسوس کرتا رہا۔ اور وہاں سے، تصور میں، خود کو ایک عورت کے ساتھ جنسی حرکتیں کرتے دیکھتا ہوا اٹھا اور اثنائے راہ میں اسی شغل میں محو رہا۔ لیکن جب رضامند عورت نے خود کو پیش کیا تو اسی امر نے کہ وہ ملس دار عورت تھی، ناممکن بنا دیا کہ الفرڈ اس کو چھو بھی سکے۔ اور یہ نا قابلیت اس میں بوسیدگی کے ایک مرکز کے مانند تھی۔

چنانچہ، بدیس میں، وہ کئی مرتبہ، ساتھیوں کے ہمراہ، مخمور، لائسنس یافتہ چکلوں میں گیا۔ لیکن اس تجربے کے ذلیل مہمل پن نے اسے ڈرا دیا۔ دراصل، وہ کچھ بھی نہیں تھا، وہ بے معنی تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ جسمانی نہیں روحانی طور پر نامرد تھا۔ حقیقت میں نامرد نہیں، بالطبع ایسا تھا۔

اس نامعلوم، بے بخشیدہ، اذیت پہنچانے والے نفس کے تخلی، غیر تغیر پذیر بوجھ کو لیے وہ گھر واپس آیا۔ بحری تربیت نے اس کی جسمانی صحت کو مکمل بنا دیا تھا۔ اسے اپنے جسم پر فخر بھی تھا اور اس سے آگاہی بھی تھی۔ وہ نپ کر، ڈمبلوں کے استعمال سے، اپنے آپ کو چست رکھتا، کرکٹ اور فٹ بال کھیلتا، کتابیں پڑھتا، فاضلوں سے حاصل کردہ راسخ خیالات رکھنے لگا تھا۔ پکولو بجاتا تھا اور اس کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس کی روح کی تہہ میں خفت اور ادھورے پن کا گھن ہمیشہ لگا رہتا۔ اپنی صحت مند خوش مزاجی کے باوجود وہ دل میں ناشاد تھا، اپنے تمام اعتماد اور خیالات کی برتری کے ساتھ بے چین تھا، اور حقیر محسوس کرتا تھا۔ اپنی ذات سے آزاد ہونے کے لیے، اس خود آگاہی کی خفت سے رہا ہونے کی خاطر، وہ کسی برے وحشی سے جگہ بدل لیتا۔ وہ کسی کان کن کو، ذاتی تسکین کی تلاش میں، بغیر وسوسوں کے لڑکھڑاتے ہوئے، سیدھا بڑھتا دیکھتا تو اس پر رشک کرتا۔ وہ اس خود روی اور کورانہ اطمینان کے حصول کے واسطے، جو سیدھی تسکین کا رخ کرتی ہے، ہر شے دے سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

9

کان کنی سے وہ ناخوش نہیں تھا۔ لوگ اس کے دلدادہ تھے اور وہ کافی مقبول تھا۔ اچھے اور دوسروں کے درمیان فرق صرف اسے ہی محسوس ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنا کلنک چھپائے ہوئے ہے۔ لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ دوسرے اسے بدھو اور کمتر مرد سمجھ کر حقارت سے نہیں دیکھتے۔ وہ اسی لیے خود کو زیادہ مردانہ ظاہر کرتا تھا اور جس آسانی سے دوسرے فریب میں آگئے تھے اس سے بہت متعجب ہوا تھا۔ اور چونکہ طبعاً خوش مزاج تھا، کام کرتے ہوئے خوش رہتا تھا۔ کام میں وہ اپنی طرف سے زیادہ متیقن تھا۔ کمر تک برہنہ، مشقت سے تپیدہ اور میلے کچیلے، وہ، سیفٹی لیمپوں کی روشنی میں ایک دوسرے کو غیر واضح ساد یکھتے ہوئے، کچھ منٹوں کے لیے اکڑوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے اور ان کے اردگرد کالے کوئلے کی پرتیں آگے کو نکلی، اور اس نیچے، سیاہ اور بے حد اندھیرے مندر میں لکڑی کی ٹیکیں، چھوٹے ستونوں کی طرح، کھڑی ہوتیں۔ پھر یا بو کے ساتھ، ان کی ٹولی کا چھوکرا، سات نمبر سے کوئی پیام یا گھوڑوں کے کونڈے سے بھر کر پانی کی بوتل یا اوپر کی دنیا کی کوئی خبر لے کر آجاتا۔ دن کافی خوشگواری سے کٹ جاتا تھا۔ زمین دوز دن میں ایک طرح کا اطمینان، جو جی میں آئے کر و والی کیفیت تھی، ایسے آدمیوں کی پُر لطف رفاقت تھی جو، باقی تمام دنیا سے علیحدہ، ایک پُر خطر جگہ میں اکیلے بند تھے، طرح طرح کا کام تھا۔ کان کھودنا، کوئلہ لادنا اور ٹیکیں لگانا؛ فضا میں مبہم جوئی اور اسرار کا حسن تھا؛ اور ان باتوں سے اس کو، کھلی فضا اور سمندر کی آرزو کی چبھن پر دوبارہ قابو پالینے کے بعد، کان بالکل غیر دلچسپ نہ معلوم ہوتی تھی۔

اس دن کا کام بہت تھا اور ڈیورینٹ کی باتیں کرنے کو طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ سارے سہ پہر چپ چاپ کام کرتا رہا۔ چھٹی کا وقت آیا اور وہ سب چلتے ہوئے کان کے چینے میں پہنچ گئے۔ سفیدی پھراز مین دوز دفتر خوب چمک رہا تھا۔ آدمی اپنے اپنے لیمپ گل کر رہے تھے اور بارہ بارہ کی ٹولیوں میں عمودی سرنگ کے نچلے سرے پر بیٹھے تھے، اور اوپر سے پانی کی کالی، بڑی بڑی بوندیں، مسلسل نچلی آبی پرت میں گر رہی تھیں۔ زمین دوز بڑی سڑک پر، دور، بجلی کے قمقمے روشن تھے۔

"مینھ برس رہا ہے؟" ڈیورینٹ نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"برف باری،" ایک بوڑھے نے کہا اور جوان کو یہ سن کر مسرت ہوئی۔ وہ برف باری کے موقعے پر اوپر جانا پسند کرتا تھا۔

"کرسمس کے لیے یہ ٹھیک رہے گا بالکل،" بوڑھے نے کہا۔

"ہاں،" ڈیورینٹ نے جواب دیا۔

"ہرا کرسمس، بھرا قبرستان،" بوڑھے نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ڈیورینٹ ہنسا اور اس کے قدرے نکیلے، چھوٹے دانت نمایاں ہو گئے۔

کھٹولا نیچے آیا اور بارہ آدمی چڑھ گئے۔ ڈیورینٹ نے زنجیر کی باریک چھیدوں والی محرابی چھت پر برف کے گچھے دیکھے اور خوش ہوا۔ وہ حیران تھا کہ برف کو یہ زمین دوز سیر کیسی لگی ہوگی۔ لیکن برف بھی سے کالے پانی میں تر بتر ہو گئی تھی۔

اسے اپنے گرد و پیش کی چیزیں پسند تھیں۔ اس کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس کے نیچے وہی زوالی خود آگاہی تھی جو اپنے میں محسوس کرتا تھا۔

برف کی جھمک کی وجہ سے اوپر کی دنیا تقریباً ایک چمک کے ساتھ نمودار ہوئی۔ کنارے کنارے بالی بال چلتے ہوئے، لیمپ کو دفتر میں چھوڑتے ہوئے، اپنے چاروں طرف پھرے، برف سے جھلملاتا ہوا ماحول محسوس کر کے، وہ مسکرایا۔ دونوں جانب پہاڑیاں، جھٹپٹے میں، ہلکی نیلی اور جھاڑیاں جنگلی اور تاریک نظر آ رہی تھیں۔

ریل کی پٹڑیوں کے درمیان کی برف پامال ہو چکی تھی۔ لیکن، بہت آگے، گھر جانے والے کان کنوں کی سیاہ شکلوں سے پرے، وہ بے ہموار اور بنی کی کالی دیوار تک پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی سمت میں ایک گلابی پن تھا، اور ایک بڑا سا تارہ، نیم آشکارا، معلق تھا۔ نیچے، عمارتوں کی سیاہی میں کان کی بتیاں بالکل صاف اور پیلی نظر آ رہی تھیں اور نیلگوں جھٹپٹے میں پرانے ایڈ کروس کی روشنیاں قطاروں میں ٹمٹما رہی تھیں۔

ڈیورینٹ، زندگی سے مسرور، کان کنوں کے درمیان، جو برف کی وجہ سے بڑے زور شور سے بتیا رہے تھے، چل رہا۔ اسے ان کا ساتھ پسند تھا۔ یہ سفید، نیم تاریک، دنیا پسند تھی۔ باغ کے دروازے پر رک کر، گھر کی روشنی کو نیچے، خاموش، نیلے برف پر چمکتے دیکھ کر اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

Scanned with CamScanner

10

ریل کے بڑے پھاٹک کے پاس، جنگلے میں، ایک چھوٹا دروازہ تھا جسے وہ مقفل رکھتا تھا۔ اسے کھولتے ہوئے وہ باورچی خانے کی روشنی کو دیکھتا رہا، جو باہر جھاڑیوں اور برف پر پڑ رہی تھی۔ روشنی موم بتی کی ہے، جسے رات ہونے تک کے لیے جلایا گیا ہے، اس نے دل میں سوچا۔ وہ ڈھلواں راستے پر پھسلتا ہوا نیچے جا پہنچا۔ ہموار برف پر پہلے نشان ڈالنا اسے اچھا لگتا تھا۔ پھر وہ جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا گھر تک آ گیا۔ دونوں عورتوں نے باہر، جوتے صاف کرنے کی جگہ پر، اس کے بھاری بوٹوں کی کھٹک، اور جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کی آواز سنی:

''اس موم بتی سے تم نے کتنے کا تیل بچانے کی سوچی ہے، ماں؟'' اسے لیمپ کی اچھی روشنی پسند تھی۔

اس نے اپنی بوتل اور کھانے کا تھیلا نیچے رکھا ہی تھا اور باورچی خانے کی کوٹھری کے دروازے کے پیچھے اپنا کوٹ لٹکا رہا تھا کہ لوئیزا نے اسے آ لیا۔ وہ چونک گیا، مگر مسکرا دیا۔

اس کی آنکھوں میں ہنسی آئی — پھر یک لخت اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور وہ ڈر گیا۔

''تمھاری والدہ کو ایک حادثہ پیش آ گیا،'' لوئیزا نے کہا۔

''کیسے؟'' وہ بول اٹھا۔

''باغ میں،'' لوئیزا نے جواب دیا۔ وہ کوٹ کو ہاتھ میں لیے جھجکا، پھر اسے لٹکا دیا اور باورچی خانے کا رخ کیا۔

''وہ بستر میں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں،'' لوئیزا نے کہا، ''اسے الفریڈ کو دھوکے میں رکھنے میں مشکل محسوس ہوئی۔ وہ خاموش تھا۔

وہ باورچی خانے میں جا کر، دھم سے باپ کی پرانی کرسی پر بیٹھ گیا اور جوتے اتارنے لگا۔ اس کا سر چھوٹا اور کسی قدر خوش قطع تھا۔ اس کے گھنے، سخت اور بھورے بال چاہے کچھ بھی ہو جاتا، خوبصورت ہی نظر آتے۔ وہ کورموش کی کھال کی بھاری پتلون پہنے ہوئے تھا، جس سے کان کی باسی، ماندہ بو آ رہی تھی۔ چپل پہن کر وہ جوتے باورچی خانے میں لے گیا۔

Scanned with CamScanner

''کیا تکلیف ہے؟'' خوفزدہ، اس نے دریافت کیا۔

''کچھ اندرونی شکایت ہے،'' لوئیزا نے جواب دیا۔

وہ اوپر گیا۔ اس کی ماں نے اس کی آمد کے لیے خود کو سنبھالے رکھا۔ لوئیزا نے اوپر، سونے کے کمرے کا پلاستر کا فرش اس کے قدموں تلے ہلتا محسوس کیا۔

''تم نے کیا کر لیا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا، میرے بچے،'' بڑھیا نے کسی قدر درشتی سے، کہا، ''کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میرے لال، جو شکایت مجھے کل تھی یا پچھلے ہفتے تھی، وہی اب بھی ہے، اور کچھ نہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''تم کر کیا رہی تھیں؟'' بیٹے نے پوچھا۔

''میں ایک کرم کلا اکھاڑ رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ میں نے زیادہ زور لگایا؛ کیونکہ، اف، ایک دم ایسی تکلیف ہوئی۔''

بیٹے نے جلدی سے اس کی طرف دیکھا۔ ماں نے اپنے جی کو کڑا کر لیا۔

''لیکن یوں اچانک تکلیف، کبھی کبھی، کسے نہیں ہوتی، بیٹے؟ ہم سب کو ہوتی ہے۔''

''اور اس سے ہوا کیا ہے؟''

''مجھے پتا نہیں،'' وہ بولی، ''لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔''

کونے میں رکھے ہوئے بڑے لیمپ پر گہرے کاہی رنگ کا لیمپ پوش تھا، اس لیے وہ ماں کا چہرہ مشکل سے دیکھ سکتا تھا۔ اندیشے اور بہت سے جذبات کی وجہ سے وہ انتہائی بے کل تھا۔ پھر اس کی تیوری پر بل پڑے۔

اس نے پوچھا، ''کرم کلوں کے پیچھے اپنی جان ہلکان کرنے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ زمین سردی سے جمی ہوئی ہے؟ تم اپنے کو کھینچے کھینچے پھرتی رہو گی، چاہے مر جاؤ۔''

''کسی نہ کسی کو انھیں اکھاڑنا تھا،'' اس نے کہا۔

''تمہیں خود کو ضرر پہنچانے کی ضرورت نہیں۔''

لیکن ان کی گفتگو بے نتیجہ تھی۔

نیچے لوئیزا ان کی ہر بات صاف سن سکتی تھی۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ ان کی حالت آپس میں اتنی مایوس کن معلوم ہوتی تھی۔

''کیا تمھیں یقین ہے کہ تکلیف زیادہ نہیں، ماں؟'' ایک مختصر خاموشی کے بعد اس نے التجا کے ساتھ، پوچھا۔

''ہاں، زیادہ نہیں،'' بڑھیا نے کچھ ناخوشی سے کہا۔

''تمھیں پتا ہے، میں نہیں چاہتا کہ... کہ تمھاری بیماری بڑھے۔''

''جاؤ، جا کے کھانا کھاؤ،'' ماں بولی، جسے معلوم تھا کہ وہ مرنے والی ہے۔ مزید یہ کہ اس وقت درد کی شدت اسے اس کا برا حال تھا۔ ''میں بوڑھی عورت ہوں۔ اس لیے ذرا سی بات ہو جائے تو لوگ میرے ناز اٹھانے لگتے ہیں۔ مس لوئیزا بہت اچھی ہے اور اس نے تمھارا کھانا تیار کر دیا ہوگا، اس لیے بہتر ہے کہ تم جا کر کھا لو۔''

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بیوقوف اور شرمندہ ہو۔ ماں نے اسے ٹال دیا تھا۔ چلے آنے کے سوا اب چارہ نہ تھا۔ دکھ اس کے دل میں سلگ رہا تھا۔ وہ نیچے چلا گیا۔ ماں اس کے جانے سے خوش تھی، وہ اب زور زور سے کراہ سکتی تھی۔

الفرڈ نے نہانے سے پہلے کھانا کھانے کی پرانی عادت پھر سے اختیار کر لی تھی۔ لوئیزا نے کھانا چن دیا۔ یہ کام اس کے لیے نرالا اور دلچسپ تھا۔ الفرڈ اور اس کی ماں کو سمجھنے کی کوشش میں وہ بہت کشاکش میں گرفتار تھی۔ وہ اسے بیٹھی دیکھتی رہی۔ وہ کھانے سے منھ موڑے، آگ کو تک رہا تھا۔ لوئیزا کی روح، یہ سمجھنے کی کوشش میں کہ وہ کیا تھا، اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا کالا چہرہ اور بازو گنوارو تھے، وہ خود اجنبی تھا۔ اس کے چہرے پر کوئلے کی خاک کی سیاہ نقاب تھی۔ وہ اسے دیکھ سکتی تھی نہ سمجھ سکتی تھی۔ بھوری پلکیں، اہل آنکھیں، بند منھ کے اوپر بھدی، چھوٹی مونچھیں بس یہی جانی پہچانی نشانیاں تھیں۔ وہ خود کون تھا، جو کان کی کثافت میں آلودہ وہاں بیٹھا تھا؟ وہ اسے نہیں دیکھ سکتی تھی اور اس بات سے اسے دکھ پہنچ رہا تھا۔

وہ بھاگ کر اوپر گئی اور ذرا سی دیر میں بھوسے کی تھیلی اور چادروں کو، گرم کرنے کے لیے، نیچے لے آئی، کیونکہ درد پھر سے ہونے لگا تھا۔ وہ آدھا کھانا کھا چکا تھا۔ اچانک مشتاق کر، اس نے کانٹا چھوڑ

دیا۔

''ان سے درد کو آرام ملے گا،'' وہ بولی۔ الفرڈ، بیکار اور فروگذاشتہ، دیکھتا رہا۔

''کیا اس کی حالت خراب ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال تو یہی ہے،'' لوئیزا نے جواب دیا۔

اس کے لیے اٹھنا یا رائے دینا بیکار تھا۔ لوئیزا مصروف تھی۔ وہ اوپر گئی۔ بے چاری بڑھیا، درد کے مارے، ایک سفید، سرد پسینے میں تر تھی۔ اس کی تیمارداری کرتے ہوئے لوئیزا کا منہ چڑھا رہا۔ پھر وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

آہستہ آہستہ درد کم ہوا، بڑھیا پر بے ہوشی سی طاری ہوگئی۔ لوئیزا حسب دستور، چپ چاپ، بستر کے پاس بیٹھی تھی اس نے نیچے پانی گرنے کی آواز سنی۔ پھر بوڑھی ماں کی دھیمی، لیکن چپ نہ ہونے والی آواز آئی

''الفرڈ نہا رہا ہے۔ وہ اپنی کمر دھلوانا چاہے گا۔''

لوئیزا متردد ہو کر سنتی رہی۔ وہ حیران تھی کہ بیمار عورت کیا چاہتی تھی۔

''اگر اس کی کمر نہ دھلے تو وہ برداشت نہیں کر سکتا،'' بڑھیا، الفرڈ کی ضرورتوں پر ایک ظالمانہ توجہ کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہی۔

لوئیزا نے اٹھ کر اس کے پیلے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور نرمی سے کہا، ''میں نیچے جاتی ہوں۔''

''اگر مہربانی کرو،'' بیمار عورت بڑبڑائی۔

لوئیزا نے ایک لمحے انتظار کیا۔ مسز ڈیورینٹ نے، اپنا فرض پورا کر کے، آنکھیں بند کر لیں۔ لوئیزا نیچے گئی۔ خود اس کی یا الفرڈ کی کیا اہمیت تھی؟ صرف بیمار عورت کا کہا پورا کرنا ضروری تھا۔

الفرڈ، کمر تک برہنہ، آتش دان کی چٹائی پر گھٹنے ٹیکے، مٹی کے ایک بڑے ٹب میں اپنا بدن دھو رہا تھا۔ ہر شام کو، کھانا کھانے کے بعد، اس کا یہی معمول تھا۔ اس سے پہلے، اس کے بھائی بھی یہی کرتے رہے تھے۔ لیکن لوئیزا گھر میں اجنبی تھی۔

ایک مسلسل، لاشعوری حرکت کے ساتھ، وہ مشین کی طرح سر پر سفید جھاگ مل رہا تھا، اس کا ہاتھ ہر تھوڑی دیر بعد گردن پر سے گزرتا تھا۔ لوئیزا کھڑی دیکھتی رہی۔ اسے اس بات کے لیے بھی جی

کڑا کرنا پڑا۔ الفرڈ نے اپنا سر پانی میں جھکا دیا، صابن کا جھاگ دھو ڈالا اور مل مل کر آنکھوں سے پانی نکال دیا۔

''تمہاری والدہ نے کہا ہے کہ تم پیٹھ کمر دھلوانا چاہو گے،'' وہ بولی۔

مسلسل کی روزمرہ کی زندگی کے مقررہ کاموں میں حصہ لینے سے اسے دکھ پہنچنا کتنا عجیب تھا! لوئیزا نے محسوس کیا کہ اس تقریباً گھناؤنی بے تکلفی میں اسے زبردستی شریک کیا جا رہا ہے۔ یہ اس قدر عامیانہ اور اجتماعی تھی۔ وہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھی۔

الفرڈ نے جھکا ہوا سر گھما کر نہایت ہی مضحک طرح سے اس کی طرف دیکھا۔ لوئیزا کو اپنا دل کڑا کرنا پڑا۔ ''الٹے منہ یہ کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے،'' لوئیزا نے سوچا۔ آخر لوئیزا اور عام لوگوں میں فرق تو تھا ہی۔ جس پانی میں اس کے بازو ڈوبے ہوئے تھے وہ بالکل سیاہ تھا اور صابن کا جھاگ سیاہی مائل تھا۔ وہ اس کو بمشکل انسان تصور کر سکتی تھی۔ عادت کے زیر اثر، مشینانہ، اس نے سیاہ پانی میں ٹٹولا اور صابن اور جھاڑن نکال کر پیچھے لوئیزا کو تھما دی۔ پھر وہ جسم اکڑائے ہوئے، فرمانبردارانہ جھکا رہا۔ اس کے دونوں بازو، اس کے کندھوں کے بوجھ کو سہارے، ٹب میں تھے۔ اس کی جلد حسین طور پر گوری اور بے داغ تھی، اس میں ایک طرح کا غیر شفاف، یکساں گوراپن تھا۔ بتدریج لوئیزا کو اس کا احساس ہوا۔ یہ بھی الفرڈ کا ایک پہلو تھا۔ اس نے لوئیزا کو مسحور کیا اور اس کے دل سے علیحدگی کا احساس مٹ گیا۔ وہ ماں اور بیٹے کی قربت سے جھجکنے سے باز آ گئی۔ وہ جیتا جاگتا مرکز اس کے سامنے تھا۔ اس کا دل دہک اٹھا۔ اس حسین، صاف، مردانے جسم میں وہ کسی منزل تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک پاک، غیر ذاتی گرمجوشی سے اس سے محبت کی۔ لیکن اس کے دھوپ جلے، سرخی مائل کان اور گردن وہ زیادہ ذاتی اور زیادہ عجیب تھے۔ لوئیزا میں ایک شفقت جاگی، اسے الفرڈ کے عجیب سے کانوں پر بھی پیار آیا۔ وہ اس کے لیے ایک شخص — ایک بہت بے تکلف ہستی تھا۔ اس نے تولیہ نیچے رکھ دیا اور، دل میں مضطرب، دوبارہ اوپر چلی گئی۔ اس نے زندگی میں صرف ایک انسان کو سمجھا تھا — اور وہ میری تھی۔ باقی سب اجنبی تھے۔ اب اس کی روح، ابھرنے والی تھی، وہ ایک اور انسان کو سمجھنے والی تھی۔ اس نے عجیب اور حیرت خیز محسوس کیا۔

''اسے زیادہ آرام ملے گا،'' بڑھیا نے، لوئیزا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی، مجرمانہ پن سے کہا۔

کہا۔ لوئیزا نے جواب نہ دیا۔ اس کا دل اپنی ذمہ داریوں سے گراں بار تھا۔ مسز ڈیورینٹ کچھ دیر چپ لیٹی رہی، پھر مغموم لہجے میں بڑبڑائی۔

"آپ برا نہ ماننا، مس لوئیزا۔"

"میں کیوں برا ماننے لگی؟" لوئیزا نے، بہت متاثر ہوکر، جواب دیا۔

"ہم انھی باتوں کے عادی ہیں،" بڑھیا نے کہا۔

اور لوئیزا نے ایک بار پھر خود کو ان کی زندگی سے باہر محسوس کیا۔ وہ دکھ بھری بیٹھی رہی، اور ناامیدی کے آنسو، قطرہ قطرہ، اس کے دل میں جمع ہوتے رہے۔ کیا بات نہیں ختم ہوگئی؟

الفرڈ اوپر آیا۔ اب وہ صاف ستھرا تھا اور صرف قمیص پہنے ہوئے تھا اور کاریگر معلوم ہو رہا تھا۔ لوئیزا نے محسوس کیا کہ وہ اور الفرڈ اجنبی تھے اور ان کی زندگیاں بالکل مختلف تھیں۔ اس احساس نے پھر اسے اداس کر دیا۔ کاش کہ وہ کسی طرح کوئی زیادہ پائیدار تعلق، کوئی یقینی اور قائم رہنے والا رشتہ تلاش کر سکتی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس نے ماں سے پوچھا۔

"پہلے سے کچھ بہتر ہے،" ماں نے ماندگی سے، غیر ذاتی طور پر، جواب دیا۔ خود کو بالکل علیحدہ کر لینا اور بیٹے کو جواب میں صرف وہی بتانا جو وہ سمجھتی تھی کہ اس کے لیے بھلا ہے — اس عجیب بے تعلق کے انداز نے، ماں اور بیٹے کے تعلقات کو، لوئیزا کی نظروں میں، اور بھی محدود اور دلدوز بنا دیا۔ اس سے مرد اتنا غیر موثر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا۔ لوئیزا یوں ٹوٹنے لگی جیسے اسے کھو بیٹھی ہو۔ ماں تو حقیقی و مثبت تھی — لیکن بیٹا پھر اتنا حقیقی نہیں تھا۔ اس بات نے لوئیزا کو حیران اور افسردہ کر دیا۔

"بہتر ہے کہ میں مسز ہیریسن کو بلا لاؤں،" اس نے کہا اور ماں کے فیصلے کا منتظر رہا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی نہ کسی کو تو ہمیں بلانا ہی پڑے گا،" ماں نے جواب دیا۔

ان کے معاملے میں دخل دینے سے خائف، لوئیزا پاس کھڑی تھی۔ انھوں نے اسے اپنی زندگیوں میں شریک نہیں کیا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ محض باہر سے آنے والی مدد تھی، اس کے علاوہ اس کا ان سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ان کے لیے بالکل غیر تھی — اس لاشعوری فرق کے سامنے لوئیزا بے بس تھی اور اس سے اسے دکھ پہنچا تھا۔ لیکن اس کے اندر کسی صابر اور ہمت نہ ہارنے والی شے

نے اس کے منہ سے کہلوایا:

"میں یہاں ٹھہروں گی اور تیمارداری کروں گی۔ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

وہ دونوں محجوب سے ہو گئے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔

"ہم، جس طرح بھی بن پڑا، کسی کو بلا لیں گے،" بڑھیا نے اکتا کر کہا۔ اب اسے پروا نہ تھی، کچھ بھی ہوتا رہے۔

"بہر حال، صبح تک تو میں یہاں ٹھہروں گی،" لوئیزا نے کہا، "پھر دیکھا جائے گا۔"

"مجھے یقین ہے تمھیں خود کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں،" بڑھیا کراہی۔ مگر اسے اپنے آپ کو میرے سپرد کرنا ہی ہوگا۔

لوئیزا خوش تھی کہ اسے، عہدہ دارانہ طور پر ہی سہی، شریک تو کر لیا گیا۔ وہ ان کی زندگی میں شرکت کرنا چاہتی تھی۔ گھر پر اس کی ضرورت ہوگی، اب میری جو آ گئی تھی۔ لیکن انھیں اس کے بغیر کام چلانا پڑے گا۔

"مجھے وکرخانے ایک رقعہ بھیج دینا چاہیے،" اس نے کہا۔

س کا حکم بجا لانے کے لیے الفرڈ ڈیورینٹ نے اس کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ بحریہ میں کام کرنے کے بعد سے وہ بہ ذہانت مستعدی کے ساتھ خدمات انجام دینے کو تیار رہا کرتا تھا۔ لیکن اس کی رضامندی میں ایک سادہ آزادی تھی، جس سے لوئیزا کو محبت تھی۔ اس کے باوجود لوئیزا یہ محسوس کرتی تھی کہ الفرڈ کو جیتنا کارے دارد تھا۔ وہ اتنا مودب تھا؛ اس کی بات میں حکم کا خفیف سا اشارہ بھی مضمر پاتا تو فوراً اسے بجا لانے پر تیار ہو جاتا، کہ لوئیزا اس کے اندر کے مرد تک پہنچ ہی نہ پاتی تھی۔

الفرڈ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ لوئیزا نے خیال کیا کہ اس کی آنکھیں سنہری بھوری تھیں، اور پتلیاں بہت چھوٹی چھوٹی، یہ اس طرح کی تھیں جو بہت دور تک دیکھ سکتی ہیں۔ وہ سپاہیانہ تنا کھڑا، مستعد تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی، موسم کی وجہ سے، کچھ کچھ لال تھا۔

"کیا آپ کو کاغذ اور قلم چاہیے؟" اس نے یوں پوچھا جیسے اپنے سے بڑے کو مودبانہ رائے
ے رہا ہو۔ یہ انداز، لوئیزا کے لیے، اس کی کم آمیزی سے بھی زیادہ دشوار تھا۔

Scanned with CamScanner

"جی ہاں،" لوئیزا نے کہا۔

وہ مڑا اور نیچے چلا گیا۔ وہ اتنا مستغنی، اپنی حرکتوں میں اتنا زیادہ متیقن معلوم ہوتا تھا۔ لوئیزا کی کیسے اس تک رسائی ہو؟ کیونکہ وہ اس کی طرف ایک قدم بھی اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ وہ خود کو تمام و کمال اور غیر ذاتی طور پر اس کی خدمت گزاری کے لیے پیش کر دے گا، اس کا کام کرنے سے خوش ہوگا، لیکن اپنے آپ کو لوئیزا سے بالکل دور رکھے گا۔ لوئیزا یہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کا کوئی کام کرنے سے الفرڈ کو بھی مسرت ہوتی ہے لیکن اس کا اعتراف اسے برہم کیے، دکھ دیے بغیر نہ رہے گا۔ لوئیزا کو یہ عجیب معلوم ہوتا تھا کہ ایک آدمی گھر میں، واسکٹ کے بٹن کھولے، صرف قمیص پتلون پہنے، اس کی خدمت میں حاضر ہے۔ وہ مزے مزے سے چلتا پھرتا تھا، جیسے اس میں بہت سا فالتو دم ہو۔ اس کی سالمیت میں لوئیزا کے لیے کشش تھی۔ پھر بھی، جب سب چیزیں آ گئیں اور الفرڈ کے پاس کرنے کو اور کچھ نہ رہا تو اس کی پرسوال نگاہوں سے نگاہ ملاتے ہوئے وہ لرز گئی۔

جب وہ بیٹھی لکھ رہی تھی تو اس نے ایک اور موم بتی پاس رکھ دی۔ اس کی قدرے تیز روشنی لوئیزا کے ہموار بالوں پر دو چند پڑنے لگی، حتیٰ کہ وہ تہہ شدہ گھنے سنہرے پروں کے مانند، بوجھل اور چکیلے جھلمل کرنے لگے۔ پھر اس کی گردن کا پچھلا حصہ بہت گورا تھا، اس پر باریک رُواں تھا اور بالوں کے سنہرے، مخروطی گچھے پڑے تھے۔ وہ انھیں خود سے بے خبر ہو کر، یوں دیکھتا رہا جیسے کہ رویا دیکھ رہا ہو۔ لوئیزا انکشاف اور نفاست کی، ہر وہ بات تھی جو اس کی دسترس سے باہر تھی۔ لوئیزا وہ سب کچھ تھی جو کامل ترین، اور اس کی پہنچ سے دور، تھا۔ اور اسے دیکھتے ہوئے وہ خود کو بھی بھول گیا۔ لوئیزا کا اس سے کون تعلق تھا، وہ اس کے قریب نہیں گیا تھا، وہ ایک حیرت انگیز دوری کے مانند تھی۔ لیکن اس کا گھر میں موجود ہونا نعمت کے برابر تھا۔ ماں کی وجہ سے پریشانی کی شدت میں اضافہ ہو جانے کے باوجود اسے اس شام کو جینے میں حیرت ناک احساس تھا۔ موم بتیوں کی روشنی لوئیزا کے بالوں پر چمک رہی تھی اور اس پر سحر سا کر رہی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ اور اس کی ماں اور لوئیزا کچھ دیر کے لیے اس عجیب، نجانی فضا میں، ایک ساتھ ہوں گے، اس نے لوئیزا کا تھوڑا سا رعب وداب محسوس کیا اور اسے عروج کا احساس ہوا۔ اور جب وہ گھر سے نکلا تو خوفزدہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ اوپر ستارے، نادر تابناکی کے ساتھ، تھرتھرا رہے تھے، قدموں تلے برف راہ ذرا نظر آ رہی تھی اور یک نئی رات اس کے

گرد چھانے والی تھی۔ تقریباً نابود ہو جانے کی وجہ سے وہ بیم ناک تھا۔ اس کے گرد محیط ہونے والی یہ رات کیا تھی، اور وہ خود کیا تھا؟ وہ خود کو اور اپنے گرد و پیش کو نہ پہچان سکا۔ ماں کا خیال دل میں لانے سے وہ ڈرتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے سینے میں ماں کا اور اس کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کا احساس تھا۔ وہ اس سے فرار نہ ہو سکتا تھا، وہ اسے اپنے ساتھ ایک نامعلوم، نامکمل ابتری میں لے گئی تھی۔

11

وہ اذیت میں مبتلا سڑک پر چلتا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ تھا۔ بس اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سرخ، دہکتا ہوا لوہا اس کی چھاتی پر کسا ہوا ہے۔ بغیر سوچے، اس نے دو تین آنسو برف پر ٹپکا دیے۔ لیکن ذہن میں اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی ماں مر جائے گی۔ وہ کسی عظیم تر شعور کی گرفت میں تھا۔ وکر خانے کے ہال میں بیٹھے بیٹھے، جب میری لوئیزا کی چیزیں ایک تھیلے میں رکھ رہی تھی، وہ حیران ہوا کہ اس کی پریشانی کا کیا سبب تھا۔ اس بڑے گھر میں اس نے خود کو مسکین اور شرمسار محسوس کیا۔ اسے دوبارہ یہ احساس ہوا کہ وہ عام لوگوں میں سے تھا۔ جب میری نے اس سے بات کی تو وہ تقریباً مودبانہ سلام کرنے لگا۔

"ایماندار آدمی ہے،" میری نے سوچا اور یہ مربیانہ انداز اس نے خود، اپنے درد کی دوا کے طور پر، اختیار کیا تھا۔ وہ صاحب حیثیت تھی اس لیے مربیانہ پیش آ سکتی تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس رکھا ہی کیا تھا۔ لیکن معاشرے میں کسی خاص مقام کے بغیر وہ زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی۔ طبقہ اعلیٰ کی عورت ہوئے بغیر نہ وہ اپنی عزت اور نہ ایک مقررہ حد سے باہر اپنے پر اعتماد کر سکتی تھی۔

کھٹکے والے دروازے پر آ کر الفریڈ نے پھر دل میں حزن محسوس کیا اور نئے آسمان پر نظر ڈالی۔ اس نے ایک لمحے رک کر، شمال کی طرف، بنات النعش کو اندھیرے افق پر بلند ہوتے اور دور کے کھیتوں میں برف کی بعید جھمک کو دیکھا۔ پھر اس کا غم، جسمانی تکلیف کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے دروازے کو زور سے پکڑ لیا اور دانت بھینچ کر زیر لب "ماں" کہا۔ یہ غم ایک شدید، دخراش، جسمانی درد تھا، جو ٹھہر ٹھہر کر اٹھ رہا تھا، جیسے اس کی ماں کو ٹھہر ٹھہر کر تکلیف کا دورہ پڑتا تھا۔ اور وہ درد اتنا

سخت تھی کہ وہ بمشکل سیدھا کھڑا رہ سکا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ درد کہاں سے اور کیوں اٹھا تھا۔ اس کا اس کے خیالات سے، بلکہ خود اس سے، کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے بس اسے گرفت میں لے لیا تھا اور وہ فروتنی پر مجبور تھا۔ اپنی انجانی جگہوں میں جمع ہو کر اس کی روح کا تمام سیلاب، جس میں پھنس کر اس کے شعور اور فہم کا آئینہ نہ ہونے کے برابر تھا، اسے بالکل بے دست و پا، موت سے جا ملنے والے پھیلاؤ کی جانب، لے چلا اور اپنی آخری منزل کی طرف ابھرتے ہوئے اسے اتنی دور لے گیا جتنی کہ وہ کبھی نہیں گیا تھا۔ جب نوجوان کے ہوش و حواس بحال ہو گئے تو وہ گھر کے اندر گیا اور وہاں وہ تقریباً مسرور تھا۔ اس بات نے، بظاہر، اسے جوش میں بھر دیا تھا۔ اس نے اپنا حوصلہ بہت بلند محسوس کیا چنانچہ وہ ماں کا انوکھی طرح مذاق اڑاتا رہا۔ وہ ماں کے بستر کے طرف بیٹھا تھا، دوسری طرف لوئیزا تھی اور ایک طرح کی بشاشت ان پر غالب آ گئی۔ لیکن رات اور دہشت برابر بڑھ رہی تھی۔

الفرڈ نے اپنی ماں کو بوسہ دیا اور سونے چلا گیا۔ ابھی اس نے پورے کپڑے نہ اتارے تھے کہ اسے ماں کا خیال آیا اور اذیت نے اسے، دو ہاتھوں کے مانند، اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ وہ بستر پر جسم اکڑائے پڑا رہا۔ یہ حالت اتنی دیر تک رہی اور وہ اس سے اتنا تھک گیا کہ اس میں، اٹھ کر کپڑے بدلنے کا دم بھی باقی نہ رہا اور ویسے ہی سو گیا۔ آدھی رات کے بعد آنکھ کھلی تو اس نے خود کو سرد پایا۔ اس نے کپڑے اتارے اور بستر میں لیٹ کر دوبارہ سو گیا۔

پونے چھ بجے آنکھ کھلتے ہی، اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ پتلون پہن کر اور ایک موم بتی جلا کر وہ ماں کے کمرے میں پہنچا۔ اس نے موم بتی کے آگے ہاتھ رکھ لیا اور بستر پر روشنی نہ پڑی۔

"ماں!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔" جواب ملا۔

کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے کہا، "میں کام پر جاؤں؟" اور منتظر رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"میرا خیال ہے، میں گزر جاؤں گی، بیٹا۔"

اس کا دل ایک طرح کی بے حسی میں ڈوب گیا۔

"تم چاہتی ہو میں جاؤں؟"

Scanned with CamScanner

اس نے موم بتی کے سامنے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ روشنی بستر پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ لوئیز الیٹی ہوئی اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے، آدھا منہ تکیے میں چھپا کر، اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ الفرڈ نے اس کے گول سر کے گرد پریشان بالوں کو، چمکدار دھواں سا، اور بالوں کے دونوں فیتوں کو دیکھا جو بستر کے کپڑوں میں مڑے تڑے پڑے تھے۔ اس سے اسے دھچکا لگا۔ وہ، مصمم، تقریباً خود وہاں کھڑا ہوا تھا۔ لوئیزا دبک گئی۔ اس نے دیکھا اور اس کی آنکھیں ماں سے چار ہوئیں۔ پھر وہ دوبارہ ہار گیا اور متیقن اور خود نہ رہا۔

''ہاں کام پر جاؤ، میرے لال،'' ماں نے کہا۔

''بہت اچھا،'' اس نے پیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ دل میں بالکل مایوس اور تلخ ہو چکا تھا اور چل پڑا۔

''الفرڈ!'' ماں نے آہستہ سے پکارا۔

وہ لوٹ آیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

''کیا ہے، ماں؟''

''تم ہمیشہ وہی کرو گے جو ٹھیک ہوگا، الفرڈ؟'' ماں نے پوچھا، جواب بیٹے کے چلے جانے کی وجہ سے خوف کے مارے اپنے آپے میں نہ تھی۔ وہ اتنا خوفزدہ اور سٹپٹایا ہوا تھا کہ اس کی بات نہ سمجھ سکا۔

''ہاں،'' اس نے کہا۔

ماں نے اس کی طرف رخسار کر دیا۔ الفرڈ نے بوسہ دیا اور پھر انتہائی ناامیدی میں، وہاں سے کام پر چلا گیا۔

12

دوپہر تک اس کی ماں فوت ہوگئی۔ یہ خبر اسے کان کے دہانے پر ملی۔ جیسا کہ اسے باطن میں پتا تھا، خبر سے اسے صدمہ نہیں پہنچا، پھر بھی وہ کانپ گیا۔ وہ گھر بالکل پُرسکون لوٹا، بس اس کا سانس تیز چل رہا تھا۔ لوئیزا اب بھی گھر پر تھی اور ہر ممکن بات کا انتظام کر چکی تھی۔ الفرڈ کے لیے جو کچھ جاننا

Scanned with CamScanner

ضروری تھا، وہ اس نے بہت موزوں انداز میں بتا دیا۔ لیکن لوئیزا کے لیے ایک بات پریشانی کی باعث تھی۔

''تمھیں اس کی توقع تھی۔ یہ تمھارے لیے بالکل ناگہانی تو نہیں ہوئی؟'' اس نے، الفرڈ کی طرف نظریں اٹھا کر، پوچھا۔ لوئیزا کی آنکھیں سیاہ اور پُرسکون اور متلاشی تھیں۔ وہ بھی کھوئی کھوئی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اتنا پُراسرار اور نوآغاز تھا۔

''میرا خیال ہے۔۔۔ ہاں،'' اس نے احمقانہ کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ لوئیزا کی نگاہوں کی وہ تاب نہ لا سکا۔

''یہ خیال مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا کہ تمھیں شاید اس کی توقع نہ ہو،'' اس نے کہا۔

الفرڈ نے جواب نہ دیا۔

اس وقت لوئیزا کی قربت اسے ایک بوجھ سا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تنہائی چاہتا تھا۔ رشتے داروں کی آمد شروع ہوتے ہی لوئیزا چلی گئی اور پھر نہ آئی۔ جب تک انتظامات ہوتے رہے، اور لوگ گھر میں جمع رہے اور الفرڈ معاملات کا تصفیہ کرتا رہا۔ وہ، غم کے ان ناقابل ضبط دوروں کے علاوہ، اچھا بھلا رہا۔ باقی لوگوں کی نظر میں وہ سطحی تھا، لیکن دل میں وہ، غم کے ان شدید، تقریباً بے معنی دوروں کو جھیلتا رہا، جو گزرنے کے بعد اسے پُرسکون، تقریباً واضح، بس ذرا حیران، چھوڑ جاتے تھے۔ اس سے پہلے اسے یہ پتا نہ تھا کہ ہر شے کا اس طرح شکست ہونا، خود اس کا شیرازہ بکھر جانا اور یوں ہر چیز کا ایک عظیم، اور بہت وسیع اور حیرت انگیز، بحری میں تبدیل ہو جانا ممکن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی جان، اپنی بندشوں کو توڑ چکی ہے اور وہ ایک عظیم حیران کن طوفان میں، جو بے پایاں اور غیر آباد تھا، کھو گیا ہے۔ وہ خود ٹوٹ پھوٹ کر اس میں بہہ گیا تھا۔ وہ صرف خاموش پڑا، ہانپ ہانپ کر، سانس لے سکتا۔ پھر درد دوبارہ لوٹ آیا۔

جب ''کوئری کاٹیج'' سے سب لوگ چلے گئے اور جوان آدمی، ایک ادھیڑ عمر کی ماما کے ساتھ، تنہا رہ گیا تب طویل آزمائش کا دور آیا۔ برف پگھلنا شروع ہوئی، پھر تازہ برف باری سے بھوری برف سفید ہو کر جم گئی، اور پھر وہ بھی پگھلنے لگی۔ دنیا پگھلتے ہوئے بھورے کیچڑ کی جگہ معلوم ہوتی تھی۔ شام کو الفرڈ خالی بیٹھا رہتا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس کی زندگی چھوٹے موٹے کاموں میں بسر ہوتی آئی تھی۔ آگاہ ہوئے بغیر وہ اپنی ماں میں مرتکز اور منقطب ہو گیا تھا۔ اس کی ماں اسے کام میں مشغول رکھتی تھی۔

Scanned with CamScanner

اب بھی، بوڑھی ماما کے جانے کے بعد وہ اپنے پرانے معمول پر عمل کر سکتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا رو اور توازن غائب تھا۔ وہ بظاہر پڑھنے کو بیٹھتا، لیکن تمام وقت اس کی مٹھیاں تنی رہتیں، وہ خود کو روکے رکھتا اور، اسے پتا نہ تھا کہ کیا، برداشت کرتا رہتا۔ کھیتوں کی سیاہ اور تیلی پگڈنڈیوں پر میلوں چلتے رہنا اور آخر بالکل تھک جانا، یہ سب محض وہاں سے دور بھاگنا تھا جہاں واپس ہونا اس پر لازم تھا۔ کام کرتے ہوئے وہ ٹھیک رہتا۔ اگر گرمیاں ہوتیں تو شاید وہ سونے کے وقت تک باغ میں کام کرکے بچ جاتا۔ لیکن اب نجات کی، چھٹکارے کی، مدد کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ شاید کام کرنے کے لیے بنا تھا، چیزوں کو سمجھنے کے لیے نہیں؛ کچھ ہونے کے واسطے نہیں بلکہ کرنے کے لیے۔ چوٹ کھانے کے بعد اپنے مشغلے اس سے اس طرح چھوٹ گئے تھے جس طرح کوئی تیراک تیرنا بھول جائے۔

ایک ہفتے تک اس میں گھٹن اور کشمکش کو سہنے کا دم رہا، پھر وہ جھٹکے گا اور سمجھ گیا کہ اس کا کچھ حل ڈھونڈنا پڑے گا۔ حفظِ نفس کی جبلت سب باتوں پر غالب آ گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ جائے کہاں؟ شراب خانے اس کے لیے بالکل بے معنی تھے، وہاں جانا فضول تھا۔ اس نے ترکِ وطن کی سوچنی شروع کی۔ دوسرے ملک میں وہ ٹھیک تھا کہ رہ سکے گا۔ اس نے متعلق دفاتر کو خط لکھے۔

جنازے کے بعد آنے والے اتوار کو، جب ڈیورینٹ برادری کے سب لوگوں نے گرجا میں حاضری دی، الفرڈ نے متین اور کم آمیز لوئیزا کو میری کے، جو مغرور اور بہت بعید تھی، اور گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ، جو الگ تھلگ لوگ معلوم ہوتے تھے، بیٹھے دیکھا۔ الفرڈ انھیں دور کے لوگ سمجھتا تھا۔ وہ اس بارے میں سوچتا بھی نہ تھا۔ اس کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبادت کے مراسم ختم ہو جانے کے بعد لوئیزا نے آکر اس سے ہاتھ ملایا۔

"میری بہن چاہتی ہے کہ تم، اگر مناسب سمجھو، تو کبھی رات کا کھانا ہمارے ہاں کھاؤ۔"

الفرڈ نے میری کی طرف دیکھی جس نے سر نیہوڑا کر سلام کیا۔ رحم دلی کی وجہ سے میری نے لوئیزا کو یہ رائے دی تھی، یہ کہتے ہوئے بھی اگرچہ اسے خود سے اتفاق نہ تھا لیکن اس نے اپنے اوپر زیادہ دھیان نہیں دیا۔

"ہاں،" الفرڈ نے گڑبڑا کر کہا، "اگر تم چاہتی ہو تو آجاؤں گا۔" لیکن اس نے مبہم طور پر محسوس کیا کہ یہ بات بے محل تھی۔

Scanned with CamScanner

"تو پھر تم کل شام کو تقریباً ساڑھے چھ بجے آ جانا۔"

وہ وہاں پہنچ گیا۔ لوئیزا اس کے ساتھ بڑے لطف سے پیش آئی۔ چھوٹے بچوں کی وجہ سے موسیقی کی نوبت نہ آ سکی۔ وہ بند مٹھیاں رانوں پر دھرے، بہت خاموش اور غیر متاثر، ان لوگوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے ایک طرح کے مراقبے یا خیرگی میں کھو گیا۔ الفرڈ اور ان لوگوں میں آپس میں کچھ بھی تو مجانست نہیں تھی۔ اس کی طرح وہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا، اور شام آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ مسز لنڈلی نے اس کو "میاں" کے نام سے مخاطب کیا۔

"یہاں بیٹھو گے، میاں؟"

وہ وہاں بیٹھ گیا۔ ناموں میں بھلا کیا دھرا تھا۔ ان کو اس سے یہ مطلب کیا تھا؟ مسز لنڈلی نے اس سے ایک خاص، مہربان اور پُر شفقت لیکن مربیانہ، لہجے میں بات کی۔ ڈیورینٹ سب باتوں کو اعتراض کے بغیر ناراض ہوئے بغیر، فرمانبرداری سے، سنتا رہا۔ لیکن وہ کھانا کھانا نہیں چاہتا تھا — ان کی موجودگی میں کھانا اس کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ غلط جگہ پر ہے۔ لیکن تھوڑی دیر رکنا اس پر فرض تھا۔ وہ مختصراً ہاں یا نہیں میں جواب دیتا رہا۔

جب وہ وہاں سے چلنے کو ہوا تو پریشان دماغی سے کپکپا اٹھا۔ وہ خوش تھا کہ قصہ ختم ہوا اور جتنی جلد ممکن ہوا چلا آیا۔ اب وہ اور بھی زیادہ شدت سے فی الفور کینیڈا روانہ ہو جانے کا خواہاں تھا۔

لوئیزا، گھر والوں سے اور خود الفرڈ سے نالاں، دل ہی دل میں رنج کھاتی رہی۔ لیکن یہ وہ بالکل نہ بتا سکتی تھی کہ نالاں کیوں تھی۔

13

دو دن بعد شام کو، ساڑھے چھ بجے، لوئیزا نے کوپری کاٹیج کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ الفرڈ کھانا کھا چکا تھا، ماما برتن دھو دھلا کر چلی گئی تھی، مگر وہ اب بھی کان کے میل میں بھرا بیٹھا تھا۔ بعد میں اس کا ارادہ "نیو ان" جانے کا تھا۔ اس نے وہاں جانا شروع کر دیا تھا، کیونکہ کہیں نہ کہیں جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ دوسرے آدمیوں کا محض پاس ہونا، شور و شغب، گرمی اور وقت کے گزرنے کا پتا نہ چلنا، سب اس کے لیے لازمی تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا اور خالی گھر میں اکیلا بیٹھا رہا یہاں تک کہ وہ اسے

کوئی غیر فطری شے معلوم ہونے لگا۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو اسی طرح آلودہ تھا۔

"میں ملنے کے لیے آنا چاہ رہی تھی، میں نے سوچا، چلو" لوئیزا نے کہا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ حیران ہوا کہ آخر وہ اس کی ماں کی گول آرام کرسی پر کیوں نہیں بیٹھتی۔ لیکن جب کبھی ماما اس کرسی پر بیٹھ جاتی تھی تو اس کے دل میں کوئی جذبہ، غصے کی طرح، کروٹیں لینے لگتا تھا۔

"مجھے اب تک نہالینا چاہیے تھا،" اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جس پر، زیبائش کی خاطر، تتلیاں اور شاہ دانے بنے ہوئے تھے اور ٹی بروکس، مینس فیلڈ لکھا تھا۔ اس نے اپنے سیاہ ہاتھ داغدار بانہوں کے ساتھ پھیلا دیے۔ لوئیزا نے اس کی طرف دیکھا؛ وہاں اس کے لیے وہی کم آمیزی اور بے تعلقی عیاں تھی جس وہ اتنی گھبراتی تھی کہ اس کی وجہ سے لوئیزا کی الفرڈ تک رسائی ناممکن ہو جاتی تھی۔

اس نے کہا: "مجھے ڈر ہے کھانے پر مدعو کر کے میں نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"میں اس کا عادی نہیں ہوں،" اس نے کہا اور ہونٹوں سے مسکرایا، اس کے ذرا چھیدے سفید دانت نظر آئے؛ اس کی آنکھیں، بہر حال، اچل اور کھوئی کھوئی تھیں۔

"یہ بات نہیں،" لوئیزا نے جلدی سے کہا۔ اس کے پُرسکون انداز میں ندرت تھی اور اس کی گہری بھوری آنکھیں ذکاوت سے معمور تھیں۔ جونہی الفرڈ کو اس کا احساس ہونا شروع ہوا وہ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔

"اکیلے کیسی گزرتی ہے؟" لوئیزا نے پوچھا۔

اس نے آگ کی طرف آنکھیں پھیر لیں۔

"اور—" اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا اور جواب کو پورا بھی نہیں کیا۔

لوئیزا نے منہ پھلا لیا۔

"اس کمرے میں کتنی گھٹن ہے۔ تم نے اتنی زبردست آگ جلا رکھی ہے۔ میں اپنا کوٹ اتار دیتی ہوں،" اس نے کہا۔

وہ اسے کوٹ اتارتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے دودھیا رنگ کا سنہرے ریشم سے کڑھا، اونی

Scanned with CamScanner

طاور چکن رکھا تھا، جو اس کے گلے اور کلائیوں پر بالکل ٹھیک اور چست تھا، یہ الفرڈ کو بہت نفیس لباس معلوم ہوا۔ اس سے اسے مسرت اور ستھرے پن اور خود سے رہائی کا احساس ہوا۔

"تم کیا سوچ رہے تھے جو تب سے دھوئے بھی نہیں؟" لوئیزا نے، ادھوری بے تکلفی سے، پوچھا۔ وہ منہ موڑتے ہوئے ہنسا۔ اس کے سیاہ چہرے میں اس کی آنکھوں کی سفیدی بہت واضح تھی۔

"میں تمھیں نہیں بتا سکتا،" اس نے کہا۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔

"اس گھر میں مستقل رہنے کا ارادہ ہے؟" لوئیزا نے پوچھا۔

سوال کی وجہ سے وہ کرسی میں کسمسایا۔

"مجھے خود ٹھیک پتا نہیں،" اس نے کہا، "عین ممکن ہے کہ میں کینیڈا چلا جاؤں۔"

لوئیزا کی آنکھیں ایک دم بہت پرسکون اور متوجہ ہو گئی۔

"کس لیے؟" اس نے پوچھا۔

اس نے پھر بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"بس،" اس نے آہستہ آہستہ کہا، "وہاں کی زندگی آزمانے کو۔"

"لیکن کس قسم کی زندگی؟"

"مختلف طرح کے کام ہیں۔ کاشتکاری ہے، جنگل کاٹنے کا کام ہے، کان کنی ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ کیا کام کرنا پڑے۔"

"اور تم کیا یہی چاہتے ہو؟"

وہ ان دنوں سوچ بچار نہیں کیا کرتا تھا اس لیے جواب نہ دے سکا۔

"مجھے پتا نہیں،" اس نے کہا، "کرنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔"

لوئیزا نے الفرڈ کو ہمیشہ کے لیے دور جاتے دیکھا۔

"تمھیں اس گھر اور باغ کو چھوڑنے کا افسوس نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے پتا نہیں،" اس نے ناخوشی سے جواب دیا، "میرا خیال ہے ہمارا فریڈ یہاں آجائے گا۔ وہ یہی چاہتا ہے۔"

"تم یہاں آباد ہونا نہیں چاہتے؟" لوئیزا نے پوچھا۔

وہ کرسی کے دستوں پر ہاتھ ٹیکے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس نے لوئیزا کی طرف منہ پھیرا۔ لوئیزا کا چہرہ پیلا اور نٹھر تھا اور اداس اور تاثر سے عاری نظر آرہا تھا اور اس کے چہرے کی پیلاہٹ اور بالوں کی گہری چمک ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔ وہ الفرڈ کے لیے ایک محکم غیر متزلزل اور جاوداں پیشکش تھی۔ الفرڈ کا دل امید وبیم کے کرب سے سوزناک تھا۔ خوف اور درد سے اس کے اعضا میں تیز تشنج تھا۔ اس نے لوئیزا کی طرف سے اپنا تمام بدن موڑ لیا۔ سکوت ناقابل برداشت تھا۔ لوئیزا کے اور دیر وہاں بیٹھنے کا اب وہ متحمل نہ ہوسکتا تھا۔ اس کی موجودگی سے الفرڈ کا دل گرم ہوکر سینے میں گھٹا جا رہا تھا۔

"تم رات کو کہیں جانے والے تھے؟" لوئیزا نے پوچھا۔

"بس 'نیوان' تک۔" اس نے جواب دیا۔

خاموشی پھر سے چھا گئی۔

لوئیزا نے ہیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسے اور کچھ کرنے کا اشارہ ہی نہ ہوا تھا۔ اسے جانا پڑے گا۔ الفرڈ منتظر بیٹھا تھا کہ لوئیزا رخصت ہو تو اسے تسکین ملے۔ اور لوئیزا کو معلوم تھا کہ وہ اگر جیسے آئی تھی ویسے ہی گھر سے چلی گئی تو ناکام رہ جائے گی۔ اس کے باوجود وہ ہیٹ کی پنیں لگاتی رہی۔ چند لمحوں بعد اسے جانا پڑے گا۔ کوئی شے اسے لیے جارہی تھی۔ پھر اچانک، بجلی کی طرح، ایک تیز ٹیس نے اس کو سر سے پیر تک جھلس دیا اور وہ از خود رفتہ ہوگئی۔

"تم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟" اس نے، ضبط کے ساتھ، پوچھا۔ لیکن وہ ایک فروزاں اذیت کی وجہ سے بول رہی تھی، جیسے کہ اس کے الفاظ اس کے اندر سے اس کی مداخلت کے بغیر ادا ہو رہے ہوں۔

کوئلے کی تہہ کے نیچے الفرڈ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"کیوں؟" اس نے، مجبوراً، اس کی طرف ڈرتے ڈرتے مڑ کر، پوچھا۔

"تم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟" اس نے دہرایا۔

"کیوں؟" الفرڈ نے دوبارہ پوچھا۔

"کیونکہ میں تمھارے پاس ٹھہرنا چاہتی ہوں۔" لوئیزا نے، گلوگیر ہوکر، کہا۔ اس کے پھیپھڑے

Scanned with CamScanner

آگ سے بھرے ہوئے تھے۔ الفرڈ کا چہرہ بھڑکا، وہ ذرا آگے کو جھک کر معلق سا، اذیت میں، ابتری کے ایک درد میں، حواس بحال کرنے کے ناقابل، لوئیزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تکتا رہا۔ اور وہ بھی نظر ملائے رہی، جیسے پتھر کی بن گئی ہو۔ ان کی روحیں چند لمحوں کے لیے بے نقاب اور برہنہ ہوگئیں۔ یہ سکرات کا عالم تھا۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ الفرڈ نے اپنا سر جھکا لیا اور اس کا جسم تند اور مختصر جھٹکوں کے ساتھ، پھڑکتا رہا۔ لوئیزا نے اپنے کوٹ کا رخ کیا۔ اس کی روح اس کے اندر بے جان ہوگئی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن وہ اب کچھ محسوس نہ کر سکتی تھی۔ اس نے کوٹ پہن لیا۔ کمرے میں امید وبیم کی ایک دردناک کیفیت طاری تھی۔ لوئیزا کے جانے کا وقت آ گیا تھا۔ الفرڈ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں، معذب سیاہ پتلیوں کے سوا، عقیق کے مانند، بے تفاوت تھیں۔ انھوں نے لوئیزا کو تھام رکھا تھا۔ اس کی اپنی کوئی مرضی، کوئی زندگی نہ تھی۔ وہ شکست خوردہ محسوس کر رہی تھی۔

"کیا تم مجھے نہیں چاہتے؟" اس نے لاچارگی سے کہا۔

الفرڈ کی آنکھوں میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی، جس نے لوئیزا کے قدم تھام لیے۔

"میں... میں..." اس نے کہنا شروع کیا، لیکن بول نہ سکا۔ کوئی چیز اسے کرسی پر سے لوئیزا تک کھینچ کر لے آئی۔ وہ بے حس و حرکت، مسحور کھڑی تھی، جیسے کسی کو، شکار کی طرح، شکاری کے سامنے ڈال دیا جائے۔ الفرڈ نے اپنا ہاتھ، تذبذب کے ساتھ، آزمائش کے طور پر، لوئیزا کی بانہہ پر رکھا اور اس کے چہرے کی کیفیت عجیب اور غیر انسانی تھی۔ لوئیزا بالکل دم بخود کھڑی رہی۔ پھر الفرڈ نے بے ڈھنگے پن سے اس کے گرد بانہیں ڈال کر اسے ظلمات، اندھا دھند، اپنی آغوش میں لے لیا اور اسے اتنا بھینچا، اتنا بھینچا کہ وہ بے ہوش سی ہوگئی حتی کہ وہ خود بھی تقریباً گر پڑا۔

اور لوئیزا کو تھامے ہوئے، جب اس کا ذہن گھمیر میں تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود سے جدا ہو کر نیچے کو گرتا چلا جا رہا ہے، گرتا جا رہا ہے اور لوئیزا خود سپردگی کے عالم میں، بے ہوش ہو کر ایک طرح کی موت مر چکی تھی، تب، آہستہ آہستہ گھور اندھیرے کا ایک لمحہ اس پر آیا اور انھوں نے پھر سے ہوش میں آنا شروع کیا، جیسے کہ کسی لمبی نیند سے جاگے ہوں۔ الفرڈ اپنے آپے میں آ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے، لوئیزا نے اپنی گرفت ہلکی کی اور اس کے گرد بانہیں ڈال دیں اور وہ اسے تھامے ہوئے تھا۔ اس طرح وہ، بولنے سے لاچار، ایک دوسرے کو سینے سے

Scanned with CamScanner

لگائے اور، بھروسے کی خاطر، ایک دوسرے کی آغوش میں چھپے رہے۔ اور ہمیشہ وہ لوئیزا کے ہاتھ تھے جو کپکپاتے ہوئے اسے اور مضبوطی سے پکڑ کے، محبت سے، اپنے قریب تر کھینچ رہے تھے۔

اور آخرش لوئیزا نے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا کر، نظریں اٹھا کر، اسے دیکھا: لوئیزا کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ الفرڈ کا دل، جو اسے دیکھ رہا تھا، خوف سے خاموش تھا۔ الفرڈ خود اس کے ساتھ تھا۔ لوئیزا نے اس کے بالکل اندھیرے اور پُراسرار چہرے کو دیکھا اور الفرڈ اسے لافانی معلوم ہوا، اور اس راحت کی ندرت میں درد کی ساری یاد در آئی اور اس کے تمام آنسو امنڈ آئے۔

"مجھے تم سے محبت ہے،" لوئیزا نے کہا، اس کے کھنچے ہوئے ہونٹوں پر سسکیاں تھیں۔ اس کی بات سننے اور امن اور عشق کے یوں اچانک ہو جانے کو، جس سے اس کا دل تقریباً ٹوٹ گیا تھا سہنے کے ناقابل، الفرڈ نے اپنا سر اس کے سر پر جھکا دیا۔ وہ باہم چپ چاپ کھڑے رہے اور اتنے وہ جذبہ ان سے ذرا دور ہٹ گیا۔

آخر لوئیزا نے اسے دیکھنا چاہا۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ الفرڈ کی آنکھیں، چھوٹی سیاہ پتلیوں سمیت، عجیب اور دھکی ہوئی تھیں۔ لوئیزا کے لیے وہ پُراسرار اور طاقتور تھیں۔ اور الفرڈ کا منہ اس کے منہ کی طرف بڑھا، آہستہ آہستہ لوئیزا کی آنکھیں بند ہو گئیں اور الفرڈ کے ہونٹ اس کے ہونٹوں کے قریب اور قریب تر ہوتے گئے اور اس نے لوئیزا کو اپنے بس میں کر لیا۔

وہ بہت دیر تک خاموش رہے۔ وہ محبت اور غم اور موت میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے کو، درد کے ساتھ، چمٹانے اور طویل، اذیت ناک بوسوں سے، جن میں خوف آرزو میں سرایت کر گیا تھا، چومنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آخرکار لوئیزا آغوش سے الگ ہوئی۔ الفرڈ کو یوں محسوس ہوا، جیسے اس کے دل پر چوٹ لگی ہو۔ لیکن وہ خوش تھا اور لوئیزا کی طرف دیکھنے کی بمشکل جرأت کر سکتا تھا۔

"میں خوش ہوں،" لوئیزا نے بھی کہا۔

اس نے، پرجوش احسان مندی اور آرزو سے، لوئیزا کے ہاتھ تھام لیے۔ ابھی اس کا دماغ اتنا حاضر نہ تھا کہ وہ کچھ کہہ سکتا۔ پھر بھی، خود ادعائی کی ہمت اس میں نہ تھی، وہ اس کے ہاتھوں کو مضبوطی

سے پکڑے رہا۔

"تمھارا منھ کالا ہے،" وہ بولی۔

وہ ہنسا۔

"تمھارے منھ پر بھی ذرا دھبا لگ گیا ہے،" اس نے کہا۔

وہ ایک دوسرے سے خوفزدہ تھے، بات کرنے سے ڈرتے تھے۔ وہ بس اتنا کر سکتا تھا کہ لوئیزا کو اپنے قریب رکھے۔ کچھ دیر بعد لوئیزا نے اپنا منھ دھونا چاہا۔ الفرڈ نے اسے گرم پانی لا دیا اور پاس کھڑے ہو کر دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ وہ اسے منھ پونچھتے اور بال سلجھاتے دیکھتا رہا۔

"وہ دیکھ رہیں تے کہ تمھارا بلاؤز میلا ہے،" اس نے کہا۔

لوئیزا نے اپنی آستینوں کو دیکھا اور خوشی کے مارے ہنس پڑی۔

وہ غرور سے چست تھا۔

"تم کیا کرو گی؟" اس نے پوچھا۔

"کس بارے میں،" لوئیزا نے کہا۔

جواب دینے میں وہ ان چھلا تھا۔

"میرے بارے میں،" اس نے کہا۔

"تم مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہو؟" وہ ہنسی۔

اس نے آہستہ سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب کیا مضائقہ تھا؟

"لیکن پہلے صاف تو ہو لو،" وہ بولی۔

14

جب وہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے تو رات نامعلوم سے آباد معلوم ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے ان کے گرد کی تاریکی جاندار اور آگاہی سے بھری ہوئی ہو، اور وہ ایک دوسرے کے پاس پاس رہے۔ خاموشی سے وہ پہاڑی پر چڑھتے گئے۔ شروع شروع میں سڑک کی بتیاں ان کے رستے

میں تھیں۔ کئی آدمی ان کے پاس سے گزرے۔ وہ لوئیزا سے زیادہ شرمایا ہوا تھا اور وہ اگر ذرا بھی ڈھیل دیتی تو اسے اکیلی چلی جانے دیتا، لیکن لوئیزا ثابت قدم رہی۔

پھر وہ، بھیتوں کے بیچ میں، اصلی اندھیرے میں جا پہنچے۔ وہ بولنا نہیں چاہتے تھے اور خاموشی میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب محسوس کر رہے تھے۔ اس طرح وہ ورکر خانے کے پھاٹک تک آ گئے اور مونٹرے کے پت جھڑے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے۔

''کاش کہ تمھیں جانا نہ ہوتا،'' وہ بولا۔

وہ چھوٹی سی، تیز ہنسی ہنسی۔

''کل آؤ،'' اس نے دبی زبان میں کہا، ''اور ابا سے پوچھ لو۔''

اس نے ہاتھ پر الفرڈ کے ہاتھ کی گرفت محسوس کی۔

جواب میں وہ پھر وہی مغموم، ذرا سی، ہمدردانہ ہنسی ہنس پڑی۔ پھر اس نے الفرڈ کو چوم کر، گھر بھیج دیا۔ گھر پر پرانے غم کا ایک اور دورہ پڑا جس نے لوئیزا، بلکہ ماں تک کے خیال کو، جس کی وجہ سے درد کا یہ زور زخم میں حرارت کی ٹیس کے مانند تندی دکھا رہا تھا، بکسر مٹا دیا۔ لیکن اس کے دل میں کوئی شے سالم تھی۔

15

دوسری شام کو یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ کام اسے کرنا تھا، اور یہ تصور کیے بغیر کہ وہاں کیا پیش آئے گا، اس نے ورکر خانے جانے کے لیے کپڑے بدلے۔ وہ اس معاملے پر سنجیدگی سے توجہ دینے کو تیار نہ تھا۔ اسے لوئیزا پر پورا یقین تھا اور یہ شادی اس کے لیے مقدر کے لکھے کے مانند تھی۔ اس بات نے اسے قضا و قدر کے مقدس احساس سے معمور کر دیا۔ وہ اس کے لیے ذمہ دار نہ تھا، نہ لوئیزا کے گھر والوں کا، درحقیقت، اس میں کوئی دخل تھا۔

انھوں نے اسے لے جا کر مطالعے کے چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا، جہاں آگ جلی ہوئی نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد پادری اندر آیا۔ اس کی آواز سرد مہر اور مخاصمانہ تھی۔ اس نے کہا، ''میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں، میاں؟''

Scanned with CamScanner

وہ پوچھے بغیر ہی سب سمجھ گیا تھا۔

ڈیورینٹ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے کسی افسر کے سامنے کھڑا ہوا ملاح معلوم ہونے لگا۔ اس کا انداز ماتحتوں کا تھا۔ لیکن اس کا حوصلہ واضح تھا۔

''مسٹر لنڈلی، میں چاہتا تھا—'' اس نے مودبانہ کہنا شروع کیا، اور پھر اچانک اس کا رنگ اڑ گیا۔ جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ اب ایک بے ادبی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ لیکن وہ کھڑا رہا، کیونکہ یہ کام اسے کرنا تھا۔ اس نے ذاتی آزادی اور خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اسے متذبذب ہوئے بغیر خود کو نظر انداز کر دینا چاہیے تھا۔ یہ معاملہ اس کی اپنی ذات سے کہیں بڑا تھا۔ اسے کچھ محسوس نہ کرنا چاہیے تھا۔ یہ اس کا بلند ترین فریضہ تھا۔

''تم چاہتے تھے—'' پادری نے کہا۔

ڈیورینٹ کا منہ سوکھ گیا تھا لیکن اس نے مستقل مزاجی سے کہا

''مس لوئیزا... لوئیزا نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔''

''تم نے مس لوئیزا سے پوچھا تھا کہ کیا وہ تم سے شادی کرے گی— ہاں—'' پادری نے تصحیح کی۔

ڈیورینٹ نے سوچا کہ اس نے لوئیزا سے یہ نہیں پوچھا تھا

''کیا وہ مجھ سے شادی کرے گی، جناب۔ مجھے امید ہے، آپ کو اعتراض نہیں۔''

وہ مسکرایا۔ وہ خوبصورت آدمی تھا اور پادری یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔

''اور میری لڑکی تم سے شادی کرنے پر رضامند تھی؟'' لنڈلی نے کہا۔

''ہاں،'' ڈیورینٹ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے باوجود، یہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنے اور بڑے آدمی کے مابین طبعی عداوت محسوس کی۔

''ذرا ادھر آؤ گے؟'' پادری نے کہا۔ وہ اسے کھانے کے کمرے میں لے گیا جہاں میری، لوئیزا اور مسز لنڈلی تھیں۔ میسی، لیمپ سمیت، ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

''لوئیزا، یہ نوجوان تمھاری وجہ سے آیا ہے؟'' لنڈلی نے کہا۔

''جی،'' لوئیزا نے، ڈیورینٹ کو دیکھتے ہوئے، کہا۔ وہ باقاعدہ، سیدھا کھڑا تھا۔ اس میں لوئیزا

Scanned with CamScanner

کو دیکھنے کی ہمت نہ تھی، لیکن لوئیزا کا احساس تھا۔

''بری بیوقوف، تم ایک کان کن سے شادی کرنا تو نہیں چاہتیں،'' مسز لنڈلی کرخت آواز میں چیخیں۔ وہ فاختی بھوری ڈھیلی ڈھالی گاؤن میں لپٹی نیم شیم اور لاچار صوفے پر پڑی تھی۔

''ارے چپ رہو، ممی،'' میری، پُرسکون تندی اور غرور کے ساتھ، بولی۔

''بیوی کی کفالت کا تمھارے پاس کیا ذریعہ ہے؟'' پادرن نے درشتی سے دریافت کیا۔

''میرے پاس!'' ڈیوربنٹ نے چونک کر جواب دیا، ''میرا خیال ہے میں کافی کما سکتا ہوں۔''

''اچھا، کتنا کما سکتے ہو؟'' کرخت آواز آئی۔

''سات شلنگ چھ پنس روزانہ،'' جوان آدمی نے جواب دیا۔

''اور اس میں کچھ اضافہ ہو جائے گا؟''

''امید تو ہے۔''

''اور تمہارا اسی تنگ، چھوٹے سے مکان میں رہنے کا ارادہ ہے؟''

''خیال تو یہی ہے،'' ڈیوربنٹ نے کہا، ''اگر کوئی مضائقہ نہ ہو۔''

ان باتوں کا اس نے کوئی خاص برا نہ مانا، بس کچھ گھبرا سا گیا، کیونکہ وہ اسے معقول آدمی سمجھنے کو تیار نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا کہ، ان کے مفہوم میں، وہ معقول نہیں تھا۔

''تو میں بتائے دیتی ہوں کہ اگر اس نے تم سے شادی کی تو وہ بیوقوف ہے،'' ماں نے، بھدی آواز میں چلا کر، اپنا فیصلہ سنا دیا۔

بہرحال، ممی، یہ لوئیزا کا معاملہ ہے،'' میری نے واضح لہجے میں کہا، ''اور ہمیں یاد رکھنا چاہیے ـــــ''

''بستر جو بچھائے گا وہی اس پر لیٹے گا ـــــ لیکن بعد میں پچھتائے گی،'' مسز لنڈلی نے بات کاٹ کر کہا۔

''اور آخر،'' لنڈلی نے کہا، ''لوئیزا خود کو اتنا آزاد تو نہیں سمجھ سکتی کہ کچھ کرتے وقت گھر والوں کا بالکل ہی خیال نہ کرے۔''

Scanned with CamScanner

''آپ کیا چاہتے ہیں، پاپا؟'' لوئیزا نے تیزی سے پوچھا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس آدمی سے شادی کرو گی تو مجھے اپنی حیثیت برقرار رکھنی مشکل ہو جائے گی، خصوصاً اگر تم اسی حلقے میں رہیں۔ اگر تم یہاں سے دور جانے کی سوچ رہی ہو تو میرے لیے آسان رہے گا۔ لیکن یہاں، گویا میرے روبرو، ایک کان کن کی کاٹیج میں رہنا بہت نامناسب ہوگا۔ مجھے اپنی حیثیت قائم رکھنی ہے اور اس حیثیت کو مذاق میں نہیں ٹالا جا سکتا۔''

''ادھر آؤ، میاں،'' ماں کرخت آواز میں چلائی، ''ذرا ہم بھی تو دیکھیں تمہیں۔''

ڈیورینٹ تمتمایا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا، لیکن بالکل منیخ نہیں، چنانچہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو کہاں رکھے۔ اسے فرمانبردار اور چپ چاپ کھڑا دیکھ کر لوئیزا کو بڑا تاؤ آیا۔ اسے مردوں کی طرح ہونا چاہیے۔

''تم اسے کہیں دور لے جا کر نہیں رہ سکتے؟'' ماں نے پوچھا، ''تم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔''

''ہاں، ہم یہاں سے جا سکتے ہیں،'' اس نے کہا۔

''کیا تم جانا چاہتے ہو؟'' میری نے صاف آواز میں پوچھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ میری بہت شاہانہ اور دلنشیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سرخ ہو گیا۔

''اگر میرے یہاں رہنے سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہے تو میں جانا چاہتا ہوں،'' اس نے کہا۔

''لیکن تم خود، یہیں رہنا چاہو گے؟'' میری نے کہا۔

''یہ میرا وطن ہے،'' اس نے کہا، ''اور اس گھر میں میں پیدا ہوا تھا۔''

''تو پھر،'' میری نے والدین کی طرف مڑ کر واضح طور پر کہا، ''میری سمجھ میں نہیں آتا، پاپا، کہ آپ کیسے شرائط عائد کر سکتے ہیں۔ اپنے طور پر وہ بھی حق پر ہے اور اگر لوئیزا اس سے شادی کرنا چاہتی ہے—''

''لوئیزا، لوئیزا کیا!'' باپ نے بے صبری سے چلا کر کہا، ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوئیزا آخر اور انسانوں کی طرح کا رویہ کیوں نہیں اختیار کر سکتی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر وہ صرف اپنی بابت کیوں سوچے اور اپنے گھر والوں کو خارج از بحث کر دے۔ اکیلی شادی کی بات ہی بہت ہے اور لوئیزا کو اسے ہمارے لیے بہتر بنانے کی سعی کرنی چاہیے۔ اور اگر—''

Scanned with CamScanner

''لیکن مجھے اس آدمی سے محبت ہے، پاپا،'' لوئیزا نے کہا۔

''اور مجھے امید ہے کہ تمھیں اپنے والدین سے بھی محبت ہے اور مجھے امید ہے کہ تم کوشش کرو گی کہ ان کی نیک نامی پر کم سے کم حرف آئے۔''

''ہم کہیں اور جا کر رہ لیں گے،'' لوئیزا نے کہا۔ اس کی صورت رونی ہو گئی اور آنسو نکل آئے۔ آخر کار اس کی سچ مچ دل شکنی ہوئی۔

''ارے، ہاں، بالکل آسانی سے،'' ڈیورینٹ نے، جو پیلا اور پریشان تھا، جلدی سے کہا۔

کمرے میں بالکل سناٹا چھا گیا۔

''میرے خیال میں یہ واقعی بہتر رہے گا،'' پادری نے، ٹھنڈے ہو کر، زیر لب کہا۔

''یقیناً بہتر رہے گا،'' صاحب فراش عورت نے کرخت آواز میں کہا۔

''حالانکہ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان سے ایسا مطالبہ کرنے کے لیے معافی مانگنی چاہیے،'' میری نے تکبر کے ساتھ کہا۔

''نہیں،'' ڈیورینٹ بولا، ''یہ ہر طرح سے بہتر رہے گا۔'' وہ خوش تھا کہ جھگڑا ختم ہوا۔

''ہم شادی کا اعلان یہاں گرجا میں کروائیں یا رجسٹرار کے پاس جا کر شادی کر لیں،'' اس نے واضح طور پر، للکار کر پوچھا۔

''ہم رجسٹرار کے پاس چلے جائیں گے،'' لوئیزا نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

کمرے میں دوبارہ بالکل سناٹا چھا گیا۔

اچھا، اگر تم اپنی من مانی کرنا چاہتی ہو تو اپنی من مانی کرو،'' ماں نے زور دے کر کہا۔

تمام وقت میسی کمرے کے ایک کونے میں، مبہم اور نظر انداز ہوا، بیٹھا رہا۔ اس موقعے پر وہ یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا:

''میری، بچی۔''

میری اٹھی اور، شاہانہ، کمرے سے چلی گئی۔ اس کا چھوٹا سا شوہر پیچھے ہو لیا۔ ڈیورینٹ، حیرانی کے ساتھ، اس نازک، چھوٹے سے آدمی کو جاتے دیکھتا رہا۔

پادری نے تقریباً خوش مزاجی سے پوچھا، ''اور شادی کے بعد تمھارا کہاں جانے کا خیال

ہے؟"

ڈیوربینٹ چونک گیا۔ "میں انگلینڈ چھوڑنے کی سوچ رہا تھا،" اس نے کہا۔

"کینیڈا؟ یا کہیں اور؟"

"میرا خیال ہے کینیڈا۔"

"ہاں، بہت عمدہ رہے گا۔" پھر ذرا دیر خاموشی چھائی رہی۔

"تو بطور داماد کے ہمارا تمھارا ملنا کم ہی ہوگا،" ماں نے کرخت آواز میں، لیکن تلطف کے ساتھ، کہا۔

"کم ہی ہوگا،" اس نے کہا۔

پھر اس نے اجازت چاہی۔ لوئیزا اس کے ساتھ پھاٹک تک گئی اور اس کے سامنے متفکر کھڑی ہوگئی۔

"تم ان کی پروا نہ کرنا، نہیں کرو گے نا؟" اس نے عاجزانہ کہا۔

"اگر انھیں میری پروا نہیں تو مجھے بھی ان کی پروا نہیں،" اس نے کہا۔ پھر اس نے جھک کر لوئیزا کو چوم لیا۔

"ہمیں جلدی سے شادی کر لینی چاہیے،" لوئیزا نے، آنسو بہاتے ہوئے، بڑبڑا کر کہا۔

"بہت بہتر،" وہ بولا، "میں کل بارفورڈ جاؤں گا۔"

❀❀

سٹی پریس میں دستیاب رسائل و جرائد

کتابی سلسلہ مکالمہ کراچی
مدیر: مبین مرزا
قیمت: 150 روپے

کتابی سلسلہ دنیازاد کراچی
مدیر: آصف فرخی
قیمت: 120 روپے

سہ ماہی آئندہ کراچی
مدیر: محمود واجد
قیمت: 80 روپے

جریدہ کراچی
مدیر: خالد جامعی / عمر حمید ہاشمی
قیمت: 300 روپے

بادبان کراچی
مدیر: ناصر بغدادی
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی ارتقا کراچی
ترتیب: راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی
قیمت: 100 روپے

سیپ کراچی
مدیر: نسیم درانی
قیمت: 75 روپے

سہ ماہی مزاح + کراچی
مدیر: انوار احمد علوی
قیمت: 51 روپے

سہ ماہی سورج لاہور
مدیر: تسلیم احمد تصور
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

ماہنامہ الحمرا لاہور
مدیر: شاہد علی خاں
قیمت: 40 روپے

سہ ماہی ادبیات اسلام آباد
سرپرست: افتخار عارف
قیمت: 50 روپے

سہ ماہی سمبل راولپنڈی
مدیر: محمد علی فرشی
قیمت: 150 روپے

سہ ماہی قرطاس گوجرانوالہ
مدیر: مکنون احمد جان
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی الزبیر بہاولپور
مدیر: شاہد حسن رضوی
قیمت: 200 روپے

سہ ماہی نقاط فیصل آباد
مدیر: قاسم یعقوب
قیمت: 200 روپے

شعر و حکمت حیدرآباد دکن
مدیر: شہریار، مغنی تبسم
قیمت: ضخامت کے اعتبار سے

سہ ماہی نیا ورق ممبئی
مدیر: ساجد رشید
قیمت: 80 قیمت

کتابی سلسلہ پہچان الہ آباد
مدیر: زیب النساء، نعیم اشفاق
قیمت: 100 روپے

سہ ماہی اردو ادب دہلی
مدیر: اسلم پرویز
قیمت: 50 روپے

سہ ماہی ادب ساز دہلی
مدیر: نصرت ظہیر
قیمت: 600 روپے

Scanned with CamScanner

"آج" اور "سٹی پریس" کی کتابیں یہاں دستیاب ہیں

فضلی سنز
ٹیمپل روڈ، اردو بازار
کراچی

سٹی بک پوائنٹ
نزد مقدس مسجد، اردو بازار
کراچی

سندھی لینگویج اتھارٹی
لطیف آباد
حیدرآباد

خالد بک ڈپو
درانی چوک
خانپور

ڈاکٹر ریاض مجید
D-288، پیپلز کالونی
فیصل آباد

نگارشات
24، مزنگ روڈ
لاہور

قلات پبلشرز
رستم جی لین، جناح روڈ
کوئٹہ

ویلکم بک پورٹ
اردو بازار
کراچی

دی سیکنڈ فلور
5/6-C، خیابانِ اتحاد
ڈیفنس فیز 7، کراچی

سندھی ادبی بورڈ بک اسٹال
تلک چاڑی
حیدرآباد

کتاب نگر
حسن آرکیڈ
ملتان کینٹ

کوپرا بک شاپ
70، شاہراہِ قائداعظم
لاہور

مسٹر بکس
10۔ڈی، سپر مارکیٹ
اسلام آباد

مکران بک ہاؤس
ایئرپورٹ روڈ، نزد واشی مارکیٹ
گوادر

تھامس اینڈ تھامس
نزد صدر جی پی او
کراچی

مکتبہ دانیال
عبداللہ ہارون روڈ، نزد جبیس ہوٹل
صدر، کراچی

کریمی بک کارپوریشن
نزد چاندنی شاپنگ مال
حیدرآباد کینٹ

شمع بک اسٹال
بیرون بھوانہ بازار
فیصل آباد

بک ہوم
بک اسٹریٹ، 46، مزنگ روڈ
لاہور

لندن بک کمپنی
کوہسار مارکیٹ،
F-6-3، اسلام آباد

Scanned with CamScanner

چونکہ ہمارے ملک میں سرکاری محکموں کی جواب دہی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اس لیے پاکستان پوسٹ کے اس اقدام کے اسباب جاننا بہت مشکل ہے۔ اس کا نتیجہ البتہ واضح ہے، اور وہ یہ کہ رسالے کی ترسیل کے لیے شہریوں کے ادا کردہ ٹیکسوں سے چلنے والے محکمۂ ڈاک پر بھروسا کرنا اب ممکن نہیں رہا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں اور رسالے کے خریداروں کو ترسیل کا خرچ کم رکھنے کے لیے نئی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔

آج کے سالانہ خریدار ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں۔ ان شہروں اور قصبوں تک رسالے کی ترسیل اور سالانہ خریداری کی تجدید کا خرچ کم رکھنے کے چند ممکن طریقے یہ ہیں:

(1) ایک مقام پر رہنے والے کئی خریدار اپنی خریداری کی تجدید کی رقم آپس میں جمع کر کے منی آرڈر کے ذریعے ایک ساتھ ارسال کر دیا کریں۔

(2) ایک شہر یا قصبے میں رہنے والے کئی خریدار کسی ایک پتے پر رسالہ منگوایا کریں۔

(3) کراچی میں مقیم جن خریداروں کے لیے ممکن ہو وہ اپنا رسالہ آج کے دفتر سے دستی حاصل کر لیں۔

(4) لاہور، اسلام آباد، ملتان، بہاولنگر، کوئٹہ، حیدرآباد وغیرہ میں رسالے کی کاپیوں کے پیکٹ ٹرک کے ذریعے کسی ایک پتے پر بھجوا دیے جائیں اور جن خریداروں کے لیے ممکن ہو وہ اس پتے سے اپنا رسالہ دستی حاصل کر لیں۔

اگر آپ کے ذہن میں ان کے علاوہ کوئی اور تجویز ہو تو ہمیں ضرور لکھیے تاکہ رسالے کی اشاعت بند کرنے کے فیصلے کو جہاں تک ممکن ہو، ملتوی رکھا جا سکے۔ امید ہے ہمیں آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔

—— اجمل کمال

Scanned with CamScanner

۵۹

آج کی کتابیں

۳۱۶ ـ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

قیمت: ۱۵۰ روپے